انوار علیگی کا نیا انوکھا قیامت خیز سلسلہ

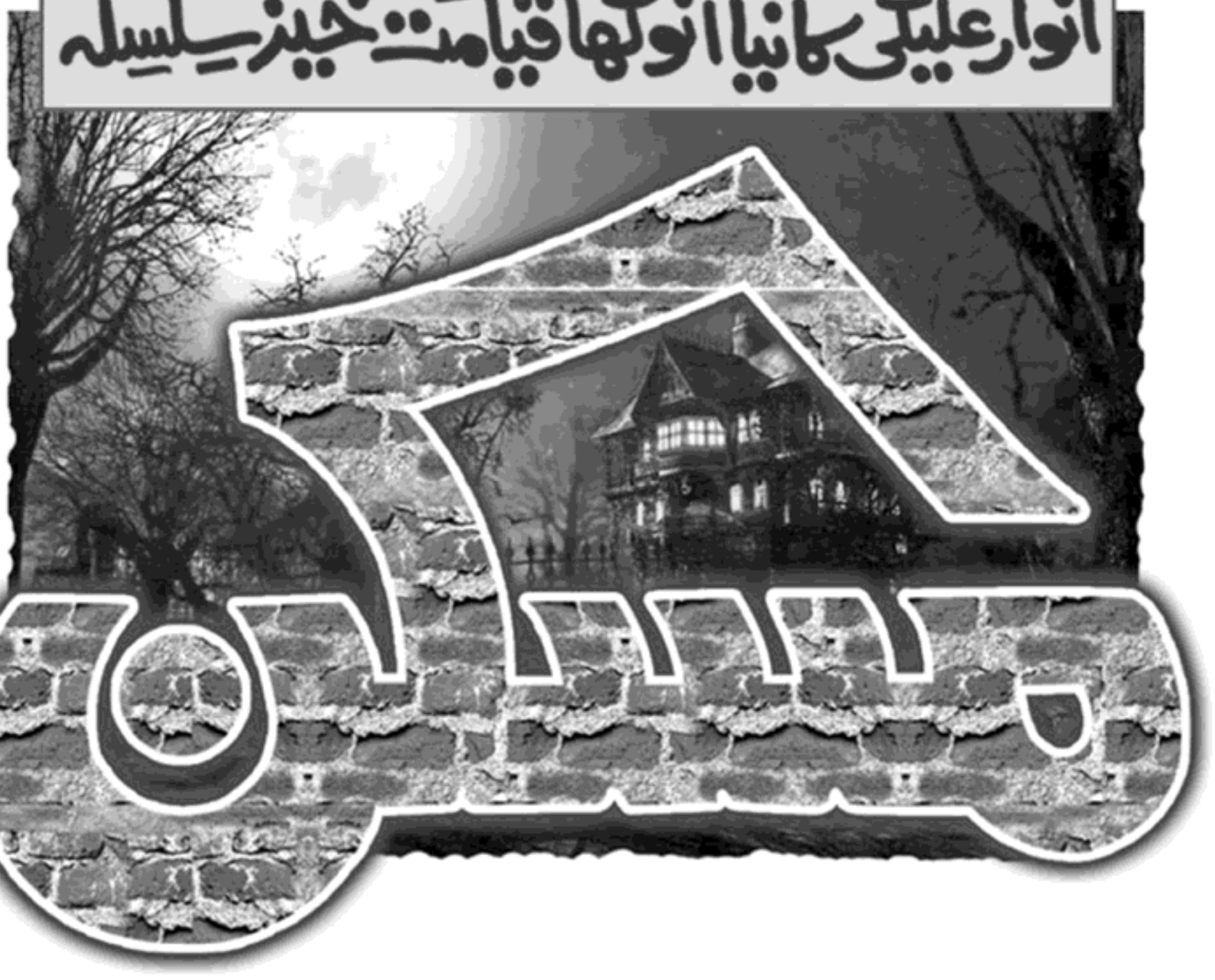

وہ اس گلی کا آخری مکان تھا۔ گلی بند تھی اور پیچھے قبرستان تھا۔ مکان سُرخ اینٹوں سے بنا تھا۔ دیواریں پلاستر سے محروم تھیں۔ جگہ جگہ سے ٹیپ اکھڑی ہوئی تھی۔ اینٹیں بھی ٹوٹ پھوٹ کا شکار تھیں۔ لکڑی کا دروازہ تھا۔ لکڑی بوسیدہ ہو چکی تھی۔ دوپٹ کے اس دروازے پر کبھی کوئی تالا نہیں لگتا تھا۔ تالا لگتا کیسے، کوئی کنڈی نہ تھی۔ دروازے کے آگے نہ پیچھے۔ ضرورت کے وقت کواڑوں کے پیچھے ایک بھاری پتھر رکھ دیا جاتا، ورنہ دروازہ کھلا رہتا۔ جو اس گھر میں رہائش پذیر تھا، اسے اس بات کی قطعاً پروا نہیں تھی کہ دروازہ کھلا ہے یا بند۔

اس پرانے مکان میں ایک اسّی سالہ بڑھیا رہتی تھی۔ جھریوں بھرا سانولا چہرہ، درمیانہ قد، دبلی پتلی، سیدھی کمر، سفید سیاہی مائل بال، منہ میں پورے دانت، کالی گہری آنکھیں، آنکھوں میں ایک خاص شیطانی چمک، چست اور مستعد۔ وہ کسی صورت اسّی کی نہ لگتی تھی۔

دو کمروں کے اس گھر میں وہ تنہا رہتی تھی۔ گھر میں داخل ہوتے ہی سیدھے ہاتھ کو باورچی خانہ تھا اور بائیں ہاتھ کو کمروں کا دروازہ تھا۔ بڑا صحن تھا اور صحن کے آخر میں غسل خانہ تھا اور اس کے ساتھ بیت الخلا۔ کمرے کے دروازے کے بائیں جانب نلکا لگا تھا۔ اس نلکے کے گرد چار فٹ کی چھ انچ اونچی منڈیر تھی۔ نل کے نیچے اسٹیل کی ٹوٹی پھوٹی اور آدھی بھری ہوئی بالٹی میں اسٹیل کا ڈونگا پڑا تھا۔

صحن میں ایک نیم کا درخت جھکا ہوا تھا۔ اس درخت کی جڑیں اگرچہ قبرستان کی طرف تھیں لیکن تنے کا اوپری حصہ دیوار میں چنا ہوا تھا۔ یہ ایک بڑا درخت تھا جو آدھا اس گھر کے صحن اور آدھا قبرستان کی طرف سایہ کئے ہوئے تھا۔ اینٹوں کی اونچی دیوار کے اس طرف سے چری قسم کے مردوں کے بولنے کی آوازیں آتی تھیں۔

اس اسّی سالہ بڑھیا کے بارے میں محلے میں عجیب و غریب کہانیاں گردش میں تھیں۔ خالہ صابرہ کا خیال تھا کہ مائی پنکھی، بنجارن ہے۔ یہ کسی شہری بابو کے عشق میں مبتلا ہو کر اپنا قبیلہ چھوڑ آئی، بعد میں وہ شہری بابو بھی اسے چھوڑ کر چلتا بنا۔ پٹواری شوکت، مائی پنکھی کا تعلق کولکتہ سے جوڑتا تھا۔ تھیٹر میں کام کرتی تھی۔ گردش زمانہ نے اُسے لاہور پہنچا دیا۔ تائی مشتاق کا خیال تھا کہ یہ بنگالن ضرور ہے لیکن اس کا تعلق شاہی محلے سے تھا۔ اپنے وقت کی بہترین رقاصہ تھی۔ پھر وقت نے اسے کنارے لگا دیا۔ کسی کا خیال تھا کہ یہ جادوگرنی ہے۔

مائی پنکھی کے گھر کے سامنے ایک جھونپڑی پڑی تھی۔ اس جھونپڑی کے باہر کھرّی چارپائی پر ایک سیاہ فام بڈھا، حقے کی نے منہ میں دبائے ہر وقت "کھوں کھوں" کرتا رہتا تھا۔ اس بڈھے کی ایک جوان بیٹی اس کے ساتھ رہتی تھی جو گھروں میں کام کرتی تھی۔ کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ یہ بڈھا دراصل مائی پنکھی کا شوہر ہے لیکن اب دونوں اس طرح الگ ہوئے ہیں جیسے ایک دوسرے کو جانتے ہی نہیں۔

اصل میں مائی پنکھی کے بارے میں کسی کو کچھ معلوم نہ تھا۔ محض قصے کہانیاں تھیں، قیاس آرائیاں تھیں۔ یہ قصے اس لئے پھیلے تھے کہ مائی پنکھی کا محلے میں آنا جانا تو دور، گلی کے لوگوں سے بھی کوئی واسطہ نہ تھا۔ وہ کسی سے تعلق نہ رکھتی تھی۔ شروع میں گلی کے کچھ لوگوں نے یہ سوچ کر کہ مائی پنکھی گھر میں تنہا رہتی ہے، بڑھیا ہے۔ اسے کھانا دینے کی کوشش کی تو اس نے یہ کہہ کر کھانا لوٹا دیا کہ وہ مرچیں نہیں کھاتی۔ کسی نے شیرینی دینے کی کوشش کی تو پھر یہی جواب ملا کہ وہ میٹھا نہیں کھاتی۔ جب صابرہ خالہ نے سنا تو غصے میں کہا۔ "اس منحوس کو تو زہر دو، وہ خوشی سے کھالے گی۔"

یہ بات، اگرچہ طنزاً کہی گئی تھی لیکن حقیقت یہی تھی کہ مائی پنکھی کو زہر دیا جاتا تو اس کی صحت پر کوئی اثر نہ پڑتا۔ سنکھیا تو وہ روز کھاتی تھی۔

مائی پنکھی ہمیشہ سیاہ لباس میں رہتی تھی۔ وہ لہنگا اور کرتی پہنتی تھی۔ آنکھیں ہر وقت کاجل سے بھری ہوتیں، گلے میں سیاہ ڈوری میں بندھا چاندی کا ایک تعویذ لٹکا رہتا۔ اس تعویذ کو وہ کبھی گلے سے

PDF BY Manzoor

نہیں اتارتی تھی۔ پتا نہیں پنکھی کس نے اس کا نام رکھا تھا۔ وہ تیز ضرور چلتی تھی لیکن اس کے پنکھ نہیں لگے ہوئے تھے کہ وہ اُڑتی ہوئی محسوس ہوتی۔ پھر جوانی میں تو ویسے ہی پنکھ کی ضرورت نہیں ہوتی۔ جوانی بذات خود "پنکھ" ہوتی ہے۔ بندہ ہر وقت اڑان بھرتا رہتا ہے۔ مائی پنکھی کی جوانی یقیناً قیامت خیز رہی ہوگی۔ کسی کو اس کا نام پنکھی رکھنے کی بھلا کیا ضرورت تھی۔

ابھی صبح ہوئی تھی۔ نیم کی خزاں رسیدہ پتیاں، صحن کے اینٹوں کے فرش پر پھیلی ہوئی تھیں۔ نیم کے درخت پر کوؤں اور چڑیوں کی کائیں کائیں اور چہچہانے کی مشترکہ آواز آ رہی تھی۔ کچھ کوّے دیوار کی منڈیر پر ادھر سے اُدھر پھدکتے پھر رہے تھے۔

ایک سفید بلّی اچانک دیوار پر نمودار ہوئی۔ بلی کو دیکھتے ہی کوؤں نے اُڑنے کی کوشش کی لیکن جان بچا کر اڑتے ہوئے ایک کوے کو سفید بلی نے اپنے منہ میں دبوچ لیا اور وہاں سے باورچی خانے کی چھت پر زقند لگائی اور پھر صحن میں کود گئی۔

مائی پنکھی چولہے کے سامنے پیڑھی پر بیٹھی تھی۔ چولہے میں لکڑیاں جل رہی تھیں اور ایک مٹی کی بڑی ہنڈیا شعلوں پر رکھی تھی۔ ہنڈیا میں سیاہ محلول اُبل رہا تھا۔ مائی پنکھی نے بلی کو دیکھا جو باورچی خانے میں داخل ہو رہی تھی۔

"انجو تو آ گئی۔" مائی پنکھی نے اس کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔

بلی کیا جواب دیتی؟ اس کے منہ میں پھڑ پھڑاتا کوا تھا۔ مائی پنکھی نے اس کوے کو بلی کے منہ سے جھپٹ لیا اور "کائیں کائیں" کرتے زندہ کوے کو ابلتے سیاہ محلول میں جھونک کر مٹی کا ڈھکن ڈھک دیا اور اس ڈھکن پر وزنی اینٹ رکھ دی۔

چند لمحے تو کوے کی آواز اور پھڑ پھڑاہٹ سنائی دی۔ اس کے بعد گہری خاموشی چھا گئی۔ سفید بلی باورچی خانے کی دہلیز پر لیٹ گئی تھی۔ یوں تو اس بلی کا جسم سفید تھا لیکن منہ کالا تھا۔ دونوں کان سیاہ تھے۔ پونچھ اور پنجے کالے تھے۔ آنکھیں گہری سرخ تھیں، وہ عجیب بلی تھی۔ اسے دیکھ کر خوف اور پیار بیک وقت آتا تھا۔

دس منٹ تک ہنڈیا چولہے پر چڑھی رہی۔ مائی پنکھی لکڑیاں اوپر نیچے کر کے چولہے کی آنچ تیز کرتی رہی۔ اس کے بعد اس نے ڈھکن کے اوپر سے اینٹ اٹھا کر ہنڈیا کے پیچھے کھڑی کی اور جلتی ہنڈیا بغیر کسی کپڑے کے اپنے ہاتھوں سے نیچے اتاری۔ ہنڈیا سامنے رکھ کر ڈھکن اٹھایا۔ یکدم بھاپ اور شدید بدبو کا بھبکا نکلا۔ مائی پنکھی کے چہرے پر اطمینان پھیل گیا۔ اس نے مسکرا کر گہری نظروں سے کالے منہ کی سفید بلی کو دیکھا۔

بلی اس کا اشارہ سمجھتے ہوئے دروازے سے اٹھی۔ اس نے اپنے اگلے پاؤں پھیلا کر انگڑائی سی لی اور باورچی خانے سے نکل گئی۔

مائی پنکھی نے کھولتے سیاہ محلول میں ہاتھ ڈال کر کوے کو پکڑ کر نکالا۔ چند لمحے اس نے اسے ہنڈیا کے اوپر پکڑ کر رکھا۔ جب محلول ٹپکنا بند ہو گیا تو وہ کوے کو ہاتھ میں پکڑے اٹھی اور باورچی خانے سے باہر آ گئی۔

صحن میں کھڑے ہو کر اس نے آسمان کی طرف دیکھا اور زور سے بولی۔ "لے بھگا؟"

یہ کہہ کر اس نے کوے کو اوپر اچھال دیا...... کوا اوپر جاتے ہی گم ہو گیا۔ یوں محسوس ہوا جیسے کسی نادیدہ چیز نے اسے لپک لیا ہو۔ پھر وہ واپس باورچی خانے میں آ گئی۔ پورے اطمینان سے پیڑھی پر بیٹھی اور مٹی کی ہنڈیا کو کنارے سے پکڑ کر گھمایا۔ جب اس کے اندازے کے مطابق نیچے بیٹھی ہوئی چیزیں محلول میں مل گئیں تو اس نے ہنڈیا منہ سے لگا لی۔ یہ ٹھیک ہے۔ محلول ابل نہیں رہا تھا لیکن اتنا گرم ضرور تھا کہ کوئی انسان اسے ٹھنڈے پانی کی طرح نہیں پی سکتا تھا۔ لیکن مائی پنکھی بلا تکلف ایک ہی سانس میں سارا غٹاغٹ پی گئی۔

"کوے کی یخنی" پیتے ہی مائی پنکھی کی کیفیت بدلنے لگی۔ اس نے پیڑھی کھسکا کر دیوار سے ٹیک لگائی اور آنکھیں موند لیں۔ اس پر نشے کی سی کیفیت طاری ہونے لگی تھی اور سانولے چہرے پر سرخی چھانے لگی تھی۔

"میاؤں۔" یکدم آواز سنائی دی تو مائی پنکھی نے اپنی آنکھیں کھولیں۔ اس کی آنکھیں انتہائی سرخ ہو چکی تھیں، جیسے آنکھوں کی رگیں پھٹ گئی ہوں۔ بلی باورچی خانے کے دروازے پر کھڑی تھی۔ دونوں نے ایک دوسرے کو اپنی سرخ آنکھوں سے دیکھا۔

"انجو...... تو کمرے میں جا...... مجھے پریشان مت کر...... میں سوؤں گی۔" مائی پنکھی نے پیڑھی سے اٹھتے ہوئے کہا اور یہ انتظار کئے بغیر کہ سفید بلی کمرے میں جاتی ہے کہ نہیں۔ وہ باورچی خانے سے نکل آئی اور صحن میں پڑی چارپائی پر لیٹ گئی۔ اپنی آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیا اور چند لمحوں میں ہی خراٹے لینے لگی۔

وہ دوپہر تک اسی طرح بے سدھ پڑی رہی۔ صحن میں دھوپ بھر چکی تھی۔ مائی پنکھی کی چارپائی سائے میں تھی۔ نیم کی زرد پتیاں اس کے اوپر پڑی ہوئی تھیں۔ سفید بلی کئی بار کمرے سے نکل کر آئی تھی اور اسے سوتا پا کر واپس چلی گئی تھی۔

چند لمحوں قبل وہ پھر آئی۔ اسے بدستور سوتا پا کر اس کا جی چاہا کہ وہ چھلانگ لگا کر چارپائی پر چڑھ جائے لیکن ہمت نہ کر پائی۔ وہ کمرے کے دروازے پر پاؤں پھیلا کر بیٹھ گئی اور اپنی سرخ آنکھوں سے مائی پنکھی کو دیکھنے لگی۔ تب اچانک بڑھیا کے "تن مردہ" میں حرکت ہوئی اور وہ اس طرح اٹھ کر بیٹھ گئی جیسے وہ سوئی ہی نہیں تھی۔ اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ جھریاں نہ ہونے کے برابر تھیں۔ مائی پنکھی اس وقت اپنے چہرے مہرے سے پچاس سال سے زیادہ کی نہ لگ رہی تھی۔

سفید بلی نے اسے اٹھتے دیکھ کر چھلانگ لگائی اور اس کے پیروں سے لپٹنے لگی۔ کچھ دیر اپنا جسم رگڑنے کے بعد منہ اٹھا کر مائی پنکھی کی جانب دیکھا اور التجا بھری آواز نکالی...... "میاؤں۔"

"اچھا جا...... اندر جا۔" مائی پنکھی نے اس کی التجا کو سمجھتے ہوئے کہا۔

سفید بلی تیزی سے دوڑتی ہوئی اندر کمرے میں چلی گئی۔ اس کے اندر جانے کے بعد مائی پنکھی نلکے کے نزدیک آئی۔ بالٹی میں پڑے ڈونگے میں پانی بھر کر اپنے منہ پر چھپاکے مارے اور چہرے سے پانی صاف کرتی ہوئی کمرے کے دروازے میں داخل ہو گئی۔

پانچ منٹ کے بعد جب وہ کمرے سے نکلی تو اس کے چہرے کی سرخی غائب ہو چکی تھی۔ جھریاں نمودار ہو گئی تھیں اور چال میں وہ تمکنت نہ رہی تھی جو کمرے میں جانے سے قبل تھی۔ وہ کسی ایسے مرحلے سے گزری تھی جس نے اس کے چہرے کی سرخی چھین لی تھی۔ مائی پنکھی صحن میں پڑی کھرّی چارپائی پر پاؤں لٹکا کر بیٹھ گئی اور کمرے کے دروازے کی طرف دیکھنے لگی۔

کچھ وقت گزرا کہ سفید ساڑھی اور کالے بلاؤز میں ملبوس سانولی سلونی انتہائی پرکشش لڑکی کمرے سے برآمد ہوئی۔ اس کے گھنے، لمبے، سیدھے اور کھلے بال سینے پر پڑے تھے۔ چہرے پر ایک حزن کی کیفیت تھی اور کالی حسین آنکھیں کسی گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ وہ سیدھی مائی پنکھی کی جانب آئی اور اس کے قدموں میں بیٹھ گئی۔

مائی پنکھی نے اس کے اس طرح اینٹوں کے فرش پر، قدموں میں بیٹھنے کا کوئی نوٹس نہ لیا، کوئی ردعمل ظاہر نہ کیا۔ وہ جس طرح بیٹھی تھی، آرام سے بیٹھی رہی۔ اس لڑکی نے مائی پنکھی کی دبلی پتلی ٹانگ اپنی طرف کھینچی اور سر جھکا کر دونوں ہاتھوں سے دبانے لگی۔

ٹانگ دباتے دباتے اس نے اچانک اپنا سر اٹھایا، مائی پنکھی کی آنکھوں میں دیکھا اور دھیرے سے بولی۔ "اماں! میں کون ہوں؟"

"تجھے تیرا نام بتاؤں یا اوقات؟" مائی پنکھی نے نرم لہجے میں کہا۔

"اماں...... نام تو مجھے معلوم ہے۔ میرا نام انارہ ہے تو مجھے انجو کہتی ہے۔ آج مجھے میری اوقات بتا دے؟" انارہ نے اس کے گھٹنے پر پیشانی لگاتے ہوئے پوچھا۔ اس انداز میں ایک خاص تڑپ تھی۔

"تو جنم جلی ہے!" مائی پنکھی نے غیر جذباتی لہجے میں کہا۔

"جنم جلی!" انارہ کی آنکھوں میں بے شمار سوالات تھے۔

"ہاں، ابھاگن ہے یوں سمجھ لے۔" مائی پنکھی نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

"مجھے کس نے ابھاگن بنایا ہے؟" انارہ پوچھے بنا نہ رہ سکی۔

"تیرے بھاگیہ نے۔ میں نے تو تجھے ان حالوں نہیں پہنچایا۔" مائی پنکھی نے اپنا دامن بچایا۔

"میں تیری قید میں ہوں۔ اماں، تو یہ بات اچھی طرح جانتی ہے۔" انارہ نے مائی پنکھی کا دامن اُلجھایا۔

"تو میری قید میں نہیں، اپنے کرموں کی قید میں ہے۔" مائی پنکھی نے پھر اپنی جان چھڑائی۔

"چل آج پھر میرے کرم ہی بتا دے۔ مجھے اپنے بارے میں کچھ تو معلوم ہو۔" انارہ نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

"اری...... میں تیرے بارے میں کچھ نہیں جانتی۔ میرے متھے نہ لگ۔" مائی پنکھی کے لہجے میں اچانک تلخی در آئی۔

"اماں، میں جانتی ہوں کہ تو میرے بارے میں بہت کچھ جانتی ہے۔ اماں، میری پیاری اماں۔ مجھ پر میری زندگی کے راز کھول دے۔" انارہ نے اس کے دونوں پاؤں پکڑ لئے۔

"انجو۔ مجھے تنگ نہ کر۔" مائی پنکھی نے قدرے بے زاری سے کہا۔

"اماں۔ میں تجھے تنگ نہیں کر رہی۔ تیری ٹانگ دبا رہی ہوں۔" انارہ نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"انجو...... انتظار کر۔" مائی پنکھی نے اسے ٹالنا چاہا۔

"کس کا انتظار کروں اور کب تک کروں؟" انارہ ٹلنے کے لئے تیار نہ تھی۔

"وہ آئے گا، ضرور آئے گا۔" مائی پنکھی نے آسرا دیا۔

"وہ آ کر کیا کرے گا؟" انارہ نے پوچھا۔

"وہ آ کر تیرے بھاگ جگائے گا۔" مائی پنکھی نے راز کھولا۔

"میرے بھاگ جگائے گا...... مجھ ابھاگن کے۔" انارہ نے بے یقینی سے کہا۔

"ہاں انجو...... ایسا ہوگا اور ضرور ہوگا۔" مائی پنکھی یقین سے بولی۔

"آخر کب ایسا ہوگا؟" انارہ پریشان تھی۔

"جب میں نہ رہوں گی۔" مائی پنکھی نے اس کے سر پر اپنا سوکھا ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

انارہ کو یوں لگا جیسے کوئی وزنی چیز اس کے سر پر رکھ دی گئی ہو۔ اس نے گھبرا کر اپنا سر نیچے کیا اور بولی۔ "اماں، میرے سر سے اپنا ہاتھ ہٹا۔"

"اری...... تجھ سے میرا ہاتھ برداشت نہیں ہوتا تو زندگی کا بوجھ کیسے اٹھائے گی؟" مائی پنکھی نے اپنا ہاتھ اٹھاتے ہوئے کہا۔

"اماں...... تو اتنی سوکھی سڑی سی ہے، پھر تیرا ہاتھ اتنا وزنی کیوں ہے۔ ہاتھ ہے کہ وزنی پتھر۔" انارہ نے مائی پنکھی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

مائی پنکھی نے اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ بس بے تاثر انداز میں اسے دیکھتی رہی۔

"اماں...... آخر تو چیز کیا ہے؟" انارہ نے اسے چھیڑا۔

"کبھی تو اپنے بارے میں پوچھتی ہے کہ تو کون ہے اور کبھی میرے بارے میں پوچھتی ہے کہ میں کون ہوں۔ آخر تو اتنا بولتی کیوں ہے؟" مائی پنکھی نے اسے گھور کر دیکھا۔

"اب بولوں بھی نا۔" انارہ تنگ کر بولی۔ "تھوڑا سا وقت ملتا ہے بولنے کا۔ ورنہ تو تیری ہی سنتی رہتی ہوں۔"

"اچھا...... اب تُو اندر جا...... مجھے دھڑکا لگا رہتا ہے۔ کسی نے تجھے دیکھ لیا تو فساد پھیل جائے گا۔" مائی پنکھی سنجیدگی سے بولی۔

"ٹھیک ہے اماں...... میں جاتی ہوں۔" وہ اٹھتے ہوئے بولی۔

مائی پنکھی اسے جاتے ہوئے دیکھتی رہی اور سوچتی رہی۔ قیامت خیز حسن، جانے کس پر قیامت ڈھائے گا۔

علی نثار نے گھر سے جاتے ہوئے جو بات کہی تھی، اس نے نازنین کو فکرمند کر دیا تھا۔ وہ عابر پر ناراض تو ہوتے رہتے تھے لیکن انہوں نے گھر چھوڑنے کی بات کبھی نہیں کی تھی۔ وہ صبر و تحمل کے آدمی تھے۔ وہ عابر سے براہ راست کم بات کرتے تھے، جو کہنا سننا ہوتا اپنی بیوی نازنین سے کہہ دیا کرتے تھے یا کبھی ان کی بڑی بیٹی صائمہ میکے آ جاتی اور اس کے سامنے عابر کا ذکر آ جاتا تو وہ اسے عابر کو سمجھانے کی تلقین کر دیتے۔

ان کی دو ہی اولاد تھیں۔ صائمہ اور عابر...... صائمہ شادی شدہ تھی۔ دو بچوں کی ماں تھی اور اپنے گھر میں خوش تھی۔ عابر، صائمہ سے دو سال چھوٹا تھا۔ وہ ایک ست الوجود لڑکا تھا۔ بی کام تھا لیکن یہ بی کام اس نے رو رو کر پانچ سال میں کیا تھا۔ اس کے دو ہی شوق تھے، کھانا اور سونا۔ کھانے پر آتا تو کھاتا چلا جاتا۔ حتیٰ کہ نازنین کو ٹوکنا پڑتا۔

"بس کر بیٹا۔ تم چار روٹی کھا چکے ہو، یہ پانچویں چل رہی ہے۔"

"امی...... کھانے دیں نا۔ آپ ٹوکتی بہت ہیں۔" وہ دھیرے سے احتجاج کرتا۔

علی نثار اگر ساتھ کھانا کھا رہے ہوتے تو اپنی بیوی کی طرف ترچھی نظروں سے دیکھتے اور دھیرے سے تنبیہ کرتے۔ "کھانے دو نازنین، کیوں ٹوکتی ہو۔"

"بہت زیادہ کھانا اچھا نہیں ہوتا۔ آپ کو معلوم نہیں، ابھی اس نے ایک پلیٹ چاول بھی کھانے ہیں۔" نازنین بیٹے کی پول کھولتیں تو وہ چپ ہو جاتے۔

کھانے سے فارغ ہو کر وہ اپنے کمرے کا رخ کرتا اور کمپیوٹر کے سامنے بیٹھ جاتا۔ پھر موبائل کان سے لگا ہوتا۔ میسج چل رہے ہوتے۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ وہ کمپیوٹر پر کیا دیکھتا ہے اور موبائل پر کس سے بات کرتا ہے۔ کس قسم کے پیغامات آتے جاتے ہیں۔ اس شغل میں دو تین بج جاتے۔ تب وہ تھک کر بیڈ پر اوندھا لیٹتا اور سو جاتا۔

دوپہر کو دو تین بجے تک اٹھتا۔ نازنین اسے اٹھا اٹھا کر تھک جاتیں۔ وہ ٹس سے مس نہ ہوتا۔ نازنین گھر کے کام نمٹاتی رہتیں۔ باہر سے سودا بھی لے آتیں۔ دو ڈھائی بجے کے قریب ماسی آ جاتی۔ اب نازنین کا پارہ ہائی ہو جاتا۔

"عابر تُو اٹھتا ہے یا فون کروں تیرے باپ کو۔" نازنین غصے سے چیختیں۔ "جس دن انہیں پتا لگ گیا کہ تو دوپہر تک پڑا سوتا رہتا ہے، اس دن تیری شامت آ جائے گی۔"

"امی...... کیا ہے...... سونے بھی نہیں دیتیں۔" وہ سر جھٹک کر اٹھتا اور واش روم میں گھس جاتا۔ واش روم سے اسے عشق تھا۔ وہاں سے آدھ گھنٹے سے پہلے نہ نکلتا۔ ماسی واش روم دھونے کے انتظار میں کھڑی ہوتی اور اندر سے پانی گرنے کی آواز آ رہی ہوتی۔ نازنین دروازہ پیٹ پیٹ کر اسے باہر نکالتیں۔

ابھی ناشتا چل رہا ہوتا کہ موبائل پر پیغام موصول ہوتا۔ "میں باہر کھڑا ہوں، جلدی آ۔"

یہ پیغام ملتے ہی عابر کے جسم میں کرنٹ سا دوڑ جاتا۔ ناشتے میں تیزی آ جاتی۔

"کیا ہوا تمہیں...... ناشتا تو آرام سے کرو۔"

"امی...... آرام سے ہی کر رہا ہوں اور کیسے کروں؟" عابر کہتا۔

"یہ بتاؤ...... کیا میسج آیا ہے؟" نازنین اسے گھور کر دیکھتیں۔

PDF BY Manzoor

''اوئے.....آج کے عہد کی امیاں ہوتی ہیں بڑی تیز۔'' وہ مسکرا کر نازنین کو دیکھتا۔ جلدی جلدی چائے کے گھونٹ بھرتا اور یہ جا وہ جا۔

علی نثار کا خیال تھا کہ نازنین کے لاڈ پیار نے عابر کو پٹڑی سے اتارا ہے لیکن ایسا نہ تھا۔ یہ ٹھیک ہے کہ اکلوتا بیٹا ہونے کی وجہ سے نازنین اسے کچھ رعایتی نمبر دے دیا کرتی تھیں، ساتھ ہی فکر مند بھی رہتی تھیں۔ وہ چھبیس سال کا ہو گیا تھا لیکن اسے اپنے مستقبل کی قطعاً فکر نہ تھی۔ کیا کرنا ہے، کیسے کرنا ہے۔ وہ اس موضوع پر بات ہی نہ کرتا تھا۔

''عابر.....تم کچھ کرتے کیوں نہیں؟'' نازنین اکثر اسے گھیر کر بیٹھ جاتیں۔

''امی۔ بی کام کر تو لیا اور کیا کروں۔''

''نوکری کرو.....تاکہ تمہاری شادی ہو۔'' نازنین سمجھاتیں۔ ''تم جیسے نکھٹو کو تو کوئی اپنی بیٹی دینے سے رہا۔'' نازنین اسے لائن پر لانے کی کوشش کرتیں۔

''امی.....مجھے نہیں کرنی شادی وادی۔'' وہ دوٹوک جواب دیتا۔

''تو پھر کیا اسی طرح ساری زندگی ڈنڈے بجاتا رہے گا۔''

''امی.....نوکری ملے تو کروں؟''

''تمہیں سونے اور دوستوں سے فرصت ملے تو نوکری ڈھونڈو۔ دیکھو بیٹا، کچھ اپنے باپ کا خیال کرو۔ آخر وہ کب تک نوکری کریں گے۔ وہ تمہاری وجہ سے سخت پریشان رہتے ہیں۔''

نازنین ایک طرف عابر کو ڈانٹ ڈپٹ کرتیں تو دوسری طرف علی نثار کو بھی چابی لگاتیں۔ ''کبھی عابر سے بھی پوچھ لیا کریں کہ وہ کیا کر رہا ہے۔ میں اس کی طرف سے سخت پریشان رہتی ہوں۔ اس لڑکے کو اپنی کوئی فکر ہی نہیں۔ وہ آپ کا بیٹا تو لگتا ہی نہیں۔''

''بتاؤ۔ میں کیا کروں؟'' علی نثار پوچھتے۔

''اسے پاس بٹھا کر پوچھیں۔ آخر وہ چاہتا کیا ہے؟''

علی نثار اپنے بیٹے عابر سے بہت کم بات کرتے تھے۔ دونوں کے درمیان تکلف کی دیوار حائل تھی۔ جب نازنین ڈانٹ ڈپٹ پر اصرار کرتیں اور صائمہ بھی ان کی ہاں میں ہاں ملانے لگتی تو وہ عابر کو لے کر بیٹھ جاتے۔ اسے دنیا کی اونچ نیچ سمجھاتے۔ زندگی گزارنے کے طریقے بتاتے تو عابر جواب میں ''جی ابو، جی ابو'' کئے جاتا۔ جیسے صبح اٹھتے ہی پہلا کام یہ کرے گا کہ نوکری ڈھونڈنے نکل جائے گا۔ کبھی ایسا بھی ہوتا کہ وہ باپ کی نصیحت سن کر صبح صبح گھر سے نکل جاتا۔ سب سمجھتے، لو جی آج عابر صاحب نوکری ڈھونڈ کر ہی واپس آئیں گے۔ جب وہ گھر واپس آتے تو پتا چلتا وہ صبح صبح دوستوں کے ساتھ پکنک پر نکلے تھے۔

ایک دن صائمہ کے ہاتھ عابر کا موبائل لگ گیا۔ اس نے سارے میسج پڑھ لئے۔ ان پیغامات میں ایک پیغام ایسا تھا کہ وہ اسے پڑھ کر پریشان ہو گئی۔

چھٹی کا دن تھا۔ علی نثار گھر پر موجود تھے۔ عابر کہیں باہر نکلا ہوا تھا۔ وہ گھر سے عجلت میں نکلا تھا، شاید اس وجہ سے اپنا موبائل گھر پر بھول گیا تھا۔ صائمہ نے ایسے ہی موبائل میں موجود پیغامات پڑھنے شروع کر دیئے تھے۔

ہر طرح کے پیغامات تھے۔ ان میں چند فحش بھی تھے۔ ان میں ایک میسج اتنا تکلیف دہ تھا کہ وہ سُن ہو کر رہ گئی۔ وہ میسج فحش نہ تھا۔ فحش ہوتا تو شاید وہ اس قدر پریشان نہ ہوتی۔

صائمہ نے پہلے سوچا کہ نازنین کو دکھائے لیکن نازنین کو دکھانے کا کوئی فائدہ نظر نہ آیا۔ وہ اس سلسلے میں کوئی خاص قدم اٹھانے کی پوزیشن میں نہ تھیں۔ یہ بھی ممکن تھا کہ وہ اس پیغام کو غیر اہم جان کر نظر انداز کر جاتیں۔ بہتر یہی تھا کہ علی نثار سے بات کی جاتی۔

صائمہ نے عابر کا موبائل باپ کے ہاتھ میں دینے کے بجائے وہ میسج اپنے موبائل پر منتقل کیا اور باپ کے پاس پہنچ گئی۔

''ابو.....مجھے آپ سے کچھ بات کرنا تھی۔'' صائمہ، علی نثار کے بیڈ پر آہستگی سے بیٹھتے ہوئے بولی۔

علی نثار اخبار پڑھ رہے تھے۔ انہوں نے اخبار ایک طرف رکھا اور سنبھل کر بیٹھتے ہوئے بولے۔ ''کوئی خاص بات؟''

''جی ابو.....میں آپ کو ایک میسج پڑھوانا چاہتی ہوں۔ یہ میں نے اپنے موبائل پر عابر کے موبائل سے منتقل کیا ہے۔'' صائمہ نے تمہید باندھی۔

''عابر کا موبائل.....تمہارے ہاتھ کیسے لگ گیا۔'' علی نثار نے پوچھا۔

''ابو.....اتفاق سے وہ اپنا موبائل گھر بھول گیا ہے۔'' صائمہ نے بتایا۔

''اچھا لاؤ.....دکھاؤ کیا میسج ہے۔'' علی نثار نے ہاتھ بڑھایا۔

''جی ابو۔'' صائمہ نے اپنا موبائل علی نثار کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''یہ دیکھئے۔''

علی نثار نے صائمہ کے ہاتھ سے موبائل لے کر چشمہ لگایا اور پیغام پڑھنے لگے۔

''اوہ۔'' بے اختیار ان کے منہ سے نکلا۔

اس میسج کو پڑھ کر وہ سناٹے میں آ گئے تھے۔ یہ کسی لڑکی کی طرف سے تھا اور یہ کوئی عشق نامہ نہ تھا۔ لکھا تھا:

''تم نے مجھے عاجز کر دیا ہے۔ میرے ہاتھ میں اس وقت قرآن شریف ہے۔ میں دل کی گہرائیوں سے تمہیں بددعا دیتی ہوں کہ تم مر جاؤ۔''

علی نثار نے اس میسج کو دو بار پڑھا۔ باوجود کوشش کے جب وہ اس میسج کی نوعیت کو نہ سمجھ پائے تو صائمہ سے گویا ہوئے۔ ''بیٹا۔ یہ کیا ہے؟''

''ابو.....ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عابر اس لڑکی کو کال کر کے پریشان کر رہا ہے۔ یہ کوئی شریف لڑکی معلوم ہوتی ہے۔ اتنی تنگ آ گئی کہ بددعا دینے پر مجبور ہو گئی۔'' صائمہ نے وضاحت کرنے کی کوشش کی۔

''یہ عابر کس راہ پر چل نکلا ہے۔'' علی نثار انتہائی فکر مند ہو کر بولے۔

''ابو.....یہ آج کل بہت کامن ہے۔ لڑکے ایک دوسرے کو لڑکیوں کے نمبر میسج کر دیتے ہیں، پھر لڑکے ان لڑکیوں کو فون کر کے تنگ کرتے ہیں۔ یہ کام لڑکے ہی نہیں لڑکیاں بھی کر رہی ہیں۔ رانگ

کال کر کے لڑکوں کو چھیڑتی ہیں۔ یہ کوئی شریف لڑکی معلوم ہوتی ہے۔ اسے عابر نے فون کر کے اس قدر تنگ کیا ہے کہ وہ قرآن شریف ہاتھ میں لے کر بددعا دے بیٹھی۔'' صائمہ کے لہجے میں دکھ تھا۔

''بیٹا۔ تم اسے سمجھاؤ۔ میں تو اس بددعا کو پڑھ کر ہل گیا ہوں۔'' علی نثار سخت پریشان تھے۔

''ابو..... آپ پریشان نہ ہوں۔ میں اس سے بات کرتی ہوں۔''

''کہیں وہ غصے میں نہ آجائے۔ تم سے الجھ بیٹھے کہ میرا موبائل کیوں چیک کیا۔'' علی نثار بولے۔ ''اس لڑکی سے ہمیں معافی مانگنا ہوگی۔ لاؤ، مجھے دو اس کا فون نمبر۔ میں بات کرتا ہوں۔ اس لڑکے نے ہمیں کہیں کا نہ رکھا۔''

''ابو..... نمبر میں آپ کو لکھ کر دے دیتی ہوں لیکن میرا خیال ہے کہ ابھی آپ فون نہ کریں۔ میں عابر سے کہتی ہوں کہ وہ آئندہ اس لڑکی کو نہ ستائے اور اپنے غلط رویے کی معافی مانگے۔'' صائمہ نے تجویز دی۔

''ایسا ہو جائے تو بہت اچھا ہو۔'' علی نثار نے اپنی بیٹی کو سراہا۔

رات کو جب عابر گھر آیا تو سیدھا اپنے کمرے میں گیا۔ اس نے کمپیوٹر کے برابر متلاشی نظروں سے موبائل کو دیکھا۔ وہاں موبائل نہ پا کر اس کا چہرہ متغیر ہو گیا۔ وہ تیزی سے پلٹا۔ اس نے نازنین سے موبائل کے بارے میں پوچھنے کے لیے ابھی ''امی'' ہی کہا تھا کہ اس کی نظر دروازے پر کھڑی صائمہ پر پڑی۔

وہ صائمہ کو غیر متوقع طور پر اپنے کمرے کے دروازے پر دیکھ کر ٹھٹک گیا۔

صائمہ کمرے کا دروازہ بند کر کے اس کی طرف بڑھی اور بولی۔ ''موبائل ڈھونڈ رہے ہو؟ یہ ہے تمہارا موبائل۔ شاید بھول گئے تھے۔''

''ہاں..... آپی۔ جلدی میں اسے لے جانا بھول گیا تھا لیکن یہ تمہارے ہاتھ میں کیوں ہے؟'' عابر نے صائمہ کو مشکوک نگاہوں سے دیکھا۔

''کیا مجھے تمہیں بتانا پڑے گا کہ میں نے تمہارے موبائل کو اچھی طرح چیک کر لیا ہے۔ مجھے ایسا نہیں کرنا چاہئے تھا لیکن شکر کرو کہ اسے میں نے چیک کیا ہے۔ اگر یہ ابو کے ہتھے چڑھ جاتا تو پھر سوچو تمہارا کیا حشر ہوتا۔'' صائمہ نے اس کے گرد گھیرا ڈالا۔

''مجھے یقین ہے کہ ابو میرا موبائل کبھی چیک نہ کرتے۔'' وہ یقین سے بولا۔

''تم ابو کی اصول پسندی کا کب تک ناجائز فائدہ اٹھاؤ گے؟'' صائمہ نے بیڈ پر بیٹھتے ہوئے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ ''یہ لڑکی کون ہے، جسے تم نے ایک گھنٹے میں سترہ کالیں کی ہیں؟ دیکھو مجھ سے جھوٹ مت بولنا۔''

''آپی..... مجھے نہیں معلوم کہ وہ کون ہے۔ مجھے تو اس کا نام تک نہیں پتا۔'' عابر یکدم سیدھے راستے پر آ گیا۔

''کس نے دیا تمہیں اس کا نمبر؟'' صائمہ نے پوچھا۔

میرے ایک دوست نے۔'' عابر نظریں جھکا کر بولا۔

''ایسے لفنگے دوستوں سے اپنی جان چھڑاؤ۔'' صائمہ نے سنجیدگی سے کہا۔ ''اگر تمہارا کوئی دوست میرا کسی کو نمبر دے دے تو.....؟'' صائمہ نے اس کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھا۔

''ایسے ہی دے دے گا۔ اسے میں جان سے نہیں مار دوں گا۔'' عابر بپھر گیا۔

''جس کو تم نے، اپنے دوست کے کہنے پر ستانے کا ٹھیکا لیا ہوا ہے، اس کا بھی کوئی بھائی ہوگا۔ وہ اگر تمہیں جان سے مار دے تو.....'' صائمہ اپنے غصے کو دباتے ہوئے بولی۔

عابر نے کچھ بولنے کی کوشش کی، لیکن بول نہیں سکا۔

''مجھ سے وعدہ کرو کہ آئندہ تم اسے فون نہیں کرو گے۔''

''ٹھیک ہے آپی۔'' عابر نے سر جھکا لیا۔

''اس نے قرآن شریف ہاتھ میں لے کر تمہارے مرنے کی بددعا کی ہے۔ اس سے معافی مانگو۔ اس سے کہو کہ آئندہ تم اسے کبھی نہیں ستاؤ گے۔ وہ تمہیں معاف کر دے۔'' صائمہ نے ہدایت کی۔

''ٹھیک ہے آپی.....''

''میں باہر جا رہی ہوں۔ تم ابھی اسے فون کرو۔ معافی مانگو اور مجھے بتاؤ کہ اس نے کیا کہا؟''

''اچھا آپی۔'' وہ فرمانبرداری سے بولا۔

صائمہ نے موبائل عابر کے ہاتھ میں دیا اور کمرے سے نکل آئی۔

پانچ منٹ کے بعد ہی عابر نے اپنے کمرے کا دروازہ کھول کر آواز دی۔ ''آپی۔''

''اچھا آ رہی ہوں۔''

صائمہ کے کمرے میں آنے کے بعد عابر نے دروازہ بند کر لیا اور خالی نگاہوں سے اسے دیکھنے لگا۔

''ہاں۔ کیا ہوا؟''

''آپی۔ میں نے اسے ستانے کی معافی مانگ لی ہے اور آئندہ فون نہ کرنے کا وعدہ بھی کر لیا ہے۔'' عابر نے بتایا۔

''کیا بولی وہ؟'' صائمہ نے پوچھا۔

''اس نے ایک لفظ بھی نہیں کہا۔ مجھے برا بھلا بھی نہیں کہا۔ بس خاموش رہی۔'' عابر نے کہا۔

پھر جب ساری تفصیل صائمہ نے علی نثار کے گوش گزار کی تو وہ ٹھنڈا سانس لے کر رہ گئے۔ چند لمحوں کے توقف کے بعد بولے۔ ''اس کا مطلب ہے، اس لڑکی نے عابر کو معاف نہیں کیا۔''

''ابو۔ معاف کرنا آسان نہیں ہوتا۔ جب کسی کا شدت سے دل دکھے تو معاف کرنا بڑے دل گردے کا کام ہوتا ہے۔'' صائمہ نے بڑی سمجھداری کی بات کی۔

''اللہ رحم کرے۔'' علی نثار نے بس اتنا کہا اور پھر خاموش ہو گئے۔

صائمہ کو اس کا شوہر لینے آ گیا۔ وہ رات کا کھانا کھا کر اپنے گھر چلی گئی۔ عابر اپنے کمرے میں آ گیا۔ اس لڑکی کو فون کرنے کے بعد وہ خاموش ہو گیا تھا۔ اس نے صائمہ کے بچوں سے بھی زیادہ بات نہیں کی جبکہ وہ ان بچوں پر اپنی جان چھڑکتا تھا۔ بچے بھی اس سے چمٹے رہتے تھے۔

صبح جب نازنین، عابر کے کمرے میں گئیں تو وہ خلاف توقع جاگ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں ویرانی چھائی ہوئی تھی۔ ایسی ویرانی کہ نازنین اس کی شکل دیکھ کر کانپ گئیں۔

''کیا ہوا بیٹا۔ خیر تو ہے۔ تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟''

جواب میں عابر نے آنکھیں بند کر لیں۔ کچھ بولا نہیں۔ یوں لگ رہا تھا جیسے اس میں بولنے کی سکت نہ رہی ہو۔ اس کے چہرے پر ایک عجیب سی مردنی چھائی ہوئی تھی۔

نازنین نے گھبرا کر اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھا۔ ''کیا ہوا عابر۔ آنکھیں کھولو۔''

پیشانی پر ہاتھ رکھتے ہی نازنین کو احساس ہوا کہ اس کی پیشانی انتہائی سرد ہے۔

''یا اللہ رحم۔''

وہ تیزی سے کمرے سے باہر آئیں۔

علی نثار دفتر جانے کی تیاری میں تھے۔ نازنین کو ہراساں دیکھ کر بولے۔ ''خیریت؟''

''عابر کو دیکھیں۔ وہ ٹھنڈا ہو رہا ہے۔'' نازنین گھبرا کر بولیں۔

''ٹھنڈا ہو رہا ہے؟'' علی نثار تیزی سے اس کے کمرے کی طرف بھاگے۔

عابر بے سدھ لیٹا ہوا تھا۔ آنکھیں بند تھیں۔

''عابر.....!'' علی نثار نے اسے بے اختیار آواز دی۔ ''کیا ہوا؟''

انہوں نے اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھا۔ ٹھنڈی برف ہو رہی تھی۔ انہوں نے اس کے ہاتھ پاؤں چھوئے، وہ بھی برف کی طرح ٹھنڈے ہو رہے تھے۔

''عابر بیٹا آنکھیں کھولو۔'' نازنین نے اس کے گال تھپتھپاتے ہوئے کہا۔

عابر نے اپنی آنکھیں کھولنے کی کوشش کی لیکن نہ کھول پایا۔

''[illegible]'' علی نثار نے تھرمامیٹر اپنے ہاتھ میں لے کر اسے واش روم میں دھویا اور جھٹک کر تھرمامیٹر پر نظر ڈالی۔ پارہ نیچے آ چکا تھا۔ انہوں نے تھرمامیٹر عابر کے منہ کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''منہ کھولو عابر.....''

عابر نے فوراً منہ کھول دیا۔ علی نثار نے تھرمامیٹر اس کے منہ میں دیتے ہوئے گھڑی پر نظر ڈالی۔ دو منٹ کے بعد تھرمامیٹر منہ سے نکال کر اس پر نظر ڈالی تو سخت پریشان ہو گئے۔

''کتنا ہے؟'' نازنین نے پوچھا۔

''ایک سو چھ۔'' علی نثار نے بتایا۔

''ایک سو چھ!'' نازنین کانپ کر رہ گئیں۔ ''کہیں یہ تھرمامیٹر خراب تو نہیں؟''

''ہو سکتا ہے۔ جاؤ پڑوس سے لے آؤ۔'' علی نثار نے کہا۔

''میں لاتی ہوں۔'' نازنین فوراً گھر سے نکل گئیں۔

علی نثار نے عابر کے چہرے پر نظر ڈالی۔ وہ آنکھیں بند کیے بے سدھ لیٹا تھا۔ انہوں نے اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھا تو عابر نے آنکھیں کھول دیں۔ اس کی آنکھیں دیکھ کر علی نثار دہل گئے۔ ویرانی سی ویرانی تھی۔

بے اختیار ان کا دھیان میسج کی طرف چلا گیا۔ بددعا کے خیال نے انہیں تڑپا دیا۔ ان کی آنکھیں بھر آئیں۔ دل سے دعا نکلی۔ ''یا اللہ، میرے بیٹے پر رحم فرما۔ اس کی غلطی کو معاف فرما۔ اسے بددعا سے بچا۔''

وہ آنکھوں میں آنسو بھرے، گڑگڑا کر دعا مانگتے رہے۔ اتنے میں نازنین لوٹ آئیں۔ کچن میں جا کر انہوں نے تھرمامیٹر دھویا اور تیزی سے علی نثار کی طرف بڑھیں۔

''اتنی دیر لگا دی۔'' علی نثار نے کہا۔

''کوثر تھرمامیٹر ڈھونڈ رہی تھیں۔'' نازنین نے تھرمامیٹر انہیں دیتے ہوئے بتایا۔

علی نثار نے گھڑی دیکھ کر عابر کے منہ میں تھرمامیٹر دے دیا۔

اتنے میں دروازے پر دستک ہوئی۔

''دیکھو کون ہے۔'' علی نثار نے کہا۔

نازنین دروازے کی طرف بڑھیں۔ علی نثار نے عابر کے منہ سے تھرمامیٹر نکال کر چیک کیا تو پارہ ایک سو چھ درجے پر پہنچا ہوا تھا۔

دروازے پر شوکت بھائی تھے، ان کے پڑوسی۔ انہوں نے نازنین کو دروازے پر دیکھ کر پوچھا۔ ''کتنا ہے بخار؟''

''جی۔ وہ چیک کر رہے ہیں۔'' نازنین نے کہا اور دروازہ کھول دیا۔

شوکت بھائی نے اندر آ کر پوچھا۔ ''ہاں، کتنا ہے بخار۔''

''وہی ایک سو چھ۔'' نثار نے بتایا۔

''یہ تو بہت زیادہ ہے..... عابر کو فوراً اسپتال لے جانا چاہئے۔'' شوکت بھائی فکرمند ہو کر بولے۔ ''میں ایمبولینس کال کرتا ہوں۔''

''میرا خیال ہے کہ میں اسے گاڑی میں لے جاتا ہوں۔ ایمبولینس آنے میں جانے کتنی دیر لگے۔'' علی نثار نے اپنے پڑوسی سے جو موبائل فون پر ایمبولینس کا نمبر ملانے لگے تھے، کہا۔

عابر کی حالت ایسی نہ تھی کہ وہ اپنے قدموں پر چل کر گاڑی تک پہنچتا۔ شوکت بھائی اور علی نثار نے سہارا دے کر کسی طرح گاڑی تک پہنچایا اور وہ ایک قریبی اسپتال کی جانب روانہ ہو گئے۔

اسپتال پہنچ کر شوکت اور علی نثار نے عابر کو وہیل چیئر پر بٹھایا اور ایمرجنسی کی طرف بڑھے۔ پیچھے نازنین تھیں۔

ابھی وہ راہداری میں تھے کہ ایک انتہائی بلند آواز سنائی دی۔ ''یا اللہ، مجھے موت دے دے۔''

علی نثار نے پریشان ہو کر سامنے دیکھا۔ نازنین سہم کر علی نثار کے پیچھے ہو گئیں۔

موت مانگنے والا شخص اسٹریچر پر بیٹھا تھا۔ دیکھنے میں وہ مریض نہ لگتا تھا۔ ادھیڑ عمر کا شخص ہوگا۔ وہ بلند آواز میں تسلسل کے ساتھ بددعا کیے جا رہا تھا۔ ''یا اللہ، مجھے موت دے دے۔ یا اللہ، مجھے موت دے دے۔''

جانے وہ شخص کس کرب میں مبتلا تھا کہ موت کی دعا مانگے جا رہا تھا۔

عابر کو ایمرجنسی میں ابتدائی معائنے کے بعد تیزی سے انتہائی نگہداشت کے کمرے میں منتقل کر دیا گیا۔ وہ تینوں باہر بیٹھ گئے۔

موت مانگنے والے شخص کو دیکھ کر علی نثار کی کیفیت عجیب سی ہو گئی تھی۔ انہوں نے کبھی کسی شخص کو اپنے حق میں بددعا کرتے نہیں دیکھا تھا۔ موت مانگنا ایک طرح سے خودکشی کے مترادف تھا۔ اللہ سے اچھے کی امید رکھنا چاہیے۔ دعا مانگنا چاہیے۔ زندگی کی بھیک مانگنا چاہیے۔ جانے اس شخص پر کیا بیت رہی تھی۔ جانے وہ کس اذیت میں مبتلا تھا۔ دیکھنے میں وہ اچھا خاصا تھا۔ پھر جانے وہ تڑپ تڑپ کر موت کی بھیک کیوں مانگ رہا تھا۔

سوچتے سوچتے علی نثار کا ذہن اپنے بیٹے کی طرف منتقل ہوا اور انہوں نے اس کی زندگی کے لیے دعائیں مانگنا شروع کر دیں۔ وہ جیسا بھی تھا، ان کا اکلوتا بیٹا تھا۔ وہ اسے موت کے منہ میں جاتا نہیں دیکھ سکتے تھے۔

اس شخص کے بارے میں بعد میں معلوم ہوا کہ آدھے گھنٹے کے اندر اس کا انتقال ہو گیا تھا۔ وہ کینسر کا مریض تھا۔

عابر کے آئی سی یو میں پہنچنے کے بعد اس سے پہلے کہ علاج شروع ہوتا، اس کا ٹمپریچر معجزانہ طور پر نارمل ہو گیا۔ ڈاکٹروں کے لیے یہ بات حیرت کا باعث بنی کہ ایسا کیسے ہو گیا، لیکن ایسا ہو گیا تھا۔ دو تین گھنٹے اسے احتیاطاً اسپتال میں رکھا گیا، پھر چند دوائیں دے کر رخصت کر دیا گیا۔

صائمہ، عابر کے اسپتال پہنچنے کا سن کر اپنے شوہر اسلم کے ساتھ اسپتال پہنچ گئی تھی۔ وہ سب ایک ساتھ ہی اسپتال سے نکلے۔

ابھی وہ گاڑی میں بیٹھ رہے تھے کہ ایک فقیر نے علی نثار کا راستہ روک لیا۔ اس فقیر نے علی نثار کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر صدا لگائی۔ ''صدقہ دے بابا۔ تیرے بیٹے کی جان بچ گئی۔ تیری دعا کام آ گئی۔ صدقہ دے بابا۔''

فقیر کے اس انکشاف پر علی نثار ہی نہیں، سب حیرت زدہ رہ گئے۔ اس فقیر کو عابر کے بارے میں کیسے معلوم ہوا۔ اسے نہ صرف یہ معلوم تھا کہ عابر کی جان بچی ہے بلکہ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ علی نثار کی دعا نے عابر کی جان بچائی ہے۔ علی نثار نے اپنے بیٹے کی زندگی کے لیے اس قدر تڑپ کر دعا کی تھی، یہ بات تو علی نثار کے سوا ابھی کسی کو معلوم نہ تھی۔

PDF BY Manzoor

علی نثار نے جیب سے بٹوا نکال کر اس میں سے جو نوٹ پہلے ہاتھ میں آیا، وہ انہوں نے فقیر کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ وہ پانچ سو روپے کا نوٹ تھا۔

فقیر نے یہ دیکھے بغیر کہ نوٹ کتنے کا ہے، اپنی مٹھی میں دبا لیا جیسے کوئی کاغذ کا ٹکڑا ہو۔ پھر وہ گاڑی کے پچھلے دروازے کی طرف آیا۔ اس نے عابر پر نظریں جمائیں اور بے نیاز لہجے میں بولا۔ ''تجھے دنیا ڈھونڈ رہی ہے۔''

اتنا کہہ کر وہ سیدھا ہوا اور تیزی سے ایک طرف چلا گیا۔

علی نثار نے ایک گہرا سانس لیا۔ یا الٰہی یہ تیرے پُراسرار بندے۔ انہوں نے اپنے دل میں دہرایا اور گاڑی اسٹارٹ کر دی۔

''ابو۔ یہ فقیر کیا کہہ رہا تھا؟'' صائمہ نے پوچھا۔ وہ پچھلی سیٹ پر عابر کے ساتھ بیٹھی تھی۔ اس کا شوہر موٹر سائیکل پر تھا۔ وہ بچے ساس کے پاس چھوڑ آئی تھی اور شوکت بھائی عابر کی حالت سنبھلنے کا سن کر گھر چلے گئے تھے۔

''پتا نہیں۔ اسے کیسے معلوم ہوا سب کچھ۔ مجھے تو وہ حیران کر گیا ہے۔'' علی نثار الجھے ہوئے تھے۔

''ابو۔ کیا عابر واقعی موت کے منہ میں چلا گیا تھا۔''

''ہاں بیٹا۔ مجھے جب محسوس ہوا کہ اس کی زندگی ختم ہو رہی ہے تو میرے دل سے بے اختیار دعا نکلی اور میرے منہ سے کچھ ایسا نکل گیا جس کی مجھے توقع نہ تھی۔'' علی نثار نے بتایا۔

''ابو۔ آخر آپ کے منہ سے ایسا کیا نکل گیا کہ اللہ نے آپ کی دعا رد نہ کی۔'' صائمہ نے گہری دلچسپی سے پوچھا۔

علی نثار نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ خاموش ہو گئے جیسے فیصلہ کر رہے ہوں بتائیں یا نہ بتائیں۔

''ابو۔ بتائیں نا۔'' صائمہ نے باپ کو خاموش دیکھ کر اصرار کیا۔

''چھوڑو بیٹا۔ اللہ کا شکر ادا کرو کہ تمہارے بھائی کو دوسری زندگی مل گئی۔ اللہ نے اسے بچا لیا۔'' علی نثار نے ممنونِ احسان ہوتے ہوئے کہا۔

''یا اللہ۔ تیرا شکر ہے کہ تو نے میرے بیٹے کی جان بچائی۔'' نازنین نے شکر گزاری کی۔

عابر خاموش بیٹھا تھا۔ اس نے فقیر کی بات سنی تھی۔ صائمہ اور باپ کے درمیان جو مکالمہ چل رہا تھا۔ وہ بھی اس کے کانوں میں پڑ رہا تھا۔ اس کا بخار ایک سو چھ درجے تک جا پہنچا تھا۔ اسے دوسری زندگی ملی تھی۔ گھر سے اسپتال تک اس پر کیا گزری تھی، اس کا اسے پوری طرح ادراک نہ تھا۔

ابو نے جب اس کے منہ میں تھرمامیٹر لگایا تھا تو اس نے ایک نظر آنکھیں کھول کر دیکھا تھا۔ اس کے بعد اس پر غفلت طاری ہو گئی تھی۔ اسے ہوش نہیں رہا تھا۔ اسے اسپتال جا کر ہوش آیا تھا اور پھر بہت تیزی سے اس کی حالت سنبھلتی چلی گئی تھی۔ اب وہ اپنے بارے میں عجیب و غریب باتیں سن رہا تھا۔ کیا واقعی وہ موت کے منہ میں چلا گیا تھا۔ کیا واقعی اسے نئی زندگی ملی تھی۔

''جی۔ ابو؟'' صائمہ نے پھر علی نثار کی توجہ دعا کی طرف مبذول کروائی۔

''بیٹا۔ گھر چلو۔ پھر اطمینان سے بتاؤں گا۔'' علی نثار نے کہا۔

صائمہ نے ضد نہ کی۔ اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ ابو، عابر کے سامنے بات کرنے سے گریز کر رہے ہیں یا پھر بتانا ہی نہیں چاہتے تھے۔

لیکن صائمہ چھوڑنے والوں میں سے نہ تھی۔ اس نے گھر پہنچتے ہی باپ کا ہاتھ پکڑا اور علی نثار کو ڈرائنگ روم میں لے آئی اور انہیں صوفے پر بٹھاتے ہوئے خود بھی ان کے ساتھ بیٹھ گئی۔

''ابو۔ جلدی سے بتا دیں، اس سے پہلے کہ سب لوگ ادھر آ جائیں۔''

''اچھا بتاتا ہوں۔ بیٹا جب میں نے عابر کی پیشانی پر ہاتھ رکھا تو اس نے آنکھیں کھولی تھیں۔ اس کی آنکھیں دیکھ کر میرا دل بیٹھ گیا۔ اس کی آنکھوں میں انتہائی ویرانی تھی، مردنی چھائی ہوئی تھی۔ اس کی آنکھیں دیکھ کر جانے کیوں میرا دھیان اس لڑکی کی بددعا کی طرف چلا گیا۔ مجھے یوں لگا جیسے اس کی بددعا کارگر ہو گئی ہے۔ عابر بس چند لمحوں کا ہے۔ تب میں نے فوراً اللہ سے رحم کی بھیک مانگی اور بددعا سے بچاؤ کی درخواست کی۔ پھر بے اختیار میرا جی چاہا کہ میں اپنی زندگی کے بدلے عابر کی زندگی مانگ لوں۔ ابھی میں یہ کہنے ہی والا تھا کہ اللہ میں زندگی کی آخری حدوں پر ہوں۔ مجھ سے میری زندگی لے لے اور اس کے بدلے میرے بیٹے عابر کو زندگی عطا کر دے۔ پھر فوراً ہی خیال آیا کہ اللہ تنگ دست تو نہیں، اس کے پاس زندگیوں کی کیا کمی ہے۔ میں اپنی موت کی دعا کیوں کروں۔ اللہ کو یہ بات بری نہ لگ جائے کہ میں نے اسے اتنا تنگ دل اور چھوٹا کیوں سمجھ لیا۔ اللہ تو سب سے بڑا ہے، وسیع القلب ہے۔ بس پھر میں نے اللہ سے رحم طلب کیا۔ عابر کی زندگی کی بھیک

PDF BY Manzoor

مانگی۔ آدھے گھنٹے کے اندر عابر کا بخار نارمل ہوگیا۔ ڈاکٹر حیران رہ گئے۔ بس اللہ یوں ہی حیران کرتا ہے۔ اللہ نے میری سن لی، میری دعا قبول کرلی۔ دعا کی قبولیت کی تصدیق تو وہ فقیر بھی کرگیا۔'' علی نثار نے ساری بات اس تفصیل اور اس انداز سے بتائی کہ پھر کوئی سوال کرنے کی گنجائش نہ رہی۔

رات کے کھانے پر جب علی نثار، نازنین اور عابر سر جھکائے کھانے میں مصروف تھے تو علی نثار نے اپنا سر اٹھایا، ایک نظر عابر پر ڈالی۔ عابر نے نظر اٹھائی، باپ کو دیکھا اور دوبارہ کھانے میں مصروف ہوگیا۔

''عابر، میری بات غور سے سنو۔'' علی نثار اچانک بولے۔

''جی، ابو۔'' اس نے نظریں نیچی کیے ہوئے کہا۔

''تمہیں دوسری زندگی ملی ہے۔ اس زندگی کو اب سونے میں نہ گزار دینا۔''

''جی، اچھا ابو۔'' عابر نے انتہائی فرمانبرداری سے کہا، جیسے صبح اٹھتے ہی نوکری ڈھونڈنے نکل جائے گا۔

لیکن ایسا کچھ نہ ہوا۔ عابر کی صحت پر کوئی اثر نہ پڑا۔ سب کچھ جوں کا توں رہا۔ وہی کمپیوٹر، وہی موبائل، وہی دوپہر تک سونا اور پھر دوستوں میں نکل جانا۔ اسے اس بات کی کوئی فکر نہ تھی کہ بقول ابو دوسری زندگی ملی ہے یا تیسری۔ اسے بس اپنا طرزِ زندگی پسند تھا۔

صائمہ نے وقفے وقفے سے عابر کا موبائل چیک کیا تھا۔ لیکن اس نے اس لڑکی کو پھر کال نہیں کی تھی۔ اس نے بہن سے کیا وعدہ نبھا دیا تھا۔

پھر ایک نیا گل کھلا۔

عابر کے ایک دوست وقار حسن کی بڑی بہن کی شادی تھی۔ شادی لان میں عابر، وقار کے ساتھ ہی تھا۔ کھانے کی نگرانی ان دونوں کی ذمہ داری تھی۔ وہ لان میں اِدھر سے اُدھر گھومتے پھر رہے تھے۔ عابر نیوی بلیو سوٹ میں انتہائی پُرکشش لگ رہا تھا۔ وہ اچھے قد و کاٹھ، سرخ و سفید رنگت، ہلکی سبز آنکھوں والا بلاشبہ ایک خوبرو لڑکا تھا۔ اس کی مسکراہٹ میں بہت جان تھی، وہ ہجوم میں الگ ہی نظر آتا تھا۔

ایک فیملی عابر کو بڑی دلچسپی سے دیکھ رہی تھی بلکہ یوں کہنا چاہیے، نظریں جمائے ہوئے تھی۔ جہاں یہ فیملی بیٹھی تھی، وہاں سے عابر صاف آتا جاتا نظر آ رہا تھا۔ عابر کو تاڑنے والی یہ فیملی نو افراد پر مشتمل تھی اور اس میز پر ان کے علاوہ کوئی اور نہ تھا جبکہ ایک کرسی خالی پڑی تھی۔

سیاہ رنگ کے چیچک رو شخص نے اپنی گوری چٹی فربہ بدن بیوی سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''چاندنی، کیا میں جو دیکھ رہا ہوں، تم بھی وہی دیکھ رہی ہو؟''

''ہاں۔ میں بھی وہی دیکھ رہی ہوں۔'' چاندنی نے ترچھی نظروں سے اپنے شوہر ڈاکٹر نوشاد کو دیکھا۔

اماں ابا کی گفتگو سن کر دائیں بائیں بیٹھی لڑکیوں میں ہلچل سی ہوئی۔ وہ سات لڑکیاں تھیں۔ ان سات لڑکیوں میں درمیان میں بیٹھی لڑکی حسن کی دیوی تھی جبکہ اس کے اردگرد بیٹھی بہنیں اس دیوی کی پجارن لگ رہی تھیں۔ ان ساتوں میں جو سب سے بڑی تھی، اس نے اپنے برابر بیٹھی چھوٹی بہن کے کان میں صور پھونکا۔ اور وہ بات جو ان کے ابا اماں میں شروع ہوئی تھی، ان لڑکیوں کے درمیان مکمل ہو چکی تھی۔

''ابو۔ کیا میں اٹھوں؟'' بڑی بیٹی شائستہ نے پوچھا۔

''ہاں۔ جاؤ، ساتھ ملکہ کو لے جاؤ۔'' ڈاکٹر نوشاد نے مسکراتے ہوئے کہا۔ اس کی مسکراہٹ انتہائی مکروہ تھی۔ اس کا تو پورا وجود ہی مکروہ تھا۔ پتا نہیں وہ کیسے ڈاکٹر بن گیا تھا۔

''مجھے تو یہ وقار کا کوئی دوست دکھائی دیتا ہے۔ پھر بھی پوچھ لینا اور دیکھو، بہت زیادہ اوور مت ہونا، تہذیب تمیز کے دائرے میں رہنا۔'' چاندنی نے ہدایت کی۔

اس وقت شادی لان مہمانوں سے بھر چکا تھا۔ نکاح ہوئے آدھا گھنٹہ گزر گیا تھا۔ کھانا کھولنے کی تیاری چل رہی تھی۔ عابر دولہا والوں کی خصوصی میز کا جائزہ لے کر پلٹ رہا تھا کہ کسی نے آواز دی۔

''سنیے۔''

آواز نسوانی اور مترنم تھی۔ عابر جانتا تھا کہ یہاں اسے کوئی سرِ راہ آواز دینے والا نہیں۔ پھر بھی احتیاطاً اس نے پیچھے مڑ کر دیکھ لیا۔ دو لڑکیاں تیزی سے اس کی طرف بڑھیں۔ عابر نے ایک نظر دونوں پر ڈالی۔ ایک لڑکی کم عمر اور دلربا تھی جبکہ دوسری اس سے پانچ چھ سال بڑی تھی لیکن بری نہ تھی۔ البتہ وہ دونوں لڑکیاں اس کیلئے اجنبی تھیں۔

عابر کو یقین تھا کہ وہ کسی غلط فہمی کا شکار ہو کر اس سے مخاطب ہوئی ہیں۔ عابر کو یہ پتا نہیں تھا کہ وہ کسی غلط فہمی کا شکار نہیں ہوئیں بلکہ شکار کرنے نکلی ہیں۔

''سنیے! آپ براتی ہیں یا گھراتی؟'' شائستہ نے قریب آ کر پوچھا۔

''میں سمجھا نہیں۔'' عابر بولا۔

''ہمارا مطلب ہے، آپ دولہا کی طرف سے ہیں یا لڑکی والے ہیں؟''

''میں لڑکی والوں کی طرف سے ہوں۔ میرے دوست وقار کی بہن کی شادی ہے۔'' عابر نے شائستہ کے ساتھ کھڑی لڑکی پر نظریں جما کر کہا۔ ''فرمائیے کیا مسئلہ ہے؟''

ملکہ نے اسے اپنی طرف متوجہ پا کر اسے ایک خاص انداز سے دیکھا اور ہلکا سا مسکرائی اور پھر اپنی آنکھیں پھیر لیں۔

''دیکھیں۔ یہاں آس پاس کوئی ڈاکٹر مل جائے گا۔'' شائستہ پُرتشویش لہجے میں بولی۔

''خیریت!'' عابر نے پریشان ہو کر کہا۔

''ہمارے والد کی اچانک طبیعت خراب ہوگئی ہے۔'' شائستہ کے لہجے میں گھبراہٹ در آئی۔ ''وہ دل کے مریض ہیں۔''

''کہاں ہیں آپ کے والد؟'' عابر نے پوچھا۔

''وہ سامنے......ادھر۔'' شائستہ نے چہرے پر گھبراہٹ لیکن اندر مسکراہٹ بکھیرتے ہوئے جواب دیا اور وہ دونوں تیزی سے آگے بڑھیں۔

ڈاکٹر نوشاد اپنی بیٹیوں کو دیکھتے ہی اٹھ کر کھڑا ہوگیا اور تیزی سے بولا۔ ''تم لوگ کہاں چلی گئی تھیں بغیر بتائے۔''

''ابو۔ آپ نے دل پر ہاتھ رکھا تو ہمیں فوراً تشویش ہوگئی کہ کہیں دل میں تکلیف نہ شروع ہوگئی ہو۔ ہم ان کو لے کر آئے ہیں تاکہ آپ کو اسپتال لے جایا جاسکے۔ ابو آپ نہیں جانتے کہ آپ ہمارے لئے کس قدر قیمتی ہیں۔'' شائستہ نے فوراً اپنی آنکھوں میں آنسو بھر لئے۔

''ارے میری بچی، میں بالکل ٹھیک ہوں۔'' ڈاکٹر نوشاد نے شائستہ کو اپنے نزدیک کرلیا۔ ''تم نے خواہ مخواہ ان کو پریشان کیا۔ وہ ایک ہلکا سا درد اٹھا تھا، زبان کے نیچے گولی رکھ لی، بس ٹھیک ہوگیا۔''

''اب اپنی ہی باتوں میں لگے رہو گے یا اس شریف لڑکے کا بھی شکریہ ادا کرو گے کہ یہ ہماری مدد کو دوڑے آئے ہیں۔ بیٹا آپ کا کیا نام ہے؟'' اس بار چاندنی نے کمان اپنے ہاتھ میں لے لی۔

''جی، میرا نام عابر ہے۔'' عابر نے ملکہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ اس سے نظریں ہٹانا آسان نہ تھا۔

''بڑا پیارا نام ہے۔'' چاندنی نے تعریف کرنے میں ذرا بھی دیر نہ لگائی اور پھر ڈاکٹر نوشاد کی طرف دیکھا۔

ڈاکٹر نوشاد پہلے ہی ''ایکشن'' میں آ چکا تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر عامر سے پُرجوش انداز میں ہاتھ ملایا اور کندھے پر ہاتھ رکھ کر بڑے پیار بھرے انداز میں بولا۔ ''بیٹا! معاف کرنا، ان بے وقوف لڑکیوں نے آپ کو پریشان کردیا۔ میں بڑا شرمندہ ہوں۔'' پھر کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ''دو منٹ ہمارے پاس بیٹھیں۔''

عابر نے خالی کرسی کی طرف دیکھا۔ اس کرسی کے برابر ملکہ بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے فوراً کرسی سنبھال لی۔ قربت کا اس سے بہتر موقع ملنا فی الحال ممکن نہ تھا۔

''اس میں شرمندگی کی کوئی بات نہیں۔ میں کون سا کوہ قاف سے آیا ہوں۔'' عابر نے ہنستے ہوئے کہا۔

''کوہ قاف سے آپ بے شک نہ آئے ہوں لیکن لگتے پری زاد ہیں۔'' شائستہ سے چھوٹی بہن فاخرہ نے پھلجھڑی چھوڑی، جس پر سب نے قہقہہ لگا کر خوشی کا اظہار کیا۔

''میرا نام ڈاکٹر نوشاد ہے۔'' ڈاکٹر نوشاد نے اپنا تعارف کرایا۔ اس تعارف پر عابر حیران رہ گیا۔ یہ خود ڈاکٹر ہے تو پھر لڑکیاں کیوں ڈاکٹر کی تلاش میں نکلی تھیں۔

اس مسئلے پر اس نے زیادہ غور کرنے کی کوشش نہ کی۔ وہ اس وقت بہت خوش تھا کہ ایک پری کے برابر بیٹھا تھا اور اس کے گھر کے لوگ اس کی پذیرائی میں لگے تھے۔

''لڑکیو......چلو بھائی کو اپنے اپنے نام بتاؤ۔'' چاندنی مسکراتے ہوئے بولی۔

لڑکیوں نے مسکرا مسکرا کر اپنے نام بتانے شروع کیے۔ جب ساتوں لڑکیوں نے اپنے نام بتا دیئے تو چاندنی بولی۔ ''میں چاندنی ہوں، ان لڑکیوں کی ماں۔''

عابر کو چاندنی سے دلچسپی تھی نہ شائستہ، فاخرہ، ماجدہ سے۔ اسے صرف اپنے برابر بیٹھی لڑکی سے دلچسپی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے کسی کا نام غور سے سنا ہی نہ تھا۔ اگر سنا تھا تو صرف ملکہ کا نام...... وہ واقعی کسی ملکہ سے کم نہ تھی۔

پھر عابر کو کچھ یاد نہ رہا۔ وہ یہ بھی بھول گیا کہ اپنے دوست وقار کی بہن کی شادی میں آیا تھا۔ اسے کھانے کی نگرانی کرنی تھی۔ بس یاد رہا تو اتنا کہ اس کے پہلو میں ایک حسین ترین لڑکی براجمان ہے اور ہر طرف سے ''عابر بھائی اور بیٹا عابر'' کی آوازیں آ رہی ہیں۔

ملکہ سب سے کم بول رہی تھی۔ شکر ہے اس نے ''عابر بھائی'' کہہ کر مخاطب نہ کیا تھا، بس وہ ہنستی مسکراتی رہی تھی۔ شائستہ سب سے زیادہ بول رہی تھی۔ اس نے باتوں باتوں میں عابر کا نمبر لے لیا تھا۔ نمبر پنچ کر کے عابر کے موبائل پر ''مس کال'' دی تھی کہ شائستہ کا نمبر اس کے موبائل پر آجائے اور وہ اس کا نمبر سیو کرلے بلکہ اس مس کال کا اصل مقصد عابر کے دیئے ہوئے نمبر کی تصدیق کرنا تھا۔

اچانک کھانے سے ڈھکن اٹھائے جانے کی کھٹا کھٹ آوازیں آئیں تو عابر کو ہوش آیا کہ وہ کہاں آیا تھا اور کہاں بیٹھا تھا۔ وقار اسے ڈھونڈ رہا ہوگا۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھا۔

''بیٹا کہاں چلے۔ تم ہمیں پسند آئے ہو، ہمارے ساتھ کھانا کھاؤ۔'' چاندنی نے بہت محبت سے کہا۔

''ہاں اور کیا۔'' شائستہ نے تائید کی۔

''امی ٹھیک کہہ رہی ہیں۔'' ملکہ نے کچھ اس انداز میں سرگوشی کی کہ اسے لگا جیسے یہ الفاظ اس کے پاؤں کی بیڑیاں بن گئے ہوں۔

ڈاکٹر نوشاد اور کئی لڑکیاں کھانا لینے جا چکی تھیں۔

''جی۔ اچھا۔'' اس نے چاندنی کی طرف دیکھ کر کہا لیکن اتنی آہستہ کہ صرف ملکہ ہی سن سکی۔ اس کے بعد اس نے بلند آواز میں اعلان کیا۔ ''میں کھانا لے کر آتا ہوں۔''

PDF BY Manzoor

عابر کے اچانک غائب ہو جانے پر وقار پریشان ضرور ہوا تھا لیکن جلد ہی وہ اسے ایک فیملی کے پاس بیٹھا نظر آ گیا تھا۔ اپنی مصروفیت کی وجہ سے وہ اس میز تک نہیں گیا تھا۔ اس نے گمان کیا تھا کہ شاید عابر کو اس کی جان پہچان کی کوئی فیملی مل گئی ہے، بچہ عیش کر رہا ہے تو کرنے دو۔

کھانے سے فارغ ہونے کے بعد جب سب اٹھنے لگے تو ملکہ نے دھیرے سے کہا۔ ''کیا آپ ہمارے گھر آنا پسند کریں گے؟''

یہ تو بلی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹنے والی بات تھی۔ وہ پریشان تھا کہ آئندہ ملکہ سے کہاں اور کس طرح مل سکے گا۔ اس کی اس دعوت پر وہ باغ باغ ہو اٹھا۔ ڈاکٹر نوشاد کی فیملی خاصی بے تکلف واقع ہوئی تھی۔ ایک ڈیڑھ گھنٹے میں وہ لوگ اس طرح قریب آ گئے تھے کہ اسے لگتا تھا جیسے وہ انہیں برسوں سے جانتا ہو۔ ملکہ کی بات سن کر اسے بے حد اچھا لگا لیکن وہ چاہتا تھا کہ یہ دعوت کوئی بڑا دے۔

''ہمیں کوئی کیوں بلائے گا۔'' عابر نے اتنے زور سے کہا کہ بات چاندنی کے کانوں تک پہنچ گئی۔

''ہم بلائیں گے اور تمہیں آنا ہوگا۔ کیوں نوشاد؟'' چاندنی نے کالے چاند کو بھی ساتھ لپیٹ لیا۔

''ان کا آنا مجھے بہت اچھا لگے گا۔'' ڈاکٹر نوشاد نے فوراً تائید کی مہر ثبت کر دی۔

عابر جب ان لوگوں کو چھوڑنے کیلئے لان کے باہر جا رہا تھا تو راستے میں وقار مل گیا۔

''او یار تم کدھر غائب ہو۔'' وقار نے پوچھا۔

عابر نے انتظار کیا کہ وقار ڈاکٹر نوشاد اینڈ فیملی سے 'ہیلو ہائے' کرے گا لیکن جب اس نے شناسائی کا کوئی تاثر نہ دیا تو عابر نے وقار کا تعارف کرایا۔ ''انکل، یہ وقار ہیں، میرے دوست۔''

ڈاکٹر نوشاد کو یہ بات سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ وقار کون ہے۔ لہٰذا وہ اس سے بڑے تپاک سے ملا اور بولا۔ ''آپ وقاص صاحب کے بیٹے ہیں؟''

''جی!'' وقار نے مودبانہ انداز میں کہا۔ ''اور آپ انکل؟''

''میں ڈاکٹر نوشاد ہوں، آپ کے پاپا کا دوست۔'' ڈاکٹر نوشاد نے کہا۔

عابر جب انہیں چھوڑ کر واپس آیا تو اس نے وقار سے پوچھا۔ ''کیا تم ڈاکٹر نوشاد سے کبھی نہیں ملے؟''

''یار...... مجھے نہیں معلوم کہ یہ کون شخص ہے۔ ہو سکتا ہے پاپا کا جاننے والا ہو۔ یہ تو اپنے پورے گھر کو لے کر آیا ہوا تھا۔'' وقار نے ہنستے ہوئے پوچھا۔ ''تم ان لوگوں کو کیسے جانتے ہو؟''

تب عابر نے اسے تفصیل سے بتایا کہ وہ کیسے انہیں جانتا ہے۔

''اچھا۔ تیرے تو پھر مزے آ گئے۔'' وقار نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''میں پاپا سے پوچھوں گا اس فیملی کے بارے میں۔''

اور جب وقار نے ڈاکٹر نوشاد کے بارے میں اپنے پاپا سے استفسار کیا تو انہوں نے صرف اتنا کہا۔ ''ہاں، وہ میرے واقف کار ہیں۔''

عابر کو اس بات سے دلچسپی نہ تھی کہ ان لوگوں کو وقار یا اس کے پاپا جانتے ہیں یا نہیں...... اس خاندان سے اس کی اپنی واقفیت ہو گئی تھی، یہ اس کیلئے کافی تھا۔

شائستہ نے اگلے دن ہی اس سے فون پر رابطہ کر لیا۔ اس سے چھوٹی بہن فاخرہ کے میسج آنے لگے تھے۔ یہ زیادہ تر لطیفے ہی کی صورت میں ہوتے۔ عابر کو ان دونوں سے دلچسپی نہ تھی۔ وہ جس سے بات کرنا چاہتا تھا، اسے ان لوگوں نے دور رکھا ہوا تھا۔

وہ ملکہ سے بات کرنے کی بات کرتا تو وہ خوشی خوشی اس سے بات کرا دیتے لیکن عابر کو محسوس ہوتا جیسے ملکہ بات کرتے ہوئے ہچکچا رہی ہو۔ اس کی ہچکچاہٹ دیکھ کر اس نے ملکہ سے موبائل نمبر مانگا تو اس نے کہا۔ ''میرے پاس موبائل نہیں۔''

یہ اسرار عابر کی سمجھ میں نہ آیا۔ اتنی بے تکلف اور ماڈرن فیملی ہونے کے باوجود گریز؟ کیا واقعی ملکہ کے پاس موبائل نہ تھا یا اس کی بہنیں نہیں چاہتی تھیں کہ وہ اس سے بات کرے۔

لیکن کیوں؟

ملکہ اس کے دل میں سما گئی تھی۔ آنکھوں میں بس گئی تھی۔ اس کے وجود پر گھٹا بن کر چھا گئی تھی۔ اسے اب احساس ہوا تھا کہ محبت بھی کوئی چیز ہے۔ لیکن محبت چیز کیا ہے، یہ وہ نہیں جانتا تھا۔ ملکہ سے ایک ملاقات نے اس کی کایا پلٹ دی تھی۔ وہ کھلنڈرا سا لڑکا تھا، لاابالی تھا۔ لیکن اب اس پر سنجیدگی طاری ہوتی جا رہی تھی۔

محبت کے بارے میں ہر شخص کا اپنا تجربہ ہوتا ہے۔ محبت صدیوں سے رائج کسی سکے کی طرح ہے لیکن محبت میں کھوٹا سکہ نہیں چلتا۔ کچھ کہتے ہیں، محبت ہو جاتی ہے۔ کچھ کہتے ہیں محبت کی جاتی ہے۔ محبت ہو جائے تو عشق بن جاتی ہے۔ محبت کی جائے تو بزنس ہو جاتی ہے جس میں نفع نقصان دیکھا جاتا ہے جبکہ ہو جانے والی محبت نفع نقصان سے مبرا ہوتی ہے۔

جب کبھی ہم کسی نئے شخص سے ملتے ہیں تو وہ یکدم اچھا لگتا ہے یا برا۔ پھر اس احساس کو گہرا سامنے والی کی خوبیاں کرتی ہیں۔ روح کی ہم آہنگی کے بعد ذہنی ہم آہنگی شروع ہوتی ہے اور ایک دوسرے کے لئے دلوں میں تڑپ بڑھتی جاتی ہے۔

محبت کے معاملے میں مرد کے مقابلے میں عورت افضل ہوتی ہے۔ افضل یوں کہ اس کی محبت میں گہرائی ہوتی ہے۔ مرد محبت کے معاملے میں پہلے جسم ہوتا ہے، پھر روح جبکہ عورت محبت کے معاملے میں پہلے روح ہوتی ہے، پھر جسم۔ عورت کی محبت میں جنس کہیں بہت پیچھے ہوتی ہے جبکہ مرد کی محبت میں جنس سامنے ہوتی ہے اور روح کہیں بہت پیچھے۔ یہی وجہ ہے کہ عورت جب کسی کی محبت میں گرفتار ہوتی ہے تو اسے بھولتی نہیں، چاہے وہ اسے حاصل ہو یا نہیں ہو۔ مرد اپنی محبت کو بھولنے میں زیادہ دیر نہیں لگاتا، چاہے وہ حاصل ہی کیوں نہ ہو جائے۔

کہتے ہیں کہ عورت کو سمجھنا مشکل ہوتا ہے۔ شاید اس لئے کہ وہ بہت اندر ہوتی ہے۔ مرد کو سمجھنا اس لئے آسان ہوتا ہے کہ وہ باہر ہوتا ہے۔ عورت مسکرانے کے باوجود اندر سے رو رہی ہوتی ہے اور کبھی پلکوں پر آنسو ہونے کے باوجود وہ اندر سے خوش ہوتی ہے۔ اسی لئے پہیلی کہلاتی ہے لیکن ایسی پہیلی جسے محبت کے ذریعے بوجھا جا سکتا ہے۔

ان دنوں ملکہ، عابر کے لئے پہیلی بنی ہوئی تھی۔ عابر کو یاد تھا کہ شادی لان سے رخصت ہوتے وقت اس نے کتنے پیار سے کہا تھا کہ کیا آپ ہمارے گھر آنا پسند کریں گے؟ پھر اس کی تائید چاندنی نے یہ کہہ کر کی تھی کہ ہم بلائیں گے اور تمہیں آنا ہوگا۔

دس پندرہ دن گزرنے کے باوجود اُدھر سے بلاوا نہیں آیا تھا۔ گھر بلانے کی بات تو دور اس کی ملکہ سے بات بھی نہیں کروائی جا رہی تھی۔ بس دونوں بہنیں شائستہ اور فاخرہ چھائی ہوئی تھیں۔ میسج بھیجے جا رہے تھے۔ موبائل پر بات ہو رہی تھی لیکن ملکہ کو سات پردوں میں چھپا رکھا تھا۔ جب وہ ملکہ سے بات کرنے کی بات کرتا تو بڑی خوش اخلاقی کا مظاہرہ کیا جاتا لیکن بات نہ کرائی جاتی، کوئی ایسا بہانہ بنا دیا جاتا کہ عابر کی زبان پر تالا لگ جاتا۔

اب عابر سے صبر نہیں ہو رہا تھا۔ وہ ملکہ کو دیکھنا چاہتا تھا۔ اس سے بات کرنا چاہتا تھا۔ ایک دن جب اتفاق سے ملکہ سے موبائل پر بات ہو گئی تو عابر نے بڑی بے قراری سے کہا۔ ''ملکہ، تم سے بات ہوتی ہے نہ ملاقات ہوتی ہے۔ میں کیا کروں؟''

''عابر...... صبر کریں۔'' ملکہ نے ہنستے ہوئے کہا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ اس وقت موبائل کا اسپیکر کھلا ہوا ہے اور اس کی آواز چاندنی اور شائستہ بھی سن رہی ہیں۔

''ملکہ، تم ہنس رہی ہو، میری جان پر بنی ہے۔'' عابر نے جذباتی لہجے میں کہا۔

''اللہ نہ کرے کہ آپ کی جان پر بنے، بے شک میری جان پر بن جائے۔'' ملکہ بڑی لگاوٹ سے بولی۔ ''میں ہنس اس لئے رہی تھی کہ اس کے سوا اور کیا کر سکتی ہوں۔''

''ملکہ اس وقت کیا تمہارے پاس کوئی بیٹھا ہے؟'' عابر نے اپنا شک رفع کرنا چاہا۔

''نہیں، میں تنہا ہوں۔'' ملکہ نے چاندنی اور شائستہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''شائستہ باجی مجھے موبائل دے کر واش روم چلی گئی ہیں۔''

''ملکہ، کیا ہم کہیں باہر نہیں مل سکتے۔'' عابر کی بے قراری سر چڑھ کر بول رہی تھی۔

''باہر کیوں...... ہم گھر پر ہی ملیں گے۔ امی آج ہی ذکر کر رہی تھیں کہ عابر کو بلانا ہے۔ وہ کیا سوچتا ہوگا کہ کیسے لوگ ہیں؟'' ملکہ کے لہجے میں یقین تھا۔

''نہیں، میں کچھ نہیں سوچتا۔ تمہارے متعلق سوچنے سے فرصت ملے تو کچھ اور سوچوں۔''

''عابر ایک بات بتائیں۔ سچ بتایئے گا۔'' یہ کہہ کر ملکہ نے وقفہ دیا۔

''ہاں پوچھو۔ کیا پوچھنا ہے۔ جو کہوں گا، سچ کہوں گا، سچ کے سوا کچھ نہ کہوں گا۔''

''آپ بولتے بہت اچھا ہیں۔'' ملکہ نے ہنس کر کہا۔

''تم کچھ پوچھ رہی تھیں؟'' عابر اس کی بات جاننے کے لئے بے قرار تھا۔

''ہاں۔ میں یہ پوچھ رہی تھی کہ......'' وہ کہتے کہتے یکدم رکی۔ ''پتا نہیں، مجھے آپ سے یہ سوال کرنے کا حق بھی ہے یا نہیں۔''

''حق کی بات نہ کرو۔ کہو تو اپنے قتل کا لائسنس تمہیں دے دوں۔'' عابر نے جذباتی انداز اختیار کیا۔

''قتل کا لائسنس نہ دیں۔ بس اتنا بتا دیں کہ کیا آپ کو مجھ سے محبت ہو گئی ہے؟'' یہ کہتے ہوئے ملکہ نے شائستہ کی طرف دیکھا۔ شائستہ نے اسے انگوٹھا دکھایا یعنی ویری گڈ۔

''ہاں۔ تم نے صحیح اندازہ لگایا۔ میں واقعی تم پر مرمٹا ہوں۔'' عابر نے اپنا دل کھول دیا۔

عابر کو شائستہ پر غصہ تھا۔ جب بھی بات کسی موڑ پر پہنچنے لگتی تو وہ ویمپ بن کر درمیان میں آ جاتی۔ آج بھی یہی ہوا تھا۔ ملکہ بات کرنے پر آمادہ تھی۔ بات بڑھنے لگی تھی کہ وہ درمیان میں ٹپک پڑی اور وہ تلملا کر رہ گیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ ملکہ سے اکیلے کیسے ملے۔

ملکہ اس کے دل و دماغ پر چھائی ہوئی تھی۔ اس کی آنکھوں میں بسی ہوئی تھی۔ وہ گھنٹوں اس کے تصور میں گم رہتا۔ خود سوال کرتا اور خود ہی جواب دیتا۔

نازنین بیٹے کی بدلتی کیفیت کو بغور دیکھ رہی تھیں۔ وہ اس لاابالی پن، بے نیازی سے پہلے ہی تنگ تھیں کہ اب ان چیزوں میں مزید اضافہ ہو گیا تھا۔ عابر ہر وقت کھویا کھویا سا رہنے لگا تھا۔ پہلے وہ اپنی شکل و صورت اور لباس کے معاملے میں خاصا حساس تھا۔ وہ اپنے کپڑے استری کرنے میں گھنٹوں لگاتا۔ کپڑے کی ایک ایک شکن نکالتا۔ نازنین چیختی رہتیں۔ ''بجلی خرچ ہو رہی ہے، استری جلدی کرو۔'' پر کیا مجال جو اس کے کان پر جوں رینگ جائے۔ واش روم میں جاتا تو گھنٹوں شیو بنانے اور نہانے دھونے میں لگا دیتا۔ نازنین دروازہ کھٹکھٹاتی رہتیں۔ ''بیٹا ناشتا ٹھنڈا ہو رہا ہے، جلدی آؤ۔'' اب یہ حال کہ شیو بڑھا ہے تو بڑھا ہے۔ جو کپڑے پہن لئے، سو پہن لئے۔ استری تو دور کی بات، وہ کئی کئی دن کپڑے نہ بدلتا۔

ایک شام دونوں ماں بیٹی نے اسے گھیر لیا۔ وہ آج چار بجے سو کر اٹھا تھا اور اس وقت ناشتے میں مصروف تھا کہ وہ دونوں ڈائننگ ٹیبل پر دائیں بائیں کرسیاں کھینچ کر بیٹھ گئیں۔

''عابر، تم کوئی نشہ وشہ تو نہیں کرنے لگے۔'' صائمہ نے بلاتمہید گفتگو شروع کی۔

عابر نے نظریں اٹھا کر بہن کو دیکھا اور بولا۔ ''کیا ہو گیا آپی، آپ کو؟''

''مجھے تو کچھ نہیں ہوا۔ ہم تمہاری حالت دیکھ کر پریشان ہیں۔ اب تم چار چار بجے سو کر اٹھنے لگے ہو۔ اپنی شکل دیکھو، اپنے کپڑے دیکھو، تم ایسے تو نہ تھے۔'' صائمہ نے شکوہ بھری نظروں سے اسے دیکھا۔

عابر کے چہرے پر پھیکی سی مسکراہٹ ابھری۔ ابھی وہ کوئی جواب دینے والا تھا کہ نازنین بول پڑیں۔ ''عابر خود کو سنبھالو، ہم سب پریشان ہیں۔ تمہارے ابو سخت غصے میں ہیں۔ اللہ نے تمہیں نئی زندگی دی ہے۔ تم پھر جانے کس چکر میں پڑ گئے۔''

PDF BY Manzoor

زندگی دی ہے۔تم پھر جانے کس چکر میں پڑ گئے۔''

''امی۔میں مرجاتا تو اچھا ہوتا۔آپ کی جان چھوٹ جاتی اور میں بھی سکون پا جاتا۔'' عابر کے لہجے میں یکلخت تلخی در آئی۔وہ ناشتا چھوڑ کر اٹھ گیا اور غصے میں باہر نکل گیا۔

صائمہ اور نازنین ایک دوسرے کا منہ دیکھتی رہ گئیں۔یہ اسے کیا ہوا۔

عابر گھر سے نکل کر سیدھا وقار کے پاس پہنچا۔وقار کہیں جانے کی تیاری میں تھا۔عابر کو دیکھ کر اس نے اپنا ارادہ ملتوی کر دیا اور اسے لے کر ڈرائنگ روم میں آ بیٹھا۔

''کہاں سے آ رہا ہے؟'' وقار نے اس کے حلیے پر نظر ڈال کر کہا۔

''گھر سے۔'' عابر نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔

''ڈانٹ کھا کر نکلا ہے؟'' وقار نے پوچھا۔

''یار۔امی اور آپی میرے پیچھے لگ گئیں تو ناشتا چھوڑ کر نکل آیا۔'' عابر نے بتایا۔

''ہوا کیا آخر؟'' وقار نے پوچھا۔

''چھوڑ ان باتوں کو۔میں اس وقت تیرے پاس ایک خاص کام سے آیا ہوں۔'' عابر کے لہجے میں پریشانی تھی۔

''ہاں بولو۔'' وقار نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔''کیا پریشانی ہے؟''

''کیا ڈاکٹر نوشاد کے گھر کا ایڈریس مل سکتا ہے؟'' عابر نے غیر متوقع بات کی۔

''خیریت،کوئی بیماری لاحق ہو گئی تجھے۔'' وقار نے مذاق کیا۔

''یار،میں ملکہ سے ملنا چاہتا ہوں۔'' وہ بڑی گمبھیرتا سے بولا۔

''تم ملے نہیں ابھی تک......تم تو کہہ رہے تھے کہ ملکہ نے تمہیں گھر آنے کی دعوت دی ہے۔'' وقار نے سوال کیا۔

''یار،ان لوگوں کا رویہ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔'' عابر بولا۔

''کیا کہہ رہے ہیں۔کچھ بتاؤ تو سہی؟'' وقار سنجیدہ ہوا۔

جواب میں عابر نے ہر بات تفصیل سے وقار کے گوش گزار کر دی۔وقار ساری بات سن کر بولا۔''مجھے یہ فیملی فراڈ لگ رہی ہے۔''

''ذرا ابو سے ان کے بارے میں پوچھو۔'' عابر بولا۔

''میں ان سے پوچھ چکا ہوں۔اب بار بار پوچھوں گا تو وہ مشکوک ہو جائیں گے۔پوچھیں گے مجھے ڈاکٹر نوشاد سے کیا کام ہے۔ابے کیا تو مجھے مروائے گا۔'' وقار نے ہنس کر کہا۔

''اچھا چل چھوڑ۔'' عابر مایوس ہو کر اٹھا۔وقار کہتا رہ گیا۔''بیٹھ تو سہی۔'' لیکن وہ رکا نہیں۔

مایوسی جب حد سے بڑھی تو ایک رات امید کی کرن چمکی۔وہ ملکہ کی یاد میں کھویا ہوا تھا اور موبائل اس کے ہاتھ میں دبا ہوا تھا۔وہ کئی بار مس کال دے چکا تھا۔لیکن شائستہ کی طرف سے جواب نہیں آ رہا تھا۔اچانک موبائل فون میں لرزش ہوئی۔اس نے فوراً روشن اسکرین کی طرف دیکھا۔شائستہ کا نام دیکھ کر اس کا دل کھل اٹھا۔

''ہیلو!'' اس نے بڑے شیریں لہجے میں کہا۔''خدا کا شکر ہے شائستہ۔آپ کا فون تو آیا۔میں تو مس کال دے دے کر تھک گیا۔''

جواب میں ادھر سے جو آواز سنائی دی،اسے سن کر عابر کی سٹی گم ہو گئی۔اس نے گھبرا کر گھڑی پر نظر ڈالی۔رات کے بارہ بج رہے تھے۔

''میں ڈاکٹر نوشاد بول رہا ہوں۔'' ڈرامائی انداز میں کہا گیا۔ڈاکٹر نوشاد کی آواز خاصی رعب دار تھی۔عابر نے فون پر پہلی بار سنی تھی،اس لئے خاصا پریشان کر گئی تھی۔

''انکل آپ کیسے ہیں؟'' عابر نے اپنا لہجہ مضبوط کرنے کی پوری کوشش کی۔

''بھئی میں تو بالکل ٹھیک ہوں۔میں کچھ دنوں کے لئے شہر سے باہر گیا ہوا تھا،آج ہی واپس آیا ہوں۔بس یوں سمجھو کہ ابھی آیا ہوں۔گھر آ کر سب سے پہلے میں نے تمہارے بارے میں پوچھا۔بھئی،میں بڑا شرمندہ ہوں۔ان لوگوں نے تمہیں ابھی تک کھانے پر نہیں بلایا۔اب تم ایسا کرو کہ کل رات کا کھانا میرے ساتھ کھاؤ۔میں تمہیں گھر کا ایڈریس سمجھائے دیتا ہوں،میسج بھی کر دوں گا۔'' ڈاکٹر نوشاد نے عابر کو بولنے کا موقع دیئے بغیر گھر کا ایڈریس سمجھایا اور آخر میں کہا۔''اچھا عابر صاحب،کل رات ملاقات ہو گی۔''

''جی......میں حاضر ہو جاؤں گا۔آپ کا بہت شکریہ۔'' عابر نے ممنون لہجے میں کہا۔

ادھر سے کوئی جواب نہ آیا۔لائن کب کی کٹ چکی تھی۔عابر نے موبائل کی آف ہوتی اسکرین کو دیکھا۔مسکرایا اور سوچا۔'یہ ڈاکٹر نوشاد آخر کیا چیز ہے؟'

شام کو جب خوشبو میں بسا عابر گھر سے نکلنے لگا تو نازنین کا ماتھا ٹھنکا۔آج تو اس کا انداز ہی نرالا تھا۔نہایت صاف ستھرے استری شدہ کپڑے،تازہ بنی ہوئی شیو۔شکل پر بارہ بجنے کے بجائے''پرائم ٹائم''۔یہ وہ عابر ہی نہ تھا۔اس سے قبل کہ نازنین اس سے کچھ پوچھتیں،وہ مسکراتا ہوا ان کے پاس آیا اور بولا۔''امی،میں ایک دوست کے گھر جا رہا ہوں،وہیں کھانا کھاؤں گا۔ہو سکتا ہے واپسی میں ایک بج جائے۔''

''جاؤ۔لیکن جلد آنے کی کوشش کرنا۔'' نازنین نے کہا۔

''جی۔اچھا۔'' عابر نہایت فرمانبرداری سے بولا اور گھر سے نکل گیا۔

☆......☆......☆

رات گہری اور اندھیری تھی۔دور گلی میں کہیں کتے بھونک رہے تھے۔کسی گھر کی دیوار پر بیٹھی بلیاں رو رہی تھیں۔مائی پنکھی اپنے اجاڑ گھر کے صحن میں ٹہل رہی تھی۔صحن میں مکمل تاریکی تھی۔لیکن مائی پنکھی بڑے اطمینان سے یہاں سے وہاں تک ٹہل رہی تھی جیسے صحن خوب روشن ہو۔

رات کا ایک بجا تھا۔مائی پنکھی کے ٹہلنے کے عمل سے ظاہر ہوتا تھا کہ اسے کسی کا انتظار ہے۔

''انجو۔'' مائی پنکھی نے کالے منہ کی سفید بلی کو آواز لگائی۔بلی صحن میں پڑی کھری چارپائی پر لیٹی سو رہی تھی۔مائی پنکھی کے آواز لگاتے ہی وہ اس طرح چونک کر اٹھی جیسے اس کی آواز کے انتظار میں ہو۔اس نے چارپائی پر کھڑے ہو کر ایک بھرپور انگڑائی لی اور کود کر مائی پنکھی کے پاس پہنچ کر اس کے قدموں سے لپٹ گئی۔

''او۔کرموں جلی......کیا مجھے گرائے گی؟'' مائی پنکھی نے سفید بلی کو ڈانٹا۔

جواب میں بلی اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگی۔مائی پنکھی بولی۔''انجو،تو اوپر چھت پر چلی جا اور اس وقت تک نیچے مت آنا جب تک میں تجھے آواز نہ دوں۔''

بلی نے فوراً اس کی ہدایت پر عمل کیا۔پہلے وہ چارپائی پر چڑھی،وہاں سے دیوار پر چھلانگ لگائی اور دوڑتی ہوئی دیوار سے نیچے چھت پر اتر گئی۔

بلی کے جاتے ہی کسی نے دروازہ بجایا۔''اچھا۔آتی ہوں۔''

مائی پنکھی نے دروازے پر پہنچ کر پیر سے پتھر کو سرکایا۔پتھر کے سرکتے ہی کواڑ کھول کر ایک شخص اندر آیا۔اس نے مائی پنکھی کا سوکھا ہاتھ پکڑ کر چوما،پھر آنکھوں سے لگایا اور بولا۔''رانی جی،مجھے دیر تو نہیں ہوئی؟''

''تو پہلا ہے۔'' مائی پنکھی نے کہا۔

''ابھی کوئی نہیں آیا۔میں پہلا ہوں،پھر تو میں وقت پر پہنچ گیا۔'' اس شخص نے اطمینان بھرے لہجے میں کہا۔

''ٹوپی ڈرامے تیرا نام کیا ہے؟'' مائی پنکھی نے خشک لہجے میں پوچھا۔

''میرا نام شتو حلوائی ہے،رانی جی۔آپ میرا نام بھی بھول گئیں۔'' شتو حلوائی نے پریشان ہو کر کہا۔

''تو لڈو بیچتا بیچتا،ادھر کہاں آ نکلا؟'' مائی پنکھی نے اس کے احتجاج پر کوئی توجہ نہ دی۔

''رانی جی۔مجھے بڑا شوق ہے یہ کام سیکھنے کا۔'' شتو حلوائی بولا۔

''اچھا چل جھاڑو لگا۔'' مائی پنکھی نے کہا۔

''ٹھیک ہے رانی جی جو حکم آپ کا۔پر جھاڑو کدھر ہے۔'' شتو حلوائی نے اندھیرے میں اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے کہا۔

''اندھے،اُدھر دیکھ کونے میں۔'' مائی پنکھی نے ڈانٹا تو اس کی آنکھیں کھل گئیں۔کونے میں کھڑی جھاڑو اسے صاف نظر آنے لگی۔تیزی سے آگے بڑھ کر اس نے جھاڑو اٹھائی اور جلدی جلدی صحن میں جھاڑو لگانے لگا۔مائی پنکھی چارپائی پر بیٹھ گئی۔

تاریک رات،صحن میں گھور اندھیرا اور اس میں دی جانی والی جھاڑو کی کھس کھس۔عجب فضا تھی اس وقت گھر کی۔

ابھی جھاڑو دی جا رہی تھی کہ ایک اور شخص گھر کے کھلے دروازے سے اندر داخل ہوا۔ایک نعرۂ مستانہ لگایا......''رانی جی کی جے۔''

''او......گھورو مل،چل چھڑکاؤ کر جلدی۔'' مائی پنکھی نے اسے دیکھتے ہی حکم صادر کر دیا۔

گھورو مل تیز تیز چلتا مائی پنکھی کے پاس پہنچا۔اس کے پاؤں چھوئے اور پھر نلکے کی طرف بڑھا۔اس نے پورا نلکا کھول کر بالٹی میں پانی بھرا۔اتنی دیر میں شتو حلوائی نے اپنی جھاڑو مکمل کر لی۔اس نے جھاڑو جہاں سے اٹھائی تھی،وہاں رکھی اور چارپائی کے ایک پائے کے ساتھ بیٹھ گیا۔گھورو مل نے ابھی ڈونگے سے صحن میں چھڑکاؤ شروع کیا تھا کہ صحن میں''چھن چھن'' کی آواز آئی۔

''رنگل آ گئی!'' مائی پنکھی نے دروازے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

رنگل پاؤں میں بندھے گھنگھرو چھنکاتی اندر آئی۔وہ کالے کپڑوں میں ملبوس تھی۔صحن میں اندھیرا ہونے کے باوجود وہ اطمینان سے چلتی ہوئی مائی پنکھی کے پاس پہنچی۔اس نے مائی پنکھی کے گھٹنوں کو ہاتھ لگایا اور خاموشی سے چارپائی کی پائنتی بیٹھ گئی۔

رنگل کے آتے ہی گھورو مل نے چھڑکاؤ روک دیا تھا۔اس کے چارپائی پر بیٹھتے ہی پھر سے اپنا کام شروع کر دیا۔

پورا صحن گیلا کرنے کے بعد گھورو مل،شتو حلوائی کے برابر اینٹوں کے فرش پر بیٹھ گیا۔اس نے زمین کے گیلے ہونے کی بھی پروا نہ کی۔

''رنگل۔'' مائی پنکھی مخاطب ہوئی تو رنگل نے اس کی طرف آنکھیں اٹھائیں،بولی کچھ نہیں۔

''جا۔رسوئی میں جا کر جل مسان دیکھ لے۔میں نے چڑھا تو دیا تھا۔'' مائی پنکھی نے ہدایت دی۔

رنگل ایک لفظ بولے بغیر باورچی خانے کی طرف بڑھ گئی۔چولہے پر مٹی کی ہنڈیا چڑھی تھی۔آگ روشن تھی،لکڑیوں سے نکلنے والے شعلے ہنڈیا کو اوپر تک اپنی لپیٹ میں لئے ہوئے تھے۔رنگل نے لکڑیاں باہر کھینچ کر آگ قابو میں کی۔کپڑے سے پکڑ کر ہنڈیا پر رکھے ڈھکن کو اٹھایا۔ڈھکن کو اٹھاتے ہی بدبو کا شدید بھبکا برآمد ہوا۔رنگل نے گہری سانس لے کر اسے خوشبو کی طرح اپنے اندر اتارا اور وہیں سے بولی۔''رانی جی......جل پک گیا۔''

''پھر آگ بجھا دے۔'' مائی پنکھی نے جواب دیا اور مڑ کر گھورو مل کو دیکھا اور اس سے مخاطب ہوئی۔''گھورو!وہ تیری لگی سگی نہیں آئی؟''

''رانی جی۔سریلی کی بات کر رہی ہیں۔'' گھورو مل نے بڑے اطمینان سے پوچھا۔

''ہاں۔'' مائی پنکھی نے جواب دیا۔

''وہ میری لگی سگی کب ہے۔بہتیرا کوشش کرتا ہوں،پر وہ گھاس ہی نہیں ڈالتی۔'' گھورو مل کے لہجے میں بڑی حسرت تھی۔''رانی جی،آپ کچھ کر دیں نا۔''

''گھورو۔وہ بہت ہائی پاور کی عورت ہے۔وہ تیرے بس کی نہیں۔'' مائی پنکھی نے ہنس کر کہا۔

اس سے قبل کہ گھورو کوئی جواب دیتا،سریلی اندر داخل ہو گئی۔سریلی کا اصل نام عذرا ڈیوڈ تھا۔اس کی آواز بہت اچھی تھی،اس لئے مائی پنکھی اسے سریلی کہتی تھی۔

''رانی جی۔گڈ نائٹ۔'' عذرا نے بلند آواز میں سلام کیا اور مائی پنکھی کے گھٹنوں کو ہاتھ لگا کر رنگل کے پاس بیٹھ گئی۔

''سریلی آج کچھ سنائے گی؟'' مائی پنکھی نے پوچھا۔

''رانی جی۔آپ جو کہیں گی،سنا دوں گی۔'' عذرا ڈیوڈ نے سعادت مندی سے جواب دیا۔

''اچھا۔ابھی ذرا حاضری پوری ہو جائے،پھر بتاتی ہوں کیا سنانا ہے۔'' مائی پنکھی نے کہا۔

مائی پنکھی نے اس پارٹی میں شریک ہونے والوں کے عجیب و غریب نام رکھے ہوئے تھے۔یہ مجلس ہر ماہ اماوس کی رات کو منعقد ہوتی تھی۔یہاں آنے والے زیادہ تر کالے جادو کے ماہر تھے۔یہ ہر ماہ یہاں آ کر اپنے اپنے تجربات بیان کرتے،مائی پنکھی سے رہنمائی حاصل کرتے۔ان میں کچھ لوگ نئے کھلاڑی بھی ہوتے تھے۔مائی پنکھی ان کی انگلی پکڑ کر سیاہ راستے پر چلنا سکھاتی۔

یہاں آنے والوں میں ایک جوڑا بھی شامل تھا۔نام تو ان کا ریحانہ اور شاہد تھا لیکن مائی پنکھی نے ان کا نام گلی ڈنڈا رکھا ہوا تھا۔ریحانہ لمبے قد کی تھی جبکہ شاہد چھوٹے قد کا تھا۔ان دونوں نے لوگوں کے مسائل کے حل کیلئے ایک آستانہ بنا رکھا تھا جہاں وہ بیٹھ کر مجبور انسانوں کو لوٹتے تھے۔

مائی پنکھی نیلی نامی خواجہ سرا کو''آئی اوئی'' کہتی تھی۔اس کے بارے میں مائی پنکھی کی رائے تھی کہ اگر وہ اسی طرح استقامت سے شیطانی عمل سیکھتا رہا تو بڑے بڑوں کو پیچھے چھوڑ جائے گا۔

اب لوگ تیزی سے آ رہے تھے۔گلی ڈنڈا،آئی اوئی،اندھیری رات،چھمک چھلو اور نہ جانے کون کون۔یہاں آنے والوں پر کوئی پابندی نہ تھی۔پرانے لوگوں کے ساتھ نئے لوگ بھی آ جاتے تھے۔

دیکھتے ہی دیکھتے مکروہ چہروں سے پورا صحن بھر گیا۔مائی پنکھی نے دروازہ بند کرنے کا حکم دیا۔گھورو مل اٹھا۔اس نے دروازہ بند کر کے پتھر لگا دیا اور اپنی جگہ پر آ کر بیٹھ گیا۔

مائی پنکھی کے اشارے پر رنگل اٹھی۔اس نے ڈونگے میں جل مسان بھرا اور عذرا ڈیوڈ کے ہاتھ میں دے دیا۔عذرا نے وہاں موجود ہر شخص کو ایک ایک گھونٹ پلانا شروع کیا۔اس بدبودار مشروب کو جو بھی پیتا،اس کے اندر کا شیطان جاگ کر اٹھ بیٹھتا۔

جل مسان کے بعد ایک ایک کر کے اپنے مسائل،اپنی مشکلات ان پختہ کار شیطانوں نے بیان کرنا شروع کیں۔مائی پنکھی نے ہر ایک کو اپنی ہدایات اور ماہرانہ مشوروں سے نوازا۔

ابھی یہ شیطانی سماروہ(مجلس)اختتام پذیر ہونے والا تھا کہ کسی نے بڑے زور سے دروازہ کھٹکھٹایا۔

مائی پنکھی نے چونک کر دروازے کی طرف دیکھا۔یہ عجب انداز کی دستک تھی۔گلی میں شور بھی سنائی دے رہا تھا۔بھاگ دوڑ سی مچی ہوئی تھی۔

مائی پنکھی ابھی اندازہ ہی لگا رہی تھی کہ باہر کون لوگ ہیں؟ اتنے میں آواز آئی۔''پولیس آئی ہے،دروازہ کھولو۔''

PDF BY Manzoor

”پولیس!“ مائی پنکھی نے حیرت سے دُہرایا۔ اس کے وہم وگمان میں بھی نہ تھا کہ پولیس اس کے دروازے پر بھی آسکتی ہے۔

”رانی جی۔ پولیس یہاں کیا کرنے آئی ہے؟“ رنگل اور عذرا ڈیوڑ اس کے قریب سمٹ آئیں۔

مائی پنکھی اس بات کا جواب دینے کے بجائے کسی کمانڈو کی طرح ایکشن میں آگئی۔ اس نے چھت پر موجود انجو کی طرف توجہ کی اور بغیر ہونٹ ہلائے حکم دیا۔ ”انجو......اسے روک۔“

انجو یہ حکم سنتے ہی فوراً کھڑی ہوگئی۔ اس نے چھت سے دیوار کی منڈیر پر چھلانگ لگائی اور وہاں سے زقندیں بھرتی دروازے کی دیوار پر آئی اور ان پولیس والوں پر چھلانگ لگادی جو دروازے پر کھڑے کواڑ کھولنے کی کوشش میں تھے۔

انجو نے چشم زدن میں ایک کے منہ پر پنجہ مارا، دوسرے کی گردن پر کھرونچا لگایا۔ دونوں پولیس والے گھبرا کر پیچھے ہٹے۔ اس ناگہانی آفت نے انہیں بولا کر رکھ دیا۔ وہ پیچھے کھڑے سپاہیوں پر گرے تو سب انسپکٹر دلدار بخش نے ان پر ٹارچ ڈالی اور غصے میں پوچھا۔ ”اوئے۔ کیا ہوا؟“

”صاحب جی۔ کسی چیز نے پنجہ مارا ہے۔“ ایک سپاہی نے کہا۔

سب انسپکٹر دلدار بخش نے جب ٹارچ کی روشنی میں دونوں کے چہروں کا معائنہ کیا تو دونوں کو زخمی پایا۔ ایک کی گردن سے کان تک خون چھلک رہا تھا تو دوسرے کے گال پر خون کی لکیریں موجود تھیں۔ انجو اپنا کام کرکے جاچکی تھی۔

”اوئے......توڑو دروازہ۔“ دلدار بخش نے حکم دیا۔

مائی پنکھی کو بس اتنی ہی مہلت درکار تھی۔ جب اس نے دروازے کو بری طرح ہلتے ہوئے دیکھا تو وہ دروازے کی طرف بڑھی۔ اس سے قبل کہ وہ خود دروازہ کھولتی، پتھر سرک چکا تھا۔ ایک کواڑ کھلتے ہی پولیس والے سیلاب کے ریلے کی طرح اندر آگئے۔

دروازے کے سامنے مائی پنکھی کسی مجسمے کی طرح ایستادہ تھی۔ گھپ اندھیرے میں مائی پنکھی کے چہرے پر روشنی پڑی تو چند لمحوں کیلئے دلدار کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اس کے سامنے کون کھڑا ہے۔ کالے لباس میں مائی پنکھی اندھیرے کا حصہ تھی۔ پھر اس کی آنکھوں میں ایسی چمک تھی جو سامنے والے کو خوف میں مبتلا کردیتی تھی۔

”اوئے، رب نواز......دیکھ کوئی جانے نہ پائے۔“ دلدار نے چلاّ کر کہا۔

”سرجی۔ آپ فکر نہ کریں۔“ رب نواز اپنے چہرے پر ہوتی جلن کی پروانہ کرتے ہوئے آگے بڑھا اور دلدار بخش، مائی پنکھی کا جائزہ لینے لگا۔

یہ مکان ہی کتنا بڑا تھا۔ دو چار منٹ کے بعد رب نواز پورے مکان کی تلاشی لے کر آگیا اور بولا۔ ”سرجی، گھر میں تو چڑیا کا بچہ بھی نہیں ہے۔“

”یہ کیسے ہوسکتا ہے؟“ دلدار بخش نے مائی پنکھی کے چہرے پر ٹارچ ڈالتے ہوئے کہا۔ ”او، کالی مائی کدھر گئے جواری۔ ہمیں پتا چلا ہے کہ تو جوئے کا اڈا چلاتی ہے۔“

”او۔ کاکا......تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں اس گھر میں اکیلی رہتی ہوں۔ تو ذرا میری عمر دیکھ اور اپنا الزام دیکھ۔“ مائی پنکھی نے بڑی بردباری سے کہا۔

”اچھا۔“ دلدار بخش نے ایک مرتبہ پھر اس کا اوپر سے نیچے تک جائزہ لیا۔ اس نے بڑے بڑے مجرم دیکھے تھے لیکن مائی پنکھی اس کے گلے سے نہیں اتر رہی تھی۔ وہ رب نواز سے مخاطب ہوا۔ ”تو ذرا اس کالی مائی کا دھیان رکھ، میں خود گھر کا جائزہ لیتا ہوں۔“

دلدار بخش نے گھر کا چپہ چپہ دیکھ ڈالا لیکن گھر میں بندہ بشر تو دور کی بات ہے، کوئی مشکوک چیز بھی نہ ملی۔

”رب نواز۔ تمہاری رپورٹ کچی نکلی۔“ دلدار بخش نے مائی پنکھی کے سامنے کھڑے اپنے ماتحت رب نواز سے مخاطب ہوکر کہا۔

”سرجی۔ میری رپورٹ پکی تھی۔“ رب نواز نے پورے اعتماد سے کہا۔ ”یہاں مشکوک لوگوں کا آنا جانا ہے۔“

”چلو پھر اٹھاؤ اس مائی کو......تھانے لے چلو۔“ دلدار بخش حکم دیتا ہوا باہر نکل گیا۔

”چل مائی میرے ساتھ۔“ رب نواز بولا۔

”میرا قصور کیا ہے؟“ مائی پنکھی نے پوچھا۔

”اپنا قصور تو خود ہی بتائے گی۔ پتا نہیں تجھے بڑھاپے میں کیا سوجھی ہے۔“ رب نواز نے اس کی کلائی پکڑی اور کھینچتا ہوا باہر لے چلا۔

”کاکا۔ میرا ہاتھ چھوڑ دے۔“ مائی پنکھی نے کہا۔ ”دیکھ میری بات سن۔“

”مائی۔ اب تیری بات تھانے چل کر سنوں گا۔“ رب نواز اس کی کلائی پکڑے دروازے تک لے آیا۔

”ایک منٹ میری بات سن لے۔“ مائی پنکھی نے اپنی کلائی چھڑانے کی کوشش کی۔

”چل بول۔ کچھ پیسے ویسے کی پیشکش کرنا چاہتی ہے تو؟“ رب نواز ہنس کر بولا۔

”نہیں۔ میں تجھے ایک ایسی بات بتانا چاہتی ہوں جسے سن کر تیری سٹی گم ہوجائے گی۔ تیری رپورٹ تو کچی نکلی۔ اب تو مجھ سے اپنے بارے میں پکی رپورٹ سُن۔“ مائی پنکھی نے یہ بات کچھ اس انداز میں کہی کہ دلدار بخش گاڑی میں بیٹھتا بیٹھتا رک گیا۔ واپس پلٹ آیا۔

”ہیں۔ مائی۔ تو تو پولیس والوں کی بھی باپ نکلی۔ رب نواز ذرا اس کی رپورٹ تو سن، اگر پکی نکلے تو اسے اپنی مخبر بنالینا۔“ دلدار بخش تفریحی موڈ میں آگیا۔

”ٹھیک ہے سرجی۔“ رب نواز نے کہا۔ پھر مائی پنکھی سے مخاطب ہوا۔ ”چل مائی۔ اپنی رپورٹ پیش کر۔“

”پہلے میرا ہاتھ چھوڑ۔“ مائی پنکھی نے کہا۔

”یہ لے۔“ رب نواز نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ ”بھاگنے کی کوشش مت کرنا۔“

”میں بڑھیا کہاں بھاگوں گی۔ یہ میرے بھاگنے کی عمر ہے کیا؟“ مائی پنکھی بولی۔

”اچھا مائی۔ ہمارا وقت ضائع نہ کر، جو بولنا ہے جلد بول۔“ دلدار بخش نے مداخلت کی۔

”تمہاری دو بیویاں ہیں؟“ مائی پنکھی نے رب نواز سے پوچھا۔

”ہاں......ہیں تو اس بارے میں ساری دنیا جانتی ہے۔“ رب نواز نے اپنی مونچھوں پر تاؤ دیتے ہوئے کہا۔

”کاکا۔ کیا تو اپنی چھوٹی بیوی کے بارے میں کچھ جانتا ہے؟“

”ہاں۔ میں سب کچھ جانتا ہوں، میری بیوی ہے وہ۔“ رب نواز نے کسی قدر تلخی سے کہا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ آخر وہ کہنا کیا چاہ رہی ہے۔

”تیری چھوٹی بیوی کے بارے میں، میں جو کچھ جانتی ہوں، کیا وہ ان سب کے سامنے بتادوں یا اکیلے میں سنے گا؟“ مائی پنکھی نے سوال کیا۔

”تا ایسی کیا بات ہے۔ تو سب کے سامنے بول۔“ رب نواز نے متفکر لہجے میں جواب دیا۔

”کاکا، پھر سن......تیری بیوی کا نام تبسم ہے، تو نے اسے دھرم پورے میں رکھا ہوا ہے۔ شادی کو ایک سال ہوا ہے۔ وہ تنہا رہتی ہے۔ شادی کی ہے تو اس کے ساتھ رہ۔ تنہائی اس کے لئے زہر ہے۔ اس کے اندر آگ بھری ہے۔ بعض عورتیں صرف شریر ہوتی ہیں، جسم ہوتی ہیں، ہروقت شعلوں میں گھری رہتی ہیں کاکا۔ ایک پورا فائر بریگیڈ بھی ان کی آگ نہیں بجھا سکتا۔ جا، جا کر دیکھ کہ وہ اس وقت کیا کررہی ہے۔ اب کیا پڑوس میں رہنے والے اس لڑکے کا نام بھی بتانا پڑے گا۔ چل بتائے دیتی ہوں۔ فیاض ہے اس کا نام۔“ مائی پنکھی اتنا کہہ کر خاموش ہوگئی۔

اس کے اس انکشاف نے اے ایس آئی رب نواز کے تن بدن میں آگ لگادی۔ اتنے لوگوں کے سامنے اس کی سخت توہین ہوئی تھی۔ وہ بھنا کے بولا۔ ”سرجی۔ آپ اس بڑھیا کو لے کر تھانے چلیں۔ میں ذرا گھر کا چکر لگا کر آتا ہوں۔ اگر اس کی رپورٹ کچی نکلی تو پھر میں تھانے آکر اس کا گلا دباؤں گا۔“

”اوئے۔ رب نواز، تم کس کے چکر میں آرہے ہو۔ یہ بڑھیا مجھے ایک نمبر کی چلتر لگتی ہے۔“ دلدار بخش نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

لیکن وہ سمجھا نہیں۔ سمجھ بھی نہیں سکتا تھا۔ مائی پنکھی نے جو باتیں کی تھیں، وہ سوفیصد صحیح تھیں۔ بس اب اس کی آخری بات کی تصدیق باقی تھی لہٰذا وہ رکا نہیں۔ اس نے موٹر سائیکل دبائی اور ”تفتیش“ پر نکل گیا۔

”چل مائی۔“ دلدار بخش نے رب نواز کے جانے کے بعد کہا۔ ”تو نے خود کو مشکل میں ڈال لیا ہے۔“

مائی پنکھی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ خاموشی سے اس کے ساتھ چل دی۔

دلدار بخش کو اس بڑھیا نے مخمصے میں ڈال دیا تھا۔ رب نواز کی رپورٹ کے مطابق مائی پنکھی کے گھر میں بیس پچیس آدمی موجود ہونے چاہئے تھے لیکن یہاں سے چڑیا کا بچہ بھی برآمد نہیں ہوا تھا۔ اگر وہ اس گھر میں موجود تھے تو وہ کہاں غائب ہوگئے یا پھر رپورٹ غلط تھی لیکن رب نواز اپنی رپورٹ پر مصر تھا کہ پکی ہے۔

تھانے پہنچ کر دلدار بخش نے اسے دو سپاہیوں کی تحویل میں دیا کہ اسے کمرے میں بٹھائیں اور نگرانی رکھیں۔ پھر وہ اپنے کام نمٹا کر اس کمرے میں آیا جہاں مائی پنکھی بیٹھی تھی۔

کمرے کی روشنی میں دلدار نے مائی پنکھی کو اوپر سے نیچے تک بغور دیکھا۔ مائی پنکھی کے چہرے پر اسے کوئی گھبراہٹ یا پریشانی نظر نہیں آئی۔ وہ اس سے کوئی سوال کرنے والا تھا کہ مائی پنکھی نے پہل کردی۔ وہ بولی۔ ”کاکا......تو مجھے یہاں کیوں لایا ہے؟“

”ہمیں تیرے خلاف رپورٹ ملی تھی۔ میں تجھے بتا چکا ہوں، تیرے گھر میں مشکوک لوگوں کا آنا جانا ہے، اس وقت بھی آدمیوں کی موجودگی کی مخبری ہوئی تھی۔ کیا وہ لوگ ہمارے آنے سے پہلے جا چکے تھے۔ کیا تجھے پولیس کی آمد کی اطلاع ہوگئی تھی؟“ دلدار بخش نے سوال کیا۔

”کاکا۔ تیرے لوگوں نے خود تو نے میرا پورا گھر چھان مارا۔ میرے گھر میں کوئی ہوتا تو ملتا نا۔“ مائی پنکھی نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جواب دیا۔

”مائی! تو اس طرح نہیں اُگلے گی۔ رب نواز آجائے ذرا۔ پھر تجھے سیدھا کرتا ہوں۔“ دلدار غصے سے بولا۔

”ہاں کرلے انتظار، میں بیٹھی ہوں۔ جب وہ آئے گا تو، تُو مجھے چھوڑنے اور اسے ہتھکڑی ڈالنے پر مجبور ہوجائے گا۔“ مائی پنکھی نے پورے یقین سے کہا۔

دلدار نے اسے سخت نظروں سے دیکھا۔ ”زیادہ بکواس نہ کر، مجھے تو کوئی پاگل عورت معلوم ہوتی ہے۔ رب نواز نے خواہ مخواہ میرا وقت ضائع کیا۔“ یہ کہہ کر وہ کھڑا ہوگیا۔ پھر اس نے سپاہیوں کو حکم دیا کہ بڑھیا کو لاک اَپ میں ڈال دو اور خود اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ اسے شدت سے رب نواز کا انتظار تھا۔

چار بجے کے قریب رب نواز تھانے کی حدود میں داخل ہوا۔ اس نے موٹر سائیکل دیوار کے ساتھ کھڑی کی اور پھر مرے قدموں سے چلتا دلدار بخش کے کمرے میں داخل ہوا۔

”ہاں رب نواز۔ کیا ہوا؟“ دلدار نے بے قرار ہوکر پوچھا۔

”بہت کچھ ہوگیا سرجی۔“ رب نواز نے انتہائی دکھ سے کہا۔

”کیا مطلب، تیری طبیعت تو ٹھیک ہے؟“

رب نواز نے کندھے سے ریوالور اتارا، کمر سے اپنی پیٹی نکالی۔ پیٹی اور ریوالور اس نے دلدار بخش کی میز پر رکھا اور بولا۔ ”کھیل ختم ہوگیا۔ وہ مائی بالکل سچی نکلی۔ بڑی پکی رپورٹ دی اس نے۔“

”ہوا کیا......کچھ بول تو۔“ دلدار بخش پریشان ہوکر بولا۔

”سرجی۔ میں دونوں کو مار آیا ہوں۔“ رب نواز نے شدت غم سے کہا۔ ”آپ مجھے گرفتار کرلیں۔ ہتھکڑی ڈال دیں میرے ہاتھوں میں۔ میں نے ایک نہیں دو خون کئے ہیں۔ سرجی میری بیوی بے وفا نکلی۔ میں جب گھر میں کودا تو وہ دونوں بے خبر سو رہے تھے۔ میں نے سوتے میں ہی دونوں کو گولی ماردی۔“

”یہ تو نے کیا کیا رب نواز۔ کیا تو جانتا نہیں کہ پھانسی چڑھ جائے گا؟“

PDF BY Manzoor

"جانتا ہوں سر جی، اچھی طرح جانتا ہوں۔ پر کیا کروں، انہیں دیکھتے ہی میرے دماغ میں آگ لگ گئی۔ میری بیوی پڑوس کے لڑکے فیاض کی گردن میں بانہیں ڈالے سو رہی تھی سر جی۔ وہ دونوں بے لباس تھے سر جی...... میں انہیں کیسے نا گولی مارتا۔" رب نواز غصے سے کانپ رہا تھا۔

"رب نواز! تو نے واردات کردی تھی تو پھر پلٹ کر یہاں نہیں آنا چاہیے تھا، اپنی پیٹی اور ریوالور اٹھا اور جا نکل جا۔" دلدار بخش نے مشورہ دیا۔

"آپ کا شکریہ سر جی۔" رب نواز احسان مندی سے بولا۔ "پر میں بھاگوں گا نہیں، چاہے مجھے پھانسی ہو یا عمر قید۔"

"اس بڑھیا کا کیا کروں، اس کی ایک ایک بات سچ نکلی، اس نے تو یہاں تک کہہ دیا تھا کہ میں تمہیں ہتھکڑیاں لگانے اور اسے چھوڑنے پر مجبور ہو جاؤں گا۔" دلدار بخش نے بتایا۔

"سر جی، اسے چھوڑ دیں، وہ تو کوئی بہت پہنچی ہوئی چیز معلوم ہوتی ہے۔"

"میری سمجھ میں ابھی تک یہ بات نہیں آئی کہ اس کے گھر میں موجود آدمی کہاں غائب ہو گئے یا پھر تمہارے مخبر کی اطلاع غلط تھی۔" دلدار بخش کی سوئی غائب ہونے والے آدمیوں پر اٹکی ہوئی تھی۔

"اطلاع تو ٹھیک تھی۔" رب نواز بولا۔

"تو پھر اس بڑھیا کو دو تین دن حوالات میں رکھتے ہیں اور دن کی روشنی میں گھر کا جائزہ لیتے ہیں۔ مجھے لگتا ہے اس کے گھر میں کوئی خفیہ راستہ ہے۔ ہمارے وہاں پہنچتے ہی اس نے خفیہ راستے سے انہیں باہر کر دیا۔" دلدار بخش نے کہا۔

"میری مانیں تو اسے چھوڑ دیں۔ ایک مرتبہ پھر اس کی نگرانی کرائیں۔ صحیح رپورٹ پر چھاپہ ماریں۔" رب نواز نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ "وہ بڑھیا مجھے خطرناک لگتی ہے۔ اس کے پاس ضرور کوئی کالا علم ہے۔ اس نے میرے بارے میں جو بتایا، سچ بتایا۔"

"نہیں رب نواز، میں اسے نہیں چھوڑوں گا۔ میں دیکھتا ہوں اس جادوگرنی کو۔" دلدار بخش نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

لیکن دلدار بخش اپنے فیصلے پر قائم نہ رہ سکا۔ صبح ہونے تک تھانے میں ایسے ہنگامی حالات پیدا ہو گئے کہ کسی کی سمجھ میں نہ آیا کہ یہ آخر ہوا کیا ہے؟

مائی پنکھی حوالات میں بند تھی۔ اس وقت اس کے علاوہ کوئی اور اندر نہ تھا۔ مائی پنکھی فرش پر لیٹی ہوئی تھی۔ اس نے اپنا ایک ہاتھ آنکھوں پر رکھا ہوا تھا۔ باہر ایک سپاہی پہرے پر تھا۔

اجالا پھیلتے ہی کوؤں کے چیخنے کی آوازیں آنے لگیں۔ پھر دو تین کوّے کائیں کائیں کرتے راہداری میں آئے اور اُڑتے ہوئے کمرۂ حوالات میں داخل ہو گئے جہاں مائی پنکھی بند تھی۔

ابھی پانچ سات منٹ گزرے ہوں گے کہ پورا لاک اَپ کوؤں سے بھر گیا۔ مائی پنکھی آنکھوں پر ہاتھ رکھے آرام سے لیٹی تھی جبکہ کئی کوّے اس کے اوپر بھی موجود تھے۔

سپاہی پریشان ہو کر دلدار بخش کے کمرے میں پہنچا اور گھبرا کر بولا۔ "سر جی! حوالات میں بے شمار کوّے بھرے ہوئے ہیں اور وہ بڑھیا آرام سے لیٹی ہے...... پتا نہیں کہیں مر تو نہیں گئی؟"

دلدار بخش، سپاہی کے ساتھ باہر نکلا تو تھانے کی فضا ہی بدل چکی تھی۔ پورے تھانے میں کوّے بھرے ہوئے تھے اور ان کی کائیں کائیں کے علاوہ کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا۔

دلدار بخش سر پر ہاتھ رکھے خود کو بچاتا لاک اَپ تک آیا۔ مائی پنکھی بڑے آرام سے ابھی تک آنکھوں پر ہاتھ رکھے لیٹی تھی۔ کوّے اس کے پورے بدن پر کودتے پھر رہے تھے۔

"اوئے، یہ مر تو نہیں گئی؟" دلدار بخش نے مائی پنکھی پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔ "تالا کھول۔"

سپاہی نے حوالات کا تالا کھولا۔ دروازہ کھلتے ہی کوؤں نے چیخ چیخ کر پورے تھانے کو سر پر اٹھا لیا۔ وہ اِدھر سے اُدھر اُڑتے پھر رہے تھے۔ دلدار بخش ہاتھ میں موجود رول گھماتا ہوا اندر پہنچا اور چیخ کر بولا۔ "او مائی اٹھ۔"

مائی پنکھی نے اچانک اپنی آنکھوں سے ہاتھ اٹھایا اور اس طرح اٹھ کر بیٹھ گئی جیسے وہ اس کی آمد کی منتظر تھی۔ اس نے اپنی سرخ آنکھوں سے دلدار بخش کو دیکھا اور اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

"یہ کیا مصیبت ہے۔ یہ کوّے کہاں سے آ گئے؟" دلدار بخش چیخ کر بولا۔

"کاکا۔ مجھے کیا معلوم...... تو ان سے پوچھ لے۔" مائی پنکھی نے حوالات کے دروازے کی طرف قدم بڑھاتے ہوئے کہا۔ "کیا میں اب جاؤں؟"

"ہاں مائی۔ تو جا...... لیکن پہلے ان سے ہمیں نجات دلا۔" دلدار بخش نے کوؤں سے اپنا بچاؤ کرتے ہوئے کہا۔

"اچھا۔" مائی پنکھی نے راہداری میں کھڑے ہو کر اوپر کی طرف دیکھا اور بولی۔ "بس بگا، انہیں لے جا۔"

مائی پنکھی کے اتنا کہنے کے بعد مشکل سے دو تین منٹ لگے ہوں گے کہ تھانے کی فضا یکدم صاف ہو گئی۔ وہاں کوئی کوا رہا نہ کوئی کوّے کا بچہ۔

کوؤں کے فضا میں معدوم ہونے کے بعد دلدار بخش نے ایک گہرا سانس لیا۔ مائی پنکھی کو گہری نظر سے دیکھا اور بولا۔ "تو کوئی جادوگرنی ہے کیا؟"

"تو نے پھر الزام لگایا مجھ پر۔" مائی پنکھی نے اسے خشمگیں نگاہوں سے دیکھا۔ "چل مجھے گھر چھوڑ کر آ۔"

دلدار بخش اندر سے اتنا خوفزدہ ہو گیا کہ اب اس میں ہمت نہ تھی کہ اسے روک لیتا۔ وہ بہ نفس نفیس اسے اس کے گھر چھوڑ کر گیا اور ایسا پہلی بار ہوا تھا کہ پولیس نے کسی ملزم کو باعزت طریقے سے گھر پہنچایا ہو...... بدلتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے؟

مائی پنکھی پولیس وین سے اتری تو گلی کے لوگوں نے حیرت سے دیکھا لیکن کسی میں ہمت نہ تھی کہ وہ اس سے کوئی سوال کرتا۔ سب انسپکٹر دلدار بخش اس کے ساتھ گھر کے اندر آیا۔ پورے صحن میں نیم کی زرد پتیاں بکھری ہوئی تھیں۔ نیم کے درخت پر بیٹھے کوّے کائیں کائیں کر رہے تھے۔ کوؤں کی آواز سن کر دلدار بخش کی آنکھوں کے سامنے تھانے کا منظر گھوم گیا۔ اس نے گھبرا کر مائی پنکھی کی طرف دیکھا۔ وہ پورے اطمینان سے صحن میں پڑی چارپائی پر بیٹھ چکی تھی۔ اس کے چہرے پر کسی قسم کا کوئی تاثر نہ تھا۔ اسے اس بات کا احساس بھی نہ تھا کہ اس کے ساتھ دلدار بخش آیا ہے اور وہ پُرتجسس نظروں سے صحن کا جائزہ لے رہا ہے۔

پھر اس نے ایک نظر باورچی خانے میں جھانکا۔ باورچی خانے کے مقابل آخری سرے پر بنے غسل خانے اور بیت الخلا کو بھی اندر سے دیکھا۔ پھر وہ اندر چلا گیا۔ کمروں کا اچھی طرح جائزہ لیا۔ بالآخر وہ اسی نتیجے پر پہنچا کہ اس گھر میں باہر جانے کا راستہ ایک ہی ہے۔

ابھی تک اس کا ذہن اس گتھی کو سلجھانے میں منہمک تھا کہ چھاپے کے وقت اس گھر میں بیس سے پچیس مرد اور عورتیں موجود تھیں، وہ آخر کس راستے سے فرار ہوئے۔ یہ بات اس کے دماغ میں کسی کیل کی طرح گڑ گئی تھی۔

"کاکا۔ تو کچھ پریشان ہے؟" مائی پنکھی نے اس کے چہرے پر نظریں گاڑ کر کہا۔

"مائی۔ اگر تو یہ بات مجھے بتا دے کہ اس گھر میں موجود بندے بندیاں کس طرح باہر گئے تو میں تجھے بھول جاؤں گا۔" دلدار بخش نے مفاہمانہ انداز میں کہا۔

"بتا دوں گی کاکا، پریشان کیوں ہوتا ہے۔ تو مجھے بھول جانا چاہتا ہے لیکن میں نہیں چاہتی کہ تو مجھے بھولے، آتے جاتے رہنا۔" مائی پنکھی چارپائی سے اٹھی اور دروازے کی طرف بڑھی۔

دلدار بخش کو یہ بات سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ وہ کیا چاہتی ہے۔ وہ تیزی سے دروازے کی طرف بڑھا اور باہر نکلتے ہوئے بولا۔ "مائی، میں پھر آؤں گا۔"

مائی پنکھی نے کوئی جواب نہ دیا۔ اپنی چمکیلی آنکھوں سے اسے ایک نظر دیکھا اور دونوں کواڑ بند کر کے پتھر لگا دیا۔

دروازے سے پلٹتے ہی یکدم اسے بھوک کا احساس ہوا۔ وہ مٹی کی ہنڈیا اٹھا کر باہر لائی، نلکے کے نیچے رکھ کر اس نے محض پانی سے کھنگالا۔ پھر اس میں پانی بھرا، باورچی خانے میں پہنچ کر چولہے پر رکھا، کچھ ڈبوں سے اس نے تھوڑی تھوڑی کئی چیزیں نکال کر ہنڈیا میں ڈالیں اور چولہا جلا دیا اور پیڑھی پر بیٹھ گئی۔

"انجو......" اس نے پیڑھی پر بیٹھے بیٹھے آواز لگائی۔ وہ چاہتی تھی کہ انجو جلد کوا پکڑ کر لائے۔ اس کی بھوک آخری حدوں کو چھو رہی تھی۔

کچھ لمحے انتظار کرنے کے بعد اس نے پھر آواز لگائی...... "انجو۔"

لیکن انجو نہیں آئی۔ ایسا کبھی نہیں ہوا تھا کہ مائی پنکھی نے اسے آواز دی ہو اور وہ فوراً اس کے سامنے نہ آئی ہو۔

مائی پنکھی گھبرا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ باورچی خانے سے باہر آئی اور اس نے چھت کی طرف دیکھتے ہوئے زور سے آواز دی۔ "انجو۔"

انجو گھر میں ہوتی تو آتی۔

☆......☆......☆

گلشن 13۔ ڈی کے جس مکان کا ڈاکٹر نوشاد نے پتا بتایا تھا، اس تک پہنچنا کوئی مشکل نہ تھا۔ عابر نے بہ آسانی مطلوبہ مکان کو ڈھونڈ نکالا۔ دروازے پر ڈاکٹر نوشاد کی نیم پلیٹ نصب تھی۔ نام کے ساتھ ہومیوپیتھی کی ڈگری درج تھی۔

یہ گھر جس میں اب ڈاکٹر نوشاد قیام پذیر تھا، چند سال قبل یہ کسی بیوہ عورت کی ملکیت تھا۔ وہ بیوہ عورت، ڈاکٹر نوشاد کی دور کی عزیزہ تھی۔ ڈاکٹر نے اپنی چکنی چپڑی باتوں سے اسے رام کیا اور بحیثیت کرائے دار اس مکان میں رہائش پذیر ہوا۔

ایک سال کے عرصے میں وہ بیوہ چل بسی۔ اس کا کوئی والی وارث نہ تھا۔ ڈاکٹر نوشاد پہلے ہی مکان پر قابض تھا۔ اس کے مرتے ہی جعلسازی سے یہ مکان اپنے نام کرا لیا۔ اس طرح لاکھوں کا مکان ایک کوڑی دیے بنا اس کا ہو گیا۔

ڈاکٹر نوشاد جعلسازی کا ماہر تھا۔ ہومیوپیتھی کی ڈگری بھی اس کے پاس جعلی تھی۔ اس نے ایک ادارے سے خط و کتابت پر مبنی ہومیوپیتھی کا کورس کر رکھا تھا۔ گھر پر ہی اس نے ایک کونے میں ہومیوپیتھی کی دوائیں رکھ چھوڑی تھیں۔ اس گھر میں کوئی مریض آتا تھا نہ ڈاکٹر کسی کو کوئی دوا دیتا تھا۔

اس کی آمدنی کا ذریعہ کیا تھا، یہ بات کسی کو معلوم نہ تھی۔ ڈاکٹر نوشاد خود بھی اپنے بارے میں یہ بات یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ اس کا ذریعہ معاش فلاں چیز ہے۔ وہ وسیع تعلقات رکھتا تھا، چرب زبان اور خوشامدی تھا۔ سامنے والے کی ضرورت سمجھ کر اس کی ضرورت پوری کرنا اس کی زندگی کا مقصد تھا۔ اس "حاجت روائی" کے عوض اپنا اُلو سیدھا کرنا اس شخص کو خوب آتا تھا۔ کس کو کس طرح کیش کیا جا سکتا ہے، اس آرٹ سے وہ اچھی طرف واقف تھا۔

اب اس نے عابر پر جال ڈالا تھا۔ گھنٹی کی آواز سنتے ہی وہ بذاتِ خود گیٹ پر آیا۔ گیٹ کھولا تو سامنے عابر کھڑا نظر آیا۔ وہ بڑے تپاک سے اس سے ملا، گلے سے لگایا اور اس کے بروقت پہنچنے کی تعریف کی اور اس کا ہاتھ پکڑ کر بڑی اپنائیت سے گھر کے اندر لایا۔

"ارے بھئی چاندنی، دیکھو عابر آئے ہیں۔" ڈاکٹر نوشاد نے دور ہی سے آواز لگائی۔

چاندنی کہیں سے نکل کر فوراً سامنے آئی۔ عابر نے اسے دیکھ کر سلام کیا اور اس کے آگے سر جھکا دیا۔ چاندنی نے اس کے سر پر ہاتھ رکھنے کے بجائے کندھے پر ہاتھ رکھا اور مسکرا کر بولی۔ "عابر ماشاء اللہ بڑے پیارے لگ رہے ہو۔"

"شکریہ آنٹی۔" عابر اپنی پذیرائی پر خوش ہوا۔

"ارے...... لڑکیو، چلو باہر آؤ، دیکھو کون آیا ہے۔"

"کون آیا ہے امی؟" سب سے پہلے دوڑتی ہوئی شائستہ آئی۔ "اوہ!...... عابر بھائی آئے ہیں۔"

شائستہ کے بعد ایک ایک کر کے سب لڑکیاں باہر آ گئیں۔ نہیں آئی تو ملکہ جسے دیکھنے کیلئے وہ تڑپ رہا تھا اور جس سے ملنے کی آرزو اسے یہاں تک کھینچ لائی تھی۔

"ارے بھئی، کیا عابر میاں کو باہر ہی کھڑا رکھو گے، انہیں ڈرائنگ روم میں بٹھاؤ۔" ڈاکٹر نوشاد بولا۔

"نہیں ابو...... ہم لاؤنج میں بیٹھیں گے، ڈرائنگ روم میں تو غیروں کو بٹھایا جاتا ہے۔" شائستہ نے بڑی اپنائیت سے کہا۔

"اچھا بیٹی، جیسی تمہاری مرضی۔" ڈاکٹر نوشاد اندر جاتے ہوئے بولا۔

باپ کے وہاں سے ہٹتے ہی شائستہ اینڈ کمپنی نے عابر کو اپنے حصار میں لے لیا اور اسے لے کر لاؤنج کی طرف بڑھیں۔

جب یہ لڑکیاں اسے لئے لاؤنج میں داخل ہوئیں تو سامنے نظر پڑتے ہی عابر کا دل شدت سے دھڑکنے لگا۔ وہ قیامت اس کے سامنے کھڑی تھی۔ کھلے بال، میک اَپ سے عاری چہرہ، سادہ سے کپڑے...... یوں لگتا جیسے کچھ دیر قبل نہا کر نکلی ہو۔ وہ سادہ کپڑوں میں بغیر میک اَپ کے بھی جگمگا رہی تھی جبکہ دیگر بہنیں خصوصاً شائستہ اور فاخرہ خوب بنی ٹھنی اور جدید تراش خراش کا لباس زیبِ تن کئے ہوئے تھیں۔ اس کے باوجود ان کے حسن کے چاند بجھے ہوئے تھے۔

عابر کھڑی ہوئی قیامت کی طرف تیزی سے بڑھا۔ ملکہ پر اس کی نگاہیں جمی تھیں۔ اس وقت اس کے سوا اسے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ اس کے قریب پہنچ کر ٹھہر گیا۔ بات کرنے سے زیادہ اسے نظروں میں بھرنے سے دلچسپی تھی۔ لیکن اتنے ڈھیر سارے لوگوں میں اس پر نظریں جمانا آسان نہ تھا لہٰذا وہ رسماً بولا۔ "کیسی ہیں ملکہ؟"

"جی...... میں ٹھیک ہوں۔" ملکہ نے دھیرے سے کہا۔

"لو جی آپی۔" فاخرہ، شائستہ سے مخاطب ہو کر بولی۔ "عابر کو ابھی تک یہی نہیں معلوم ہوا کہ ملکہ کیسی ہے۔ ارے جناب، سب جانتے ہیں کہ ہم بہنوں میں وہ سب سے اچھی ہے۔"

"فاخرہ۔" شائستہ نے اس کے چٹکی لینے پر ترچھی نظروں سے دیکھا۔

"او کے، آپی۔" فاخرہ نے سر جھکاتے ہوئے کہا۔

"عابر بیٹا، بہت اچھا لگا کہ تم ہمارے گھر آئے۔" چاندنی نے مسکراتے ہوئے اسے صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

"آنٹی، مجھے خود یہاں آ کر بے انتہا خوشی ہوئی۔" عابر نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"اور مجھے بڑا رنج ہے کہ ان لوگوں نے آپ کو بلانے میں اتنی دیر کیوں کی۔" ڈاکٹر نوشاد نے لاؤنج میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔

"کوئی بات نہیں انکل۔" عابر، ملکہ کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

"شائستہ، بھائی کو گھر دکھاؤ۔" چاندنی کا لہجہ معنی خیز تھا جسے شائستہ نے تو سمجھا لیکن عابر کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔

"آیئے عابر بھائی۔" شائستہ نے عابر کو اشارہ کیا۔ "ہم آپ کو اپنا غریب خانہ دکھائیں۔ ملکہ آؤ۔"

عابر کے لئے آخری بات بہت اہم تھی۔ وہ فوراً کھڑا ہو گیا۔ عابر کا خیال تھا کہ بقیہ بہنیں بھی ساتھ نکلیں گی لیکن ایسا نہ ہوا۔ شائستہ اور ملکہ کے سوا کوئی نہ اٹھا۔

شائستہ نے سب سے پہلے اپنا کمرا دکھایا۔ اس کمرے میں ملکہ بھی اس کے ساتھ رہتی تھی۔ یہ درمیانے سائز کا اچھا سجا سجایا کمرا تھا۔

"عابر بھائی...... یہ ہے ہمارا نشیمن۔" شائستہ نے ہنستے ہوئے کہا۔

"زبردست۔" عابر پُرجوش انداز میں بولا۔

"بیٹھیں۔" ملکہ نے بیڈ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"بیٹھیں گے۔ پہلے انہیں پورا گھر دکھا دیں ورنہ امی چیخیں گی۔" شائستہ نے کہا۔

اس سے قبل کہ ملکہ کوئی جواب دیتی۔ شائستہ بولی۔ "عابر بھائی بس کچھ نہ پوچھیں، یہ موبائل کی دشمن ہے، ابھی تک چار پانچ موبائل گم کر چکی ہے یا توڑ چکی ہے۔ ابو نے دبئی سے ایک سے ایک اعلیٰ موبائل اس کو لا کر دیا ہے۔"

"کوئی نہیں آپی۔" ملکہ نے احتجاج تو کیا لیکن اس میں زور نہیں تھا۔

شائستہ ابھی جواب دینے کی تیاری میں تھی کہ فاخرہ اندر داخل ہوئی اور بولی۔ "آپی! امی بلا رہی ہیں۔"

"اچھا۔" شائستہ تیر کی طرح کمرے سے نکل گئی۔ عابر کا خیال تھا کہ شائستہ کی جگہ فاخرہ لے لے گی لیکن ایسا نہ ہوا۔ فاخرہ بھی اس کے ساتھ چلی گئی۔

یہ ایک زبردست موقع تھا۔ ملکہ کمرے میں تنہا رہ گئی تھی۔ پتا نہیں یہ موقع قصداً "عطا" کیا گیا تھا یا پھر ایسا غلطی سے ہوا تھا۔ جو بھی تھا، اس عطا سے فائدہ اٹھایا جا سکتا تھا۔

"ملکہ! تم سے بات کرنی مشکل ہو گئی ہے، تمہارے پاس موبائل ہونا چاہیے۔"

"اچھا۔ میں لے لوں گی۔" ملکہ نے لاپروائی سے کہا۔

"ملکہ، میں تمہیں دیکھے اور تم سے بات کیے بنا نہیں رہ سکتا۔" عابر بے تابانہ لہجے میں بولا۔ "مجھے تمہارے بارے میں کیا جاننا چاہیے جو میں نہیں جان سکا۔ مجھے بتاؤ، اس دن بات پوری نہ ہو سکی

PDF BY Manzoor

تھی۔"

"بات تو اب بھی پوری نہ ہو سکے گی، بس کوئی آیا ہی چاہتا ہے۔" ملکہ نے دروازے کی طرف دیکھا۔

"پھر ہم کہاں ملیں اور کیسے ملیں؟" عابر بولا۔

"کالج کے گیٹ پر۔" ملکہ نے راستہ دکھایا۔

عابر یہ سن کر یکدم خوش ہو گیا۔ اس نے فوراً کالج کا نام اور وقت پوچھ لیا۔ اس سے قبل کہ دونوں میں مزید کوئی بات ہوتی، شائستہ اور فاخرہ دونوں باتیں کرتی ہوئی اندر آ گئیں۔

"ارے ملکہ۔ تم یہیں بیٹھی ہو، ہم سمجھ رہے تھے کہ تم نے پورا گھر دکھا دیا ہو گا۔"

"نہیں..... آپی، میں آپ کا انتظار کر رہی تھی۔"

"گڈ گرل۔" فاخرہ نے خوشی کا اظہار کیا۔

پھر تینوں نے اسے اپنا گھر دکھایا۔ عابر کو اب اس گھر سے دلچسپی نہ رہی تھی۔ وہ یہاں ملکہ کے لئے آیا تھا، اسے دیکھ لیا تھا اور آئندہ ملاقات کی راہ بھی صاف ہو گئی تھی۔ بہرحال یہاں آیا تھا تو رسم تو نبھانا تھی۔ وہ ان کے ساتھ ہنسی خوشی محوِ خرام رہا۔ خوب سیر ہو کر کھانا کھایا، مزے کی کافی پی اور اپنے گھر کی راہ لی۔

وہ دیر سے گھر پہنچا۔ گھنٹی بجانے پر جس نے دروازہ کھولا، اسے دیکھ کر وہ یکدم سہم گیا۔

"یہ تمہارے گھر آنے کا وقت ہے؟" علی نثار نے لہجہ سخت کئے بنا کہا۔

"جی..... ابو..... دیر ہو گئی، ویسے میں امی کو بتا کر گیا تھا۔" عابر نے نازنین کی طرف مدد طلب نظروں سے دیکھا جو علی نثار کے پیچھے کھڑی تھیں۔

"تم اس وقت کہاں سے آ رہے ہو؟" علی نثار نے پوچھا۔

"ابو، ایک دوست کے ہاں سے آ رہا ہوں، اس نے کھانے پر بلایا تھا۔"

"مجھے ذرا اس کا نمبر دینا، اس وقت رات کے دو بجے ہیں، یہ کھانے کا کون سا وقت ہے۔" علی نثار کے لہجے میں اب غصہ در آیا۔

"اچھا..... بات کر لیجیے گا۔" نازنین نے معاملہ سنجیدہ ہوتے دیکھ کر مداخلت کی۔ "اب یہ آپ کا زمانہ تو ہے نہیں کہ اپنے وقت پر ڈنر ختم ہو جائے، یہ نئی پود ہے، اسے وقت کی قدر ہے نا ادراک۔ عابر تم آئندہ اتنی دیر تک گھر سے باہر نہیں رہو گے۔ سن لیا تم نے۔ اپنے تمام منحوس دوستوں کو بتا دینا۔"

"جی امی۔" عابر نے انتہائی فرمانبرداری سے کہا۔

اور اس طرح نازنین نے اپنے تدبر سے عابر کے سر پر گھومتی شامت کو ٹال دیا۔

لیکن یہ مسئلہ زیادہ دن ٹلنے والا نہ تھا۔ علی نثار سنجیدہ ہو چکے تھے۔ وہ عابر کو مزید وقت دینا نہیں چاہتے تھے۔ انہیں عابر کے لیل و نہار کا بالکل پتا نہ تھا، بس وہ اتنا ہی سمجھ رہے تھے کہ وہ لاابالی طبیعت، ایک سست الوجود لڑکا ہے، جب تک اس کے گرد گھیرا تنگ نہیں کیا جائے گا، اس کے سدھرنے کا امکان نہیں۔ یہی وجہ تھی کہ انہوں نے براہِ راست باز پرس شروع کر دی تھی۔

ایک دن عابر نے ملکہ کے بتائے ہوئے وقت پر کالج کا چکر لگایا۔ یہ چھٹی کا وقت تھا، لڑکیاں تیزی سے کالج کے گیٹ سے باہر آ رہی تھیں۔ عابر وہاں کافی دیر تک کھڑا رہا لیکن ملکہ اسے نظر نہیں آئی۔ شاید وہ آج کالج آئی ہی نہیں تھی۔

اس نے وہیں کھڑے کھڑے شائستہ کو فون کیا۔ اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد ملکہ کا ذکر چھیڑا۔ شائستہ نے بتایا کہ آج وہ کالج نہیں گئی، اس کی طبیعت خراب ہے۔

"کیا ہوا؟" عابر نے فکرمندی سے پوچھا۔

"ارے، ایسی کوئی خاص بات نہیں، نزلہ وغیرہ ہے، نزلے میں تھوڑا بہت بخار تو ہو ہی جاتا ہے۔" شائستہ نے بے نیازی سے جواب دیا۔ پھر اچانک جیسے اسے کچھ یاد آیا۔ وہ بولی۔ "ہاں! وہ ابو آپ کے بارے میں پوچھ رہے تھے، شاید وہ آپ سے ملنا چاہ رہے ہیں۔"

"کوئی خاص بات؟" عابر کی چھٹی حس جاگی۔

"مجھے کیا پتا۔" شائستہ نے کچھ اس انداز میں کہا کہ عابر مشکوک ہو گیا۔

"بتائیں نا، آپ کو سب پتا ہے۔" عابر بولا۔

"مجھے انہوں نے کچھ نہیں بتایا، بس اتنا ہی کہا کہ کسی دن عابر کو چائے پر بلاؤ۔" شائستہ اتنا کہہ کر ہنسی۔

"اچھا ٹھیک ہے، بتائیں کب آؤں؟"

"نیک کام میں بھلا دیر کس بات کی، آج ہی شام میں آ جائیں، اس وقت آپ کہاں ہیں؟"

"جی..... گھر پر ہوں۔" عابر نے پورے یقین سے جھوٹ بولا۔ یہ آسانی موبائل فون کی فراہم کردہ تھی۔

"چلیں پھر پکا..... شام کو آ رہے ہیں آپ۔" شائستہ نے کہا۔

"ٹھیک ہے۔" عابر نے فوراً ہامی بھر لی۔

ڈاکٹر نوشاد نے شام کو چائے پر بلا کر عابر سے جو کچھ کہا، وہ اس کے لئے انتہائی خوش کن تھا۔

لیکن اسی رات کھانے پر علی نثار نے عابر سے جو کچھ کہا، اسے سن کر عابر کی سٹی گم ہو گئی۔

☆.....☆.....☆

انجو گھر میں نہیں تھی۔ آخر وہ کہاں غائب ہو گئی تھی۔ مائی پکھی نے پورا گھر چھان مارا۔ گھر ہی کتنا بڑا تھا۔ دو کمرے اور ایک صحن۔ اس نے احتیاطاً غسل خانہ اور بیت الخلا بھی دیکھ لیا۔ انجو کہیں نہ تھی۔

اب مائی پکھی کو تشویش ہوئی۔ اس نے پریشانی میں دو تین چکر صحن کے لگائے۔ صحن میں نیم کی زرد پتیاں پھیلی ہوئی تھیں۔ اس نے صحن کے درمیان رک کر نیم کے پیڑ پر نظر ڈالی، غصے میں کچھ بڑبڑائی اور یکدم زور سے چیخی۔ "انجو..... تو کہاں مر گئی؟"

کوئی جواب نہ آیا۔ وہ باورچی خانے کی طرف بڑھی، ہنڈیا کے پانی میں ابال آ گیا تھا۔ اس نے لکڑیاں پیچھے کر کے آگ مدھم کی اور ایک جلتی لکڑی ہاتھ میں پکڑ کر صحن میں آئی۔

جلتی لکڑی سے اس نے مثلث نما ایک حصار کھینچا۔ پھر چپل اتار کر اس حصار میں بیٹھ گئی۔ جلتی لکڑی اب بھی اس کے ہاتھ میں تھی۔ اس نے منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑاتے ہوئے تین بار لکڑی زمین پر ماری۔

اسی وقت انجو چھت سے نیچے کودی اور اس کے سامنے آ کر بیٹھ گئی۔

مائی پکھی نے انجو کی لال آنکھوں میں نظریں گاڑ دیں۔ انجو کی آنکھوں میں اسے جس شخص کی تصویر نظر آئی، اسے دیکھ کر خود مائی پکھی کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔

جس وقت مائی پکھی حوالات میں ایک ہاتھ آنکھوں پر رکھے لیٹی تھی اور کوئے پورے تھانے میں ایک ہنگامہ کئے ہوئے تھے، تب وہ یہاں آیا تھا۔ وہ جادو ٹونے اور عملیات کا ماہر تھا۔ وہ باقاعدہ مائی پکھی کا شاگرد نہ تھا لیکن جب بھی اسے ضرورت ہوتی، وہ مائی پکھی سے مشورہ لینے آ جاتا تھا۔ بچپن میں چیچک نکلنے سے اس کی ایک آنکھ ضائع ہو گئی تھی۔ وہ ایک آنکھ کا تھا اور اس ایک آنکھ میں دنیا بھر کا میل بھرا تھا۔ بے اولاد عورتوں کو اپنے جال میں پھنسا کر اپنا اُلو سیدھا کرتا۔ پھر ان مت ماری عورتوں کو ایسے عمل بتاتا کہ وہ دین کی رہتیں، نہ دنیا کی۔

وہ انتہائی شاطر شخص تھا، موقع پرست اور چکر باز..... اس کا نام چکرم تھا۔ صبح جب وہ مائی پکھی کے گھر پہنچا تو خلاف توقع مائی پکھی کو غائب پایا۔ دروازہ کھلا تھا۔ دروازہ کھلا ہونا کوئی حیرت کی بات نہ تھی حیرت کی بات یہ تھی کہ گھر خالی پڑا تھا۔

چکرم، مائی پکھی سے ایک بے اولاد عورت کے سلسلے میں مشورہ کرنے آیا تھا۔ ایک عمل کے سلسلے میں اسے مائی پکھی کی اجازت بھی درکار تھی۔ اس نے پورا گھر دیکھ لیا، مائی پکھی گھر میں موجود نہ تھی۔ چکرم نے سوچا کہ شاید مائی پکھی کہیں آس پاس گئی ہو لہٰذا وہ اس کے انتظار میں چارپائی پر بیٹھ گیا۔

وقت گزاری کے لئے اس نے چرس بھری سگریٹ جیب سے نکالی اور سلگا کر گہرا کش لیا۔

تب اس کی نظر کالے منہ کی سفید بلی پر پڑی۔ وہ ابھی کمرے سے نکلی تھی۔ اس بلی کو چکرم نے ایک آدھ بار اس گھر میں دیکھا تھا لیکن اسے یہ معلوم نہ تھا کہ اس کا مائی پکھی سے کوئی خاص تعلق ہے۔

اس نے انجو کو غور سے دیکھا تو وہ ایک دم اسے انتہائی کام کی دکھائی دی۔ ایک عمل کے لئے اسے ایک بلی کی ضرورت تھی۔ یہ بلی اسے "خاص" دکھائی دی تھی۔

وہ چارپائی کے نزدیک آ کر ایک پائے سے اپنا جسم رگڑنے لگی۔

چکرم کے شاطر ذہن نے فوراً ایک منصوبہ ترتیب دے لیا۔ وہ تیزی سے گھر کے باہر بھاگا۔

PDF BY Manzoor

قریب کی دکان سے اس نے دودھ کا پیکٹ خریدا، گھر واپس آیا۔ سفید بلی چارپائی کے پائے سے لگی بیٹھی تھی۔ چکرم نے باورچی خانے سے ایک پیالا اٹھایا، پیکٹ کھول کر دودھ پیالے میں ڈالا، جیب سے ایک پڑیا نکالی، کھول کر اس کا پاؤڈر دودھ میں ملایا اور دودھ سے بھرا پیالا سفید بلی کے سامنے رکھ دیا۔

دودھ دیکھ کر وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور پھر تیزی سے دودھ میں منہ ڈال کر اسے پینے لگی۔ بلی کو دودھ پیتے دیکھ کر چکرم کی اکلوتی آنکھ میں نشہ بھر گیا۔

توقع کے مطابق سفید بلی دودھ پینے کے بعد پانچ منٹ کے اندر مدہوش ہوگئی۔ اب یہاں ٹھہرنا بے کار تھا۔ اس نے دودھ کا خالی پیالا اٹھایا، اسے نلکا کھول کر پانی سے اچھی طرح دھویا، باورچی خانے میں اسی طرح رکھ دیا جس طرح رکھا تھا، دودھ کا خالی پیکٹ اٹھا کر باہر آیا۔

چکرم نے اپنے پاس موجود ایک کپڑے کے تھیلے میں بے ہوش پڑی بلی کو ڈالا، خالی پیکٹ بھی اسی میں رکھ دیا اور تھیلا اٹھا کر گھر سے چل دیا۔ چکرم نے اپنے جرم کا کوئی ثبوت پیچھے نہ چھوڑا تھا۔ بلی بے ہوش تھی، اس لئے اس کے تھیلے سے باہر آنے کا کوئی امکان نہ تھا۔

گھر پہنچ کر اس نے تھیلا اپنے بیڈ پر رکھا اور پھر اسے اٹھا کر اُلٹ دیا۔ اس کا خیال تھا کہ بلی ابھی دس پندرہ منٹ سے پہلے ہوش میں نہیں آئے گی۔ ممکن ہے ایسا ہی ہوتا لیکن اسی وقت مائی پنکھی نے اس کا نام لے کر پکارا..... ''انجو۔''

وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ اس نے اپنی سرخ آنکھوں سے چکرم کو دیکھا۔ غصے سے ''میاؤں'' کی آواز نکالی اور بیڈ سے نیچے چھلانگ لگانے کو تھی کہ چکرم کو چکر آ گیا۔ ایک قیمتی بلی کو ہاتھ سے نکلتے دیکھ کر اس نے لپک کر دروازہ بند کر دیا اور بلی کی طرف بڑھا۔

اس سے قبل کہ وہ بلی کو پکڑ پاتا، اس نے بیڈ سے چھلانگ لگائی۔ چکرم کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ وہ چھلانگ لگا کر کیا کرنے والی ہے۔ اس کا خیال تھا کہ وہ اس کی پہنچ سے دور ہونے کے لئے الماری پر جست لگا کر خود کو محفوظ کر لے گی۔

لیکن اس نے ایک ایسا کام دکھایا کہ چکرم کے حواس باختہ ہوگئے۔ بلی نے چکرم کے چہرے کو نشانہ بنایا اور اس قدر پھرتی اور چابکدستی سے پنجہ مارا کہ اس کی آنکھ شدید لہولہان ہوگئی۔ وہ آنکھ پر ہاتھ رکھ کر بیڈ پر بیٹھا۔ اتنے میں سفید بلی کھڑکی پر چڑھی اور باہر کود گئی۔ یہ وہ وقت تھا جب مائی پنکھی نے کچھ پڑھتے ہوئے جلتی لکڑی زمین پر ماری تھی۔ تب انجو چھت سے کود کر اس کے سامنے آ بیٹھی تھی۔ انجو کا ایک پنجہ خون آلود تھا اور آنکھوں میں چکرم کی تصویر نظر آ رہی تھی۔

مائی پنکھی کو معلوم ہو چکا تھا کہ انجو کو کس نے اغوا کیا تھا اور وہ اس کا کیا حشر کر کے آئی ہے۔ مائی پنکھی نے اسے پیار بھری نظروں سے دیکھا اور بولی۔ ''واہ ری انجو..... تو نے کیا خوب کمال کیا۔''

مائی پنکھی حصار سے نکل آئی اور چارپائی پر آ کر بیٹھ گئی۔ انجو اس کے قدموں میں لوٹنے لگی۔

''انجو۔ میں بھوکی ہوں۔'' مائی پنکھی نے چارپائی سے اٹھتے ہوئے کہا۔ پھر اس نے حصار میں موجود لکڑی اٹھائی۔ وہ بجھ چکی تھی۔ اس نے باورچی خانے میں پہنچ کر دوبارہ آگ بھڑکائی اور پیڑھی پر بیٹھ کر انجو کا انتظار کرنے لگی۔

کچھ دیر میں ہنڈیا میں موجود سیاہ محلول میں اُبال آ گیا تھا اور انجو منہ میں کوا دبائے دروازے پر موجود تھی۔

☆.....☆.....☆

چائے پینے کے بعد ڈاکٹر نوشاد نے عابر کا ہاتھ پکڑا اور بولا۔ ''آؤ بیٹا۔''

عابر فوراً اٹھ گیا۔ ڈاکٹر نوشاد اسے ڈرائنگ روم میں لے آیا جبکہ گھر کے دیگر افراد ڈائننگ روم میں بیٹھے رہ گئے۔ عابر کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ڈاکٹر نوشاد اسے اچانک محفل سے کیوں اٹھا کر لایا ہے۔ وہ اچھا خاصا ملکہ کے حسن سے اپنے دل کا قرار کشید کر رہا تھا۔ ملکہ بھی گاہے گاہے پلکیں اٹھا کر گہری نظروں سے اسے دیکھ لیتی تھی۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ ڈاکٹر نوشاد نے اس کی نظروں کی چوری کو پکڑ لیا اور اب وہ علیحدگی میں اسے سمجھانا یا تنبیہ کرنا چاہتا تھا۔ عابر نے سوچ لیا تھا کہ اب چاہے جو ہو، وہ کسی طور ملکہ سے دستبردار نہیں ہوگا۔

وہاں معاملہ ہی کچھ اور نکلا۔ ڈاکٹر نوشاد نے جو بات کی، وہ انتہائی خوش کن تھی۔ اس نے ڈرائنگ روم میں بیٹھتے ہی عابر کی طرف مسکرا کر دیکھا اور بلا تمہید بولا۔ ''بیٹا..... میں چاہتا ہوں کہ تم اس گھر کے داماد بن جاؤ۔''

PDF BY Manzoor

یہ تو نیکی اور پوچھ پوچھ والا معاملہ تھا۔ عابر تو پہلے ہی ادھار کھائے بیٹھا تھا۔ یہ سنتے ہی اس کے من میں لڈو پھوٹنے لگے۔ اس نے خوش ہو کر کہا۔ ''انکل! یہ آپ کی ذرّہ نوازی ہے۔''

''ایک بات اور تم سے کہنا چاہوں گا کہ اس گھر میں سات بیٹیاں ہیں، تم جس کو پسند کرو گے، وہ تمہارے نکاح میں دے دی جائے گی۔'' ڈاکٹر نوشاد نے بڑی فراخدلی کا ثبوت دیا۔

عابر کے لئے اب کوئی مشکل نہ رہی تھی۔ اب تک وہ جن مراحل سے گزر رہا تھا، ان سے اندازہ ہوتا تھا کہ یہ لوگ ملکہ سے بطور خاص اس کا فاصلہ برقرار رکھنا چاہتے تھے لیکن ڈاکٹر نوشاد کے اس بیان نے اس ''دلّی'' کو جو بہت دور نظر آتی تھی، اچانک قریب کر دیا تھا لہٰذا اس نے بلا تامل انتہائی صاف گوئی سے کہا۔ ''انکل! مجھے ملکہ پسند ہے۔''

''ٹھیک ہے۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں۔'' ڈاکٹر نوشاد نے درخواست منظور کرنے میں ذرا دیر نہ کی۔ پھر کچھ توقف کے بعد وہ بولا۔ ''اب میں چاہوں گا کہ تم اپنے والدین کو اس رشتے کے لئے بھیجو۔''

''جی اچھا۔'' عابر نے تشکر آمیز لہجے میں کہا۔ ''میں گھر جاتے ہی اپنی امی سے بات کروں گا۔''

اور جب رات کے کھانے پر عابر نے ڈرتے ڈرتے نازنین اور علی نثار سے مخاطب ہو کر دھیرے سے کہا۔ ''امی، ابو۔ میں شادی کرنا چاہتا ہوں۔'' تو یہ سن کر علی نثار منہ میں نوالہ رکھنا بھول گئے اور نازنین کے ہاتھ سے چمچہ چھوٹ گیا۔

''کیا.....؟'' دونوں نے بیک وقت کہا۔

''ابو۔ آپ چل کر ان لوگوں سے مل لیں۔'' عابر نے ان کی حیرت کو نظر انداز کر کے کہا۔

''وہ کون بے وقوف لوگ ہیں جو تمہیں بیٹی دے رہے ہیں؟'' علی نثار کے لہجے میں تلخی در آئی۔

''ابو۔ وہ بہت اچھے لوگ ہیں، انہیں بے وقوف نہ کہیں۔'' عابر نے حمایت کی۔

''کیا وہ یہ بات جانتے ہیں کہ تم ایک نکھٹو لڑکے ہو۔ کوئی نوکری، کوئی ملازمت تمہارے پاس نہیں۔ ایک بے روزگار شخص کو وہ کیسے اپنی بیٹی دے رہے ہیں۔ ضرور لڑکی میں نقص ہوگا۔'' علی نثار نے جو کہا، ٹھیک کہا۔

''ابو۔ لڑکی میں نے دیکھی ہے، وہ بہت خوبصورت ہے اور کالج کی طالبہ ہے، اس میں کوئی نقص نہیں۔'' عابر نے بتایا۔

''عابر۔ ضرور کچھ دال میں کالا ہے۔'' نازنین نے کہا۔ ''ابھی شادی کے چکروں میں نہ پڑو بیٹا، کچھ کام وام کرو۔''

''امی۔ آپ ایک بار ان لوگوں سے جا کر مل تو لیں۔'' عابر نے کہا۔

''میں تو جانے کے لئے تیار نہیں، تمہاری ماں جانا چاہے تو لے جاؤ۔'' علی نثار نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

''امی ابو۔ آپ دونوں کو چلنا ہوگا۔ میں نے ان سے وعدہ کیا ہے کہ آپ لوگ رشتہ مانگنے آئیں گے۔'' عابر نے سمجھانے کی کوشش کی۔

''اجنبی لوگ ایک بے روزگار لڑکے کو رشتہ دینے پر رضامند ہیں تو سمجھ لینا چاہئے کہ اس کے پیچھے ضرور کوئی گول مال ہے۔ میں کسی قیمت پر نہیں جاؤں گا۔ تم ایسا کرو بیٹا۔ جا کر گھر داماد بن جاؤ۔'' علی نثار اتنا کہہ کر ڈائننگ ٹیبل سے اٹھ گئے۔

عابر نے اپنی ماں کی طرف دیکھا تو نازنین نے بہت صاف لہجے میں کہا۔ ''تمہارے ابو ٹھیک کہتے ہیں۔''

''پھر آپ میرا فیصلہ بھی سن لیں۔ اگر آپ لوگ نہ گئے تو میں یہ گھر چھوڑ دوں گا۔''

''تم نے اچھا کیا کہ خود گھر چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا۔ میں تمہارے نکھٹو پن سے تنگ آ چکا ہوں۔ میں یہ بات خود تم سے کہنے والا تھا۔ تم خوشی سے یہ گھر چھوڑ دو، ابھی اسی وقت۔'' علی نثار نے تولیہ سے ہاتھ پونچھتے ہوئے کہا۔

عابر کی یہ بات سن کر سٹی گم ہو گئی۔ اسے ہرگز امید نہ تھی کہ علی نثار اس کی دھمکی کو اس قدر سنجیدگی سے لیں گے۔ اس کا خیال تھا کہ وہ ان کا اکلوتا بیٹا ہے، وہ کسی قیمت پر یہ برداشت نہیں کریں گے کہ وہ گھر چھوڑ دے لیکن اس وقت تو معاملہ انتہائی سنگین ہو گیا تھا۔

اب اسے ہر قیمت پر گھر چھوڑنا تھا۔ ملکہ کی کشش نے اس فیصلے پر عمل درآمد کو آسان بنایا اور وہ بلا سوچے سمجھے گھر سے نکل گیا۔

رات کے بارہ بجے جب عابر، ڈاکٹر نوشاد کے گھر پہنچا تو گھر میں کھلبلی مچ گئی۔

''بیٹا۔ خیریت تو ہے؟'' ڈاکٹر نوشاد نے گیٹ کھول کر اس سے پوچھا۔

''انکل۔ میں گھر چھوڑ آیا ہوں۔'' عابر نے بڑے سپاٹ لہجے میں کہا۔

''کوئی بات نہیں۔ یہ گھر بھی تمہارا ہے۔'' ڈاکٹر نوشاد کی بات سن کر عابر کے دھڑکتے دل کو قرار آیا۔

''شکریہ انکل۔'' عابر نے مطمئن لہجے میں کہا۔

ڈاکٹر نوشاد اسے اندر لے آیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے سب لوگ لاؤنج میں اکٹھا ہو گئے۔ ملکہ سمیت سب کی خوشی دیدنی تھی۔ عابر بھی خوش تھا۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ آئندہ اس کے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔

فی الحال تو یہ ہوا کہ اگلے دن، رات کو دو گواہوں کی موجودگی میں گھر پر ہی نکاح کر دیا گیا۔ شائستہ اور ملکہ جس کمرے میں رہائش پذیر تھیں، وہاں سے شائستہ کو نکال دیا گیا۔ رات کو جب عابر ''حجلۂ عروسی'' میں داخل ہوا تو اسے یقین نہ آیا کہ جو کام اسے انتہائی مشکل نظر آ رہا تھا، وہ پلک جھپکتے میں ہو گیا تھا۔ کسی مرد شاطر نے ''ملکہ سبا'' کو مع بیڈ اس کی خدمت میں پیش کر دیا تھا۔

وہ مرد شاطر کوئی اور نہیں، لڑکی کا باپ ڈاکٹر نوشاد تھا۔

نام ایسا اچھا۔ شکل انتہائی مکروہ اور کرتوت یکدم سیاہ۔ عابر کے بارے میں اسے امید نہیں تھی کہ وہ اتنا آسان ٹارگٹ ثابت ہوگا۔ وہ تو کسی پکے پھل کی طرح اس کی جھولی میں آ گرا تھا۔

سسر، داماد دونوں خوش تھے۔ دونوں اپنی جگہ مطمئن تھے۔ دونوں کو اپنی منزل تک پہنچنا آسان لگا تھا۔ عابر تو بے انتہا خوش تھا۔ جو چیز اسے چوبیس سال میں بھی حاصل ہوتی نظر نہیں آ رہی تھی، وہ چوبیس گھنٹے میں حاصل ہو گئی تھی۔

کمرے میں داخل ہونے کے بعد عابر نے دروازہ بند کیا اور وہیں کھڑا ہو گیا۔ بیڈ پر ملکہ بیر بہوٹی کی صورت موجود تھی۔ اس کا سر جھکا تھا اور سکڑی سمٹی بیٹھی تھی۔ دروازہ بند ہونے کی آواز پر اس نے ذرا سا اپنے سر کو اٹھایا تھا اور پھر جھکا لیا تھا۔

عابر آنکھوں میں خواب سجائے کسی فلمی ہیرو کے انداز میں بیڈ کی طرف بڑھا۔ اس نے بلند آواز میں سلام کیا اور ملکہ کے نزدیک بیڈ پر بیٹھ گیا۔ ڈاکٹر نوشاد نے اسے اس گھر کا داماد بننے کی دعوت دی تھی لیکن وہ ''گھر داماد'' بن گیا۔ اس کے پاس کچھ نہ تھا۔ وہ گھر سے خالی ہاتھ نکل آیا تھا۔ اس نے اپنے کپڑے تک نہ اٹھائے تھے۔ باپ نے اسے نکھٹو کہا تھا اور گھر سے نکل جانے کی ہدایت کی تھی۔ وہ اپنی اَنا میں گھر کی کوئی چیز اپنے ساتھ نہ لایا تھا لیکن یہاں اسے بہت کچھ مل گیا تھا۔

کمرے میں آنے سے پہلے شائستہ نے اسے ایک چھوٹی مخملی ڈبیا دی تھی جس میں سونے کی انگوٹھی تھی۔ وہ شرمندہ تھا۔ جو کام اسے کرنے چاہئے تھے، وہ سسرال کے لوگ کر رہے تھے۔

اس نے ایک نظر سر جھکائے ملکہ کو دیکھا اور پھر دونوں ہاتھوں سے بہت دھیرے سے گھونگھٹ الٹ دیا۔ گھونگھٹ الٹتے ہی روشن کمرہ مزید روشن ہو گیا۔ یکدم بجلی سی چمکی جو اس کی آنکھوں کو

PDF BY Manzoor

خیرہ کرگئی۔ ملکہ تو پہلے ہی ملکہ تھی۔ اس وقت تو وہ پریوں جیسی لگ رہی تھی۔

''میری ملکہ...... غلام حاضر ہے۔'' عابر کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

ملکہ نے اپنی لمبی اور بھاری پلکیں اٹھائیں۔ مسکراتی آنکھوں سے اسے دیکھا، پھر دھیرے سے لب کھولے۔ ''غلام نہیں آقا کہیے۔''

''کتنا خوش نصیب ہوں میں۔'' عابر نے جیب سے ڈبیا نکالتے ہوئے کہا۔ ''اتنا کہ یقین نہیں آتا۔''

''کیوں یقین نہیں آتا۔ میں روزروشن کی طرح عیاں ہوں۔'' ملکہ بولی۔

''بے شک تم دن کی طرح روشن ہو۔'' عابر نے ڈبیا سے انگوٹھی نکالی۔ ''لیکن میں کسی رات سے کم نہیں اور رات بھی سیاہ۔''

''کیوں کوستے ہیں اپنے آپ کو'' ملکہ نے اداس لہجے میں کہا۔ پھر یکدم مسکرا کر بولی۔ ''لائیے، انگوٹھی پہنایئے۔''

عابر نے اس کے اُٹھے ہاتھ کو پکڑ کر انگوٹھی اس کی حسین انگلی میں پہنا دی۔ ملکہ نے انگوٹھی کو دوسرے ہاتھ کی انگلی سے گھماتے ہوئے کہا۔ ''پیاری ہے...... شکریہ سر۔''

عابر کو اس کا یہ انداز بڑا پیارا لگا۔ اسے بے اختیار ملکہ پر پیار آ گیا۔ قطرہ دریا سے ملا اور دریا سمندر ہو گیا۔ کوئی بندہ رہا نہ کوئی بندہ نواز۔

عابر پر جلد ہی اس گھر کے لیل ونہار کھلنے لگے۔ ڈاکٹر نوشاد ہر دوسرے تیسرے دن دورے پر ہوتا، کبھی اسلام آباد، کبھی لاہور تو کبھی ملتان...... وہ اکیلا نہ جاتا، اس کے ساتھ کوئی بیٹی ہوتی۔ اگر وہ اندرون ملک نہ جاتا تو رات کو کسی تقریب میں چلا جاتا۔ کوئی موسیقی کا پروگرام ہوتا، مشاعرہ ہوتا یا کسی تھیٹر کا ڈراما۔ اس تقریب میں بھی کوئی بیٹی ساتھ ہوتی۔ کسی نجی تقریب میں چاندنی کے ساتھ ملکہ اور عابر کو بھی لے لیا جاتا۔

پھر ایک دن شائستہ نے اسے اپنے ساتھ مارکیٹ چلنے کو کہا۔ وہ ساتھ چلا گیا۔ جب وہ شاپنگ کر کے رات کو گھر واپس آیا تو ملکہ کو گھر سے غائب پایا۔

اس نے شائستہ سے ملکہ کے بارے میں پوچھا۔ ''یہ ملکہ کہاں ہے؟''

''عابر بھائی! مجھے نہیں معلوم، میں تو آپ کے ساتھ تھی۔'' شائستہ نے بڑی معصومیت سے جواب دیا۔ ''فاخرہ سے پوچھ لیں، اسے معلوم ہوگا۔''

فاخرہ سے پوچھا تو وہ لاپروائی سے بولی۔ ''عابر بھائی، کسی سہیلی کے ہاں گئی ہوگی۔''

''فاخرہ۔ رات کے گیارہ بج رہے ہیں۔ آخر وہ کس سہیلی کے ہاں گئی ہے۔ مجھ سے تو اس نے ذکر کیا نہیں۔ اسے فون کرو۔'' عابر نے سنجیدگی سے کہا۔

''جی کرتی ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ اپنے کمرے میں چلی گئی۔

تھوڑی دیر میں کھانا لگ گیا۔ ڈائننگ ٹیبل پر گھر کے سارے افراد موجود تھے، نہیں تھے تو ملکہ اور ڈاکٹر نوشاد...... اور مزے کی بات یہ تھی کہ کسی کو فکر بھی نہ تھی جبکہ عابر تڑپ رہا تھا۔ اسے یہ پتا نہیں چل رہا تھا کہ آخر ملکہ گئی تو گئی کہاں؟

تب اس نے چاندنی سے بات کی۔ عابر نے پوچھا۔ ''آنٹی! کیا آپ کو معلوم ہے کہ ملکہ کہاں ہے؟''

''ہاں...... کیوں نہیں۔ ارے کیا تمہیں کسی نے نہیں بتایا؟'' چاندنی نے اپنے سامنے بیٹھی بیٹیوں کی طرف گھور کے کہا۔ کوئی لڑکی کچھ نہ بولی۔ پُراسرار خاموشی چھائی رہی۔

''عابر بیٹا۔ وہ لاہور گئی ہے۔'' چاندنی نے بڑے اطمینان سے کہا، جیسے وہ پڑوس میں گئی ہو۔

''آنٹی...... لاہور۔'' عابر کو کرنٹ سا لگا۔ وہ کھانا کھاتے کھاتے ٹھہر گیا۔

''ہاں بیٹا۔ کل شام تک آجائے گی۔'' چاندنی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''آنٹی۔ اس نے مجھ سے جانے کی اجازت نہیں لی۔ اس نے تو مجھے بتایا تک نہیں۔'' عابر نے شکوہ کیا۔

''بس بیٹا، وہ اچانک چلی گئی۔ اس کے ابو ایک ضروری کام سے لاہور جا رہے تھے تو وہ ان کے پیچھے لگ گئی کہ میں بھی چلوں گی۔ میں اپنی سہیلی سے مل آؤں گی۔ پہلے وہ لوگ یہیں ہمارے پڑوس میں رہتے تھے۔ میں نے منع بھی کیا کہ عابر سے پوچھ کر جانا۔ تو وہ بولی، ارے وہ کچھ نہیں کہیں گے، وہ بہت اچھے ہیں اور پھر کوئی دو چار مہینے کو تھوڑا ہی جا رہی ہوں، کل واپس آجاؤں گی۔ ادھر اس کے ابو نے اپنی لاڈلی کی ہاں میں ہاں ملائی۔ یوں وہ کھڑے کھڑے چلی گئی۔'' چاندنی نے اپنی طرف سے اس معاملے پر لیپاپوتی کرنے کی کوشش کی۔

لیکن عابر کے ذہن میں گرہ پڑ گئی۔ اگر وہ گھر پر نہیں تھا تو کیا ہوا۔ وہ اس سے موبائل پر تو بات کر سکتی تھی لیکن اس نے اسے اس قابل بھی نہیں سمجھا تھا۔ کیا اس لئے کہ وہ گھر داماد تھا۔

ڈاکٹر نوشاد کے بارے میں یہ بات جلد اس کے علم میں آ گئی کہ اس کے بااثر اور اہم لوگوں سے تعلقات تھے۔ وہ باآسانی اسے نوکری دلوا سکتا تھا۔ عابر نہیں چاہتا تھا کہ زیادہ عرصہ اپنی سسرال پر بوجھ بنے۔ اگرچہ کسی نے اس سے اس موضوع پر بات نہ کی تھی لیکن وہ خود اس معاملے میں حساس تھا۔ ایک دن موقع پا کر اس نے ڈاکٹر نوشاد سے کہا۔ ''انکل! آپ کے لوگوں سے وسیع پیمانے پر تعلقات ہیں۔ میں بی کام ہوں، مجھے کہیں نوکری دلوا دیجئے۔''

''ارے بیٹا۔ یہ کہہ کر تو آپ نے ہمیں شرمندہ کر دیا۔ آپ اس گھر کے داماد ہیں، ہم آپ سے نوکری کروائیں گے۔ یہ بات آپ کے ذہن میں کیوں آئی، کیا آپ کو کسی نے کچھ کہا ہے، کیا آپ جب اپنے گھر تھے تو نوکری کرتے تھے؟'' ڈاکٹر نوشاد نے بڑے شفقت بھرے لہجے میں کہا۔ ''بیٹا، اسے آپ اپنا گھر سمجھیں۔''

''گھر سمجھ کر ہی رہ رہا ہوں۔ لیکن انکل مجھے کچھ کام تو کرنا پڑے گا۔ اس طرح میں کب تک گھر میں پڑا رہوں گا۔'' عابر نے کہا۔

''تم گھر میں پڑے نہیں، آرام سے رہ رہے ہو، رہتے رہو۔ اگر نوکری کی ضرورت پڑے گی تو ملکہ کرے گی، تم قطعاً پریشان مت ہو۔'' ڈاکٹر نوشاد نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''گھر کے کام کم ہیں کیا، تم گھر سنبھالو۔''

ملکہ نے تو خیر ابھی نوکری نہ کی تھی لیکن عابر کے ہاتھ میں گھر ضرور دے دیا گیا۔ اب کسی لڑکی کو کہیں جانا ہوتا، عابر ساتھ جاتا۔ گھر کا سودا سلف، یوٹیلیٹی بلز سب اس کی ذمے داری تھے۔ کسی کو ڈاکٹر کے پاس جانا ہے، کسی نے بیوٹی پارلر جانا ہے، کسی کو سہیلی کے گھر چھوڑنا ہے اور دوسرے دن اسے لے کر آنا ہے۔ گھر میں آئے دن کوئی تقریب ہوتی، کسی نہ کسی کی سالگرہ منائی جا رہی ہوتی۔ اس میں لڑکیوں کی سہیلیاں ہوتیں، ان سہیلیوں کے بھائی ہوتے، چاندنی اور ڈاکٹر نوشاد کے کچھ دوست احباب ہوتے۔ اس تقریب کا سارا انتظام عابر کو کرنا ہوتا۔

اس گھر کا ماحول بڑا دوستانہ تھا۔ کھلی فضا تھی، کوئی روک ٹوک نہ تھی، کوئی کسی کو شک وشبے کی نظر سے نہ دیکھتا تھا۔ عابر نوجوان تھا، اسے اس گھر کی فضا راس آ گئی تھی۔ تقریب میں شریک ہونے والی لڑکیاں اس کے گرد گھیرا ڈال لیتی تھیں۔ ملکہ کبھی اعتراض نہ کرتی تھی۔ وہ ہنستی مسکراتی اس کے پاس سے گزر جاتی۔

پہلی بار ایسا ہوا تھا کہ وہ اسے بغیر بتائے لاہور چلی گئی تھی۔ اگرچہ وہ اپنے باپ کے ساتھ گئی تھی، کوئی قابل اعتراض بات نہ تھی لیکن جانے کیوں اسے اپنی کم مائیگی کا احساس ہوا تھا۔

وہ رات کو کروٹیں بدلتے بدلتے ماضی حال کا جائزہ لے رہا تھا۔ اچانک اسے خیال آیا کہ وہ موبائل پر ملکہ سے بات کرے، اس سے شکوہ کرے۔ تکیے کے نیچے سے اس نے اپنا موبائل نکالا اور ملکہ کا نمبر ملایا۔ چند لمحوں بعد اسے سوئچ آف ہونے کی اطلاع دی جانے لگی۔

صبح اٹھ کر بھی اس نے کئی بار موبائل ملایا لیکن ہر بار اس کا سوئچ آف ملا۔ اسے حیرت تھی کہ خود ملکہ نے بھی اسے کال کرنے کی ضرورت محسوس نہ کی تھی۔ اس بات کا بھی اسے دکھ تھا۔ وہ ملکہ سے شدید محبت کرتا تھا۔ اس کے لئے اس نے اپنا گھر چھوڑا تھا۔

پھر شائستہ اور فاخرہ اسے اپنے ساتھ لے گئیں۔ ایک کو پارلر جانا تھا، دوسری کو ٹیلر کے پاس جانا تھا۔ دونوں کے کام سے فارغ ہو کر وہ شام کو گھر پہنچا۔ اس وقت تک ملکہ لاہور سے واپس آچکی تھی۔ وہ کمرے میں موجود تھی اور سو رہی تھی۔

چاندنی نے ان دونوں کے آتے ہی عابر کے تاثرات سے آگاہ کر دیا تھا۔ ملکہ نے خاموش نگاہوں سے باپ کی طرف دیکھا۔ ڈاکٹر نوشاد نے اس کی پریشانی محسوس کرتے ہوئے کہا۔ ''تم بے فکر ہو جاؤ، میں عابر کو سنبھال لوں گا۔ جاؤ تم جا کر سو جاؤ۔''

اور پھر ایسا ہی ہوا۔ عابر، شائستہ اور فاخرہ کے ساتھ گھر میں داخل ہوا تو اس نے عابر کو کمرے میں جانے سے پہلے ہی روک لیا۔ وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے کمرے میں لے آیا۔ کمرے میں اس وقت کوئی نہ تھا۔ چاندنی لاؤنج میں بیٹھی ہوئی تھی۔

''بیٹا عابر، مجھ سے غلطی ہو گئی۔ میں ملکہ کو تمہاری اجازت کے بغیر لاہور لے گیا۔ سنا ہے تم ناراض ہو۔ بھئی اس میں ملکہ کا کوئی قصور نہیں، ساری غلطی میری ہے۔ مجھے معاف کر دو۔'' ڈاکٹر نوشاد نے یہ کہتے ہوئے اس کے سامنے ہاتھ جوڑ لئے۔

عابر فوراً پگھل گیا۔ اس نے تیزی سے آگے بڑھ کر ڈاکٹر نوشاد کے ہاتھ پکڑ لئے۔ ''یہ آپ کیا کر رہے ہیں انکل۔ مجھے اس طرح شرمندہ نہ کریں۔ ملکہ اپنے باپ کے ساتھ گئی تھی، کسی غیر کے ساتھ نہیں۔''

یہ ڈاکٹر نوشاد کا نیا روپ تھا۔ وہ گدھے کو تو باپ بنانا جانتا ہی تھا۔ اسے گھر داماد کو ''دادا'' بنانا بھی آتا تھا۔ اس نے عابر کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کیا معافی مانگی، عابر کو اپنا بے دام غلام بنا لیا۔ عابر اب اس کے آگے دُم ہلاتا پھرتا تھا۔ ڈاکٹر نوشاد کا کتا گھر کا نہ گھاٹ کا۔

ایک دن ڈاکٹر نوشاد صبح ہی صبح اس کے کمرے میں آ گیا۔ وہ اس کے کمرے میں کم آتا تھا۔ اسے عابر سے کوئی بات کرنا ہوتی تو وہ زیادہ تر ڈرائنگ روم میں کرتا تھا۔

دستک دینے پر ملکہ نے دروازہ کھولا۔ باپ کو سامنے پا کر وہ ایک طرف ہٹ گئی۔ ڈاکٹر نوشاد نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔ ''عابر صاحب سو رہے ہیں۔''

''نہیں ابو، جاگ رہے ہیں، ابھی اٹھے ہیں۔'' ملکہ نے بتایا۔

ڈاکٹر نوشاد کو اپنے کمرے میں داخل ہوتے دیکھ کر عابر بیڈ پر اٹھ کر بیٹھ گیا۔

''بیٹا۔ مجھے آپ سے ایک بات کرنا تھی۔''

''جی۔ انکل فرمایئے۔'' عابر مستعد ہو گیا۔

''ملکہ کو ایک بہت اچھا چانس مل رہا ہے۔ آپ کی اجازت کی ضرورت تھی۔''

''کیسا چانس انکل؟'' عابر نے پوچھا۔ ''میں سمجھا نہیں۔''

''ایک بڑی فرم کے مالک کو لیڈی سیکرٹری کی ضرورت ہے، تنخواہ بہت اچھی ہے، میں نے سوچا کہ کسی اور کو ملازمت دلوانے سے بہتر نہیں کہ ہم اپنی ملکہ کو یہ نوکری دلوا دیں، کام کوئی خاص نہیں۔'' ڈاکٹر نوشاد نے بتایا۔

''انکل۔ آپ ملکہ سے پوچھ لیں، یہ ابھی پڑھ رہی ہے۔'' عابر نے کہا۔

''ملکہ سے میں نے پوچھ لیا ہے۔'' ڈاکٹر نوشاد سامنے کھڑی ملکہ کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''اچھی ملازمت ہے، ایسا چانس مشکل سے ہی ملتا ہے، پڑھائی کا کیا ہے، پرائیویٹ امتحان دے لے گی...... کیوں ملکہ؟''

''جی ابو۔ ٹھیک ہے۔'' ملکہ نے حسب عادت مختصر جواب دیا اور کمرے سے چلی گئی۔

اب عابر کے پاس انکار کی کوئی وجہ موجود نہ تھی لہٰذا اس نے نہ چاہتے ہوئے بھی اجازت دے دی۔

دوسرے دن ملکہ کو گاڑی لینے آ گئی۔ یہ فرم کے سربراہ کی گاڑی تھی۔ باوردی شوفر نے ملکہ کو ریٹا کے کمرے تک پہنچایا اور سر جھکا کر باہر نکل گیا۔

ریٹا ایک چالیس سالہ باوقار عورت تھی۔ وہ اس فرم میں کافی عرصے سے تھی۔ وہ اپنے باس فراز یونس کی رگ رگ سے واقف تھی۔ وہ منیجنگ ڈائریکٹر کے عہدے پر فائز تھی۔ اس نے کمرے میں داخل ہوتی ہوئی اس حسین قیامت کو گہری نظر سے دیکھا اور معنی خیز انداز میں مسکرا دی۔

''میرا نام ملکہ ہے...... ملکہ نوشاد۔ میں ڈاکٹر نوشاد کی بیٹی ہوں۔'' ملکہ نے اپنا تعارف کرایا۔

''آپ تشریف رکھئے۔'' ریٹا نے مسکراتے ہوئے نرم لہجے میں کہا۔ ''آپ کس سلسلے میں آئی ہیں؟''

''ملازمت کے لئے، لیڈی سیکرٹری کی حیثیت سے۔'' ملکہ نے نپا تلا جواب دیا۔

''اچھا، بیٹھئے۔ میں چیف سے بات کرتی ہوں۔'' یہ کہہ کر ریٹا اٹھ گئی۔ اس نے اپنے ساتھ دو تین فائلیں بھی لے لیں اور کھٹ کھٹ کرتی باہر جانے کے بجائے ایک اندرونی دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ اس نے دروازے پر ہلکی سی دستک دی اور اندر چلی گئی۔

فراز یونس ٹیلیفون پر کسی سے گفتگو میں مصروف تھا۔ اس نے ریٹا کو دیکھ کر ہاتھ کے اشارے سے بیٹھنے کو کہا اور اپنی گفتگو جاری رکھی۔ ریٹا اپنے باس کو بغور دیکھتی رہی۔ وہ چھوٹے قد، گول چہرے اور سانولے رنگ کا ایک شاطر شخص تھا۔ عمر پچاس پچپن سے زائد نہ تھی۔ سینے اور ہاتھوں پر کالے گھنے بال تھے۔ آنکھیں چھوٹی مگر ان میں کوئی ایسی چیز تھی جو سامنے والے کو متاثر کرتی تھی۔

فراز یونس نے اچانک اپنی گفتگو کا اختتام کیا اور کرسی گھما کر ریٹا کی طرف دیکھا اور انتہائی سنجیدگی سے پوچھا۔ ''وہ آ گئی ہے کیا؟''

''جی۔ وہ آ گئی ہیں...... ملکۂ حسن۔'' ریٹا کی آنکھوں میں چمک آ گئی تھی۔

''ویری گڈ۔ اچھا کہا...... اس کا مطلب ہے، تمہیں ہمارا انتخاب پسند آیا۔'' فراز یونس نے اسے ترچھی نظروں سے دیکھا۔

''جی۔ اس مرتبہ آپ نے خاصا اونچا ہاتھ مارا ہے۔ کہاں ملی یہ سونامی آپ کو؟'' ریٹا نے بڑے پُرسکون انداز میں سوال کیا۔

''ایک تقریب میں...... وہاں ڈاکٹر نوشاد موجود تھا۔ تم ڈاکٹر نوشاد کو تو جانتی ہونا؟'' فراز نے پوچھا۔

''جی۔ بہت اچھی طرح۔'' ریٹا کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔

''یہ لڑکی جب مجھے نظر آئی تو میں نے ڈاکٹر نوشاد سے اسے اپنی سیکرٹری بنانے کی بات کی۔ وہ بولا سر کوئی مسئلہ نہیں۔ یہ اپنی بیٹی ہے، اس طرح سے معاملہ مزید آسان ہو گیا تھا۔ ڈاکٹر نوشاد کو تو جانتی ہونا۔'' وہ ہنسا۔

''جی۔ بہت اچھی طرح۔'' ریٹا نے اس بار فراز کو معنی خیز انداز میں دیکھا۔

''وہ بتا رہا تھا کہ اس کی عنقریب شادی ہونے والی ہے۔'' فراز یونس نے کہا۔

''شادی تو رکوائی جا سکتی ہے۔'' ریٹا نے سوال کے انداز میں جواب دیا۔

''ہاں، کیوں نہیں۔'' فراز یونس نے کہا۔ ''ریٹا۔ اس کا **اپوائنٹمنٹ** لیٹر ٹائپ کرا دو، اور اسے اندر بھیج دو۔''

''جی۔ بہت اچھا۔'' ریٹا فائلیں اس کے سامنے چھوڑ کر اٹھ گئی۔

ملکہ کو اسی دن بھاری معاوضے پر تقرر نامہ مل گیا۔ اسے فراز یونس کی گاڑی روز لینے آنے لگی اور وہ دفتر جانے لگی۔ ملکہ کے اوقات کار نو بجے سے چار بجے تک تھے۔ دفتر میں کام کچھ نہ تھا، بس بیٹھنا ہی تھا۔ ایک طرح سے ملکہ، ریٹا کے ماتحت کام کر رہی تھی۔ وہ اسے دو چار فائلیں لے کر اندر بھیج دیتی اور پھر یہ بھول جاتی کہ ملکہ کہاں ہے۔

لیکن عابر نہیں بھول پا رہا تھا۔ جب سے ملکہ نے نوکری کی تھی، ملکہ کے انداز بدل گئے تھے۔ وہ ایک ماڈل بن گئی تھی۔ جدید انداز کے کپڑے، قیمتی پرفیوم، بہترین میک اپ، زلفوں میں پڑتے پیچ وخم...... وہ آئے دن پارلر میں بیٹھی رہتی، گھر میں بھی ہوتی تو آئینے کے روبرو ہوتی۔ قریب ہوتے ہوئے بھی وہ اس سے دور ہو گئی تھی۔

ایک شام جب وہ دفتر سے لوٹی تو کمرے میں عابر موجود تھا۔ وہ بیڈ پر بیٹھا یادِ ماضی میں گم تھا۔ ملکہ کمرے میں داخل ہوئی۔ اس نے بڑے رسمی انداز میں عابر کی طرف دیکھے بنا ''ہیلو'' کہا اور ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ اس نے ایک نظر آئینے پر ڈالی۔ پھر اپنے بیگ سے ایک مخملی ڈبا نکالا، اسے کھول کر جائزہ لیا، پھر اس میں موجود ہیرے سے مزین لاکٹ کو نکالا اور آئینے میں دیکھتے ہوئے اپنی حسین گردن میں پہن لیا۔ اس کی گردن سج گئی۔

ابھی وہ گردن میں پڑے لاکٹ کو بڑی محویت سے دیکھ رہی تھی کہ عابر اس کے پیچھے آ کھڑا ہوا۔ ملکہ نے اسے دیکھنے کے باوجود نہ دیکھا۔ تب عابر نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور شکوہ بھرے انداز میں پوچھا۔ ''کہاں ہو تم؟''

''تمہارے سامنے۔'' ملکہ نے حسب معمول مختصر جواب دیا۔

PDF BY Manzoor

''آج کل تم میرے سامنے ہوتے ہوئے بھی سامنے نہیں ہوتیں۔''

''پھر کہاں ہوتی ہوں؟'' ملکہ نے اسے ترچھی نظروں سے دیکھا۔

''میں نہیں جانتا۔'' عابر کے لہجے میں دکھ سمٹ آیا تھا۔

''شادی کر کے پچھتا تو نہیں رہے؟'' ملکہ نے پوچھا۔

''پچھتا تو نہیں رہا البتہ پریشان ضرور ہوں۔''

''یاد ہے ایک دن جب آپ نے مجھ پر مرمٹنے کی بات کی تھی تو میں نے کیا کہا تھا؟''

''کیا کہا تھا؟'' اسے یاد تو آ گیا تھا لیکن وہ اس کی زبان سے سننا چاہتا تھا۔

''میں نے کہا تھا کہ مجھے جانے بغیر مرمٹنے..... یاد آیا۔'' ملکہ نے گلے سے لاکٹ نکال کر ڈبے میں رکھا۔

''ہاں یاد آیا۔'' اس نے ایک گہرا سانس لیا۔

''جواب میں آپ نے کہا تھا۔ اب کیا جاننا جیسی بھی ہو، میری ہو..... یاد آیا۔'' وہ مخملی ڈبا الماری میں رکھ کر واپس پلٹی۔

''ہاں یاد آیا۔'' عابر نے اقرار کیا۔

''تو پھر اب پریشانی کیسی۔ میں جیسی بھی ہوں، آپ کی ہوں۔'' ملکہ کسی خوشبو کی طرح اس پر چھاتے ہوئے بولی۔

چند لمحوں کیلئے عابر اپنا آپ بھول گیا۔ جب خوشبو کا جھونکا پاس سے گزر گیا تو وہ حواسوں میں آیا۔ اس نے ملکہ کو واش روم کی طرف بڑھتے دیکھا۔

''پتا نہیں ملکہ، مجھے جانے کیوں ایسا لگتا ہے کہ سب کچھ بدل رہا ہے۔''

''کچھ نہیں بدلا عابر۔ آپ پریشان نہ ہوں، یہ نوکری میں آپ کے لئے کر رہی ہوں، جس طرح چاہیں عیش کریں۔'' ملکہ نے واش روم جاتے جاتے پلٹ کر کہا اور پھر واش روم میں جا کر دروازہ کھٹاک سے بند کر لیا۔

عابر کو اس کی یہ بات عجیب سی لگی۔ اس پر یکدم منکشف ہوا کہ وہ کیا سے کیا ہو گیا تھا۔ اپنا گھر چھوڑ کر گھر داماد بنا اور اب وہ بیوی کی کمائی کھانے والا بن گیا تھا۔ اگر وہ خود نہیں بنا تو بنا دیا گیا تھا۔ اس کی محبت اپنی جگہ تھی۔ وہ نہیں بدلا تھا لیکن ملکہ وہ نہیں رہی تھی، ان کے درمیان کوئی آ گیا تھا۔ جب ملکہ واش روم سے کپڑے تبدیل کر کے فریش ہو کر باہر نکلی تو عابر نے سوال کیا۔ ''یہ لاکٹ تمہیں کس نے دیا؟''

''کیا آپ نہیں جانتے؟'' ملکہ نے بے نیازی سے پوچھا۔

''جانتا تو پوچھتا کیوں؟'' عابر بولا۔

''میرے ہاس نے۔'' ملکہ نے اسے بغور دیکھتے ہوئے کہا۔

''تم اس کی پرسنل سیکرٹری ہو..... یا پرسنل ہو گئی ہو؟'' عابر کے لہجے میں تلخی در آئی تھی۔

''مجھے نہیں معلوم کہ کیا بن گئی ہوں۔ اتنا جانتی ہوں کہ جو بنی ہوں، اپنی مرضی سے نہیں بنی ہوں۔'' ملکہ نے نظریں جھکاتے ہوئے کہا۔

عابر کو اس وقت بڑی مجبوری دکھائی دی، معصوم سی..... یکدم اسے اس پر پیار آ گیا۔ اس نے اسے قریب کرتے ہوئے پرامید لہجے میں کہا۔ ''پریشان مت ہو، سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

عابر کو قطعاً اندازہ نہیں تھا کہ اس گھر میں ہو کیا رہا تھا۔ ڈاکٹر نوشاد کیا کھیل کھیل رہا تھا۔ پورا گھر اس کے اشارے پر ناچتا تھا اور عابر کو خود معلوم نہ تھا کہ وہ کس کے ہاتھوں کٹھ پتلی بنا ہوا ہے۔

ایک دن عابر، ملکہ کے آفس کے نزدیک سے گزر رہا تھا تو یکدم خیال آیا کہ کیوں نہ ملکہ کا آفس دیکھتا چلے۔ چاہتا تو وہ اسے فون کر کے اپنی آمد کی اطلاع دے سکتا تھا لیکن اس نے خاموشی سے جانا مناسب سمجھا۔ ملکہ کو سرپرائز دینا چاہا۔

اس نے آفس میں داخل ہو کر استقبالیہ پر بیٹھی لڑکی سے ملکہ کے بارے میں پوچھا۔ اس لڑکی نے دفتر کے آخر میں اشارہ کرتے ہوئے بتایا کہ وہ اس کمرے میں ریٹا کے ساتھ بیٹھتی ہیں۔

عابر نے دروازے پر پہنچ کر ہلکی سی دستک دی اور ہینڈل دبا کر دروازہ کھول دیا۔ کمرے میں کوئی نہ تھا، ملکہ تھی نہ ریٹا۔ کمرے میں البتہ دو میزیں ضرور نظر آ رہی تھیں۔ چھوٹی میز خالی تھی، اس پر کچھ نہ تھا جبکہ بڑی میز پر فائلوں کے ساتھ ایک کمپیوٹر بھی موجود تھا۔ ان میزوں کے سامنے ایک اور دروازہ تھا۔

عابر سوچ میں پڑ گیا کہ کیا کرے۔ سوچا واپس جائے اور استقبالیہ پر بیٹھی لڑکی کو بتائے کہ کمرے میں کوئی نہیں ہے۔ پھر ایک لمحے کو خیال آیا کہ سامنے بند دروازے کے اندر کیوں نہ جھانک لے۔ ہو سکتا ہے وہ دونوں اندر ہوں۔ یہ سوچ کر وہ پورے اطمینان سے دروازے کی طرف بڑھا۔

جب ریٹا واش روم سے باہر نکلی تو اس نے کسی کو فرازیونس کے کمرے میں داخل ہوتے دیکھا۔ یہ دیکھ کر کہ اندر جانے والا کوئی مرد ہے، اس کے حواس شل ہو گئے۔ وہ جانتی تھی کہ دفتر کا کوئی آدمی اس کی اجازت کے بغیر اندر نہیں جا سکتا تھا۔ پھر یہ کون اندر گیا؟

اسے یہ بات بھی معلوم تھی کہ فرازیونس کے پاس اس وقت کون ہے؟ یہ کیا غضب ہو گیا تھا۔ وہ تیزی سے دروازے کی طرف لپکی۔ اتنی دیر میں دروازہ ''کھڑک'' کر کے بند ہو گیا تھا۔

عابر نے اندر داخل ہو کر جو منظر دیکھا، وہ کسی قیامت سے کم نہ تھا۔

☆.....☆.....☆

''کوّے کی یخنی'' پینے کے بعد مائی پنکھی پر خمار چھا جاتا تھا۔ چہرے پر سرخی آ جاتی، جھریاں مٹنے لگتیں۔ کوّے کو بگا کے حوالے کرنے کے بعد اس نے دروازہ بند کر کے پتھر لگایا اور چارپائی کی طرف بڑھی۔ انجو کمرے میں جا چکی تھی۔ اس نے کمرے کے دروازے کی طرف دیکھا۔ دیکھتی رہی اور کچھ سوچتی رہی۔ نشہ بڑھنے لگا تو وہ چارپائی پر لیٹ گئی۔ اس نے اپنے گلے میں پڑے چاندی کے تعویذ کو چھوا، کچھ بڑبڑائی اور تعویذ کو چھوڑ کر ایک ہاتھ آنکھوں پر رکھ لیا۔ کچھ ہی دیر میں اس پر گہری نیند طاری ہو گئی۔

جب اس کا نشہ ٹوٹا تو شام گہری ہو رہی تھی۔ نیم کی خشک پتیوں سے چارپائی اور اس کا جسم ڈھکا ہوا تھا۔ وہ ایک جھٹکے سے اٹھ بیٹھی۔ اسے یوں لگا جیسے دروازے پر کوئی ہے۔ وہ اٹھی، دروازے کی طرف بڑھی تو باہر سے آواز آئی۔ ''رانی جی..... دروازہ کھولو۔''

مائی پنکھی نے پتھر ہٹا کر دروازہ کھولا تو سامنے چکرم کو کھڑا پایا۔ وہ اسے دیکھتے ہی آگ بگولا ہو گئی۔ اس کے منہ سے غصے بھری آواز نکلی۔ ''تو.....''

چکرم کی آنکھ پر پٹی بندھی تھی۔ آنکھ پر رکھی ہوئی روئی خون آلود تھی اور وہ سخت کرب میں مبتلا تھا۔ مائی پنکھی کی آواز سن کر محض اندازے سے وہ اس کے قدموں میں جھکا اور اس کے پیر پکڑ کر بیٹھ گیا۔

''رانی جی..... مجھے معاف کر دو۔''

''ایسی ذلیل حرکت..... تو نے آخر کیا سوچ کر انجو کو اغوا کیا؟'' مائی پنکھی بولی۔

''جو کیا..... اس کی سزا پائی۔'' چکرم نے پاؤں پکڑے پکڑے کہا۔

''اب پھر یہاں کیوں آیا ہے؟'' مائی پنکھی نے پوچھا۔

''آنکھ سے خون جاری ہے اور شدید تکلیف میں مبتلا ہوں۔''

''تو پھر اسپتال جا، میرے پاس کیا لینے آیا ہے۔'' مائی پنکھی نے ایک جھٹکے سے اس سے اپنے پاؤں چھڑا لئے۔

''اسپتال سے ہی پٹی کروا کے آ رہا ہوں۔'' چکرم نے بتایا۔ ''رانی جی، مجھے معاف کر دو۔ میں اب کبھی ایسی حرکت نہیں کروں گا۔''

''آئندہ تو اس طرح کا کام نہیں کرے گا۔'' مائی پنکھی نے عہد لیا۔

''میں کبھی ایسا نہیں کروں گا۔'' اس نے فوراً عہد کیا۔ ''رانی جی! مجھے اس تکلیف سے نجات دلوا دیں۔''

''آنکھ سے پٹی ہٹا۔'' مائی پنکھی نے حکم دیا۔

چکرم اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے بہت احتیاط سے آنکھ سے پٹی ہٹائی۔ مائی پنکھی نے اس کی اکلوتی آنکھ پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔ ''شکر ادا کر کہ تیری آنکھ ضائع ہوئی ہے، ضائع نہیں ہوئی۔''

''ابھی تو مجھے کچھ نظر نہیں آ رہا۔'' چکرم نے بے بسی سے کہا۔

''تو ایسا کر کہ الو کی آنکھ کا سرمہ لگا لے، یہ خون فوراً رک جائے گا اور تیری بینائی بھی بحال ہو جائے گی۔'' مائی پنکھی کو جانے کیوں اس پر رحم آ گیا۔ ویسے کام اس نے ایسا کیا تھا کہ مائی پنکھی کو شدید غصہ تھا۔ اگر اس کی انجو کو کوئی نقصان پہنچ جاتا تو وہ کہیں کی نہ رہتی۔ انجو اس کے لئے بہت اہم تھی، اس کا قیمتی سرمایہ تھی۔ اس نے انجو کو بہت مشکلوں سے پایا تھا۔ ایک طرح سے انجو میں اس کی جان تھی اور یہ منحوس اس کی ''جان'' لے اڑا تھا۔

چکرم اس کی بات سن کر بے حد ممنون ہوا۔ وہ اندازے سے اس کے قدموں میں بیٹھ گیا۔ ''رانی جی، آپ بہت عظیم ہیں۔''

''اچھا چل، اب فوراً دفع ہو جا۔ پتا نہیں میں نے تجھے کیوں معاف کر دیا۔ بس اب بھاگ یہاں سے، کہیں ایسا نہ ہو کہ میں اپنا فیصلہ بدل دوں۔''

ابھی مائی پنکھی یہ کہہ ہی رہی تھی کہ اچانک کہیں سے انجو نمودار ہوئی۔ وہ اپنے اگلے دونوں پاؤں جھکا کر جست لگانے والی ہی تھی کہ مائی پنکھی زور سے چیخی۔ ''نہیں انجو.....''

PDF BY Manzoor

اس وقت تک وہ زقند بھر چکی تھی۔اب خود کو روکنا اس کے اختیار میں نہ رہا تھا۔البتہ اتنا ضرور ہوا کہ کالے منہ کی سفید بلی نے اس کارروائی سے خود کو روک لیا جو وہ کرنے والی تھی۔اس کا نشانہ چکرم کی خون بہاتی آنکھ تھی۔وہ اس آنکھ کو باہر نکال دینا چاہتی تھی۔یہ کام وہ چکرم کے گھر پر ہی انجام دے دینا چاہتی تھی لیکن مائی پنکھی کے حکم نے اسے ایسا نہ کرنے دیا۔اور اب بھی مائی پنکھی کی تنبیہہ آڑے آ گئی تھی۔انتقام کی حسرت اس کے دل میں رہ گئی تھی۔

انجو، چکرم کے سر پر گری تھی۔اگر وہ بجلی ہوتی تو چکرم جل کر راکھ ہو جاتا لیکن وہ بجلی نہ تھی بلی تھی،لہٰذا کھسیا کر اس کے بال نوچ کر رہ گئی۔پھر اس نے اس کے سر سے چھلانگ لگائی اور دوڑتی ہوئی کمرے میں چلی گئی۔

''حرام کی اولاد۔تیری قسمت اچھی تھی کہ تو بچ گیا۔''مائی پنکھی غصے بھری آواز میں بولی۔''اس سے پہلے کہ وہ پھر پلٹ کر آئے تو یہاں سے دفع ہو جا۔''

چکرم خوفزدہ ہو کر فوراً کھڑا ہو گیا اور ہاتھ پھیلا کر دروازہ ڈھونڈتا ہوا باہر نکل گیا۔اس کے جانے کے بعد مائی پنکھی نے گھر کا دروازہ بند کیا۔کواڑ کے پیچھے پتھر رکھا اور صحن میں پڑی چارپائی پر آ کر بیٹھ گئی اور زور سے آواز لگائی۔''انجو۔''

اندر کمرے میں فرش پر لیٹی ہوئی انجو نے مائی پنکھی کی آواز سنی لیکن وہ ٹس سے مس نہ ہوئی۔مائی پنکھی کی ایک آواز پر جب انجو باہر نہ آئی تو اس کا ماتھا ٹھنکا۔اس نے پھر آواز لگائی۔''انجو۔باہر آ۔''

انجو نے اس کی آواز سنی لیکن طرح دے گئی۔اس نے اپنے اگلے پاؤں پسارے اور آنکھیں موند لیں۔

مائی پنکھی نے کچھ دیر اس کے آنے کا انتظار کیا۔جب وہ باہر نہ آئی تو اسے یہ اندازہ کرنے میں دیر نہ لگی تھی کہ انجو روٹھ گئی ہے۔

مائی پنکھی ایک جھٹکے سے چارپائی سے اٹھی اور تیز قدموں سے کمرے میں چلی گئی۔اس کمرے میں ایک بیڈ پڑا تھا۔ایک لوہے کی الماری تھی۔اس کے علاوہ کچھ نہ تھا۔انجو الماری کے سامنے فرش پر پاؤں پھیلائے لیٹی تھی۔اس کی سرخ آنکھیں بند تھیں۔

''انجو تجھے کیا ہوا؟''مائی پنکھی، انجو کے پاس زمین پر بیٹھ گئی۔

انجو نے اس کی بات سنی لیکن وہ ہلی تک نہیں اور نہ ہی اس نے آنکھیں کھولیں۔

مائی پنکھی نے اسے بڑے پیار اور احتیاط سے زمین سے اٹھایا اور بیڈ پر لٹا دیا اور اپنے گلے میں پڑے تعویذ کو گلے سے نکالا اور کچھ پڑھتے ہوئے اس کے جسم پر پھیرا اور پھر پیٹھ موڑ کر کھڑی ہو گئی۔

کچھ دیر کے بعد مائی پنکھی کے کانوں میں رونے سسکنے کی آواز آئی۔اس نے پلٹ کر دیکھا تو انجو کو روتے ہوئے پایا۔وہ اوندھی لیٹی ہوئی تکیے میں منہ دیئے سسک رہی تھی۔

PDF BY Manzoor

PDF BY Manzoor

دیا۔

''یہ تو بہت برا ہوا۔'' چاندنی افسردہ ہو کر بولی۔

''ہاں۔امی۔وہ بے قصور مارا گیا۔''

''داشاد یونس کو آخر کس بات پر غصہ آ گیا۔'' چاندنی نے سوال کیا۔

''ابو کی غلط بیانی پر.....شادی شدہ ہو کر کنواری کیوں ظاہر کیا۔'' ملکہ نے بتایا۔

''تو فکر مت کر۔ڈاکٹر صاحب کے پولیس کے اعلیٰ افسران سے تعلقات ہیں۔وہ کھڑے کھڑے عابر کو تھانے سے لے آئیں گے۔'' چاندنی نے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔''میں انہیں جا کر ساری بات بتاتی ہوں۔ٹھیک ہے۔''

''جی امی۔'' ملکہ نے کہا۔

جب چاندنی ڈرائنگ روم میں پہنچی تو مہمان جا چکا تھا۔اس نے ڈاکٹر نوشاد کو وہیں اپنے پاس بٹھا لیا اور جو کچھ اپنی بیٹی سے سنا تھا، وہ ڈاکٹر نوشاد کو بتا دیا۔

''اچھا۔'' ساری بات سن کر ڈاکٹر نوشاد کے جسم میں بجلی سی بھر گئی۔اس نے میز پر رکھا ہوا موبائل اٹھایا اور کسی کو فون کرنے لگا۔

جب وہ متعلقہ تھانے پہنچا تو ایس ایچ او اپنے کمرے میں موجود تھا۔ڈاکٹر نوشاد کو بے دھڑک کمرے میں داخل ہوتے دیکھ کر ایس ایچ او ناصر کو یہ اندازہ لگانے میں دیر نہ لگی کہ وہ کوئی اونچی چیز ہے،اس لیے اس نے ڈاکٹر نوشاد کے چہرے پر نظر جماتے ہوئے کہا۔''جی فرمایئے۔''

ڈاکٹر نوشاد جو کمرے میں داخل ہوتے ہی موبائل پر مصروف ہو گیا تھا،اس نے ایس ایچ او کی 'جی فرمایئے' پر قطعاً توجہ نہ دی۔کال ملنے پر اس نے بس اتنا کہا۔''سر،میں ایس ایچ او صاحب کے کمرے میں آ گیا ہوں۔''

اُدھر سے کہا گیا۔''انہیں موبائل دیں۔''

''جی اچھا۔'' ڈاکٹر نوشاد نے موبائل ایس ایچ او ناصر کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔''سر.....ایس پی شفیق راجپوت آپ سے مخاطب ہونا چاہتے ہیں۔''

شفیق راجپوت کا نام سن کر ناصر کی جان نکل گئی۔ابھی وہ سوچ ہی رہا تھا کہ اس سے کہاں غلطی ہوئی ہے۔موبائل کان سے لگاتے ہی رعب دار آواز سنائی دی۔''ایس ایچ او ناصر.....مجھے فون کریں فوراً۔''

ناصر نے اپنی لینڈ لائن سے شفیق راجپوت کا نمبر ڈائل کیا۔اب کسی جعلی کال کی گنجائش نہیں رہی تھی۔شفیق چاہتا تو ڈاکٹر نوشاد کے موبائل کے ذریعے احکامات دے سکتا تھا لیکن وہ چاہتا تھا کہ ناصر کسی شک وشبہ میں مبتلا نہ رہے اور شبہ تاخیر کا سبب نہ بنے۔

''جی سر.....حکم۔'' ایس ایچ او ناصر نے لائن ملتے ہی انتہائی مودبانہ لہجے میں کہا۔

''ناصر صاحب.....یہ بتائیں کسی شوہر کا اپنی بیوی سے اس کے دفتر جا کر ملنا کیا قابلِ تعزیر ہے۔''شفیق راجپوت نے بڑے پُرسکون انداز میں سوال کیا۔

''ہرگز نہیں سر۔'' ناصر ابھی تک اس سوال کی تہہ تک نہ پہنچ سکا تھا۔

''آپ نے کسی عابر نامی لڑکے کو گرفتار کیا ہے۔''

''جی سر۔'' ناصر نے مری ہوئی آواز میں کہا۔اب وہ معاملے کی تہہ تک پہنچ گیا تھا۔

''بتانا پسند کریں گے کس جرم میں؟''شفیق راجپوت نے پوچھا۔

''سر وہ.....سر وہ۔'' کوئی اور ہوتا تو وہ بے دھڑک جواب دیتا۔''اقدامِ قتل کے جرم میں۔'' لیکن یہاں سامنے ایس پی تھا۔بھلا دائی سے بھی کبھی پیٹ چھپا ہے،پھر چھپانے کا فائدہ۔

''میں بتا دیتا ہوں۔تم نے اقدامِ قتل کے الزام میں اسے گرفتار کیا ہے اور آلۂ قتل بھی برآمد کروا دیا ہے،اور یہ کام تم نے داشاد یونس جیسے عیاش شخص کی خواہش پر کیا ہے۔اب میں تمہیں حکم دیتا ہوں کہ اس معصوم لڑکے کو فی الفور چھوڑ دو اور جو رقم تم نے داشاد یونس سے لی ہے،وہ جا کر اس کے منہ پر مار آؤ،اور اسے میری طرف سے پیغام دینا کہ وہ دفتر میں بیٹھ کر جو کچھ کرتا ہے،ہمیں اس کا اچھی طرح اندازہ ہے۔بہتر ہو گا کہ وہ عیاشی کا ٹھکانہ بدل لے ورنہ میڈیا کے ساتھ چھاپہ پڑواتے مجھے دیر نہ لگے گی۔ایس ایچ او ناصر،کیا تم نے میری بات سمجھ لی۔''شفیق راجپوت نے جواب کا موقع فراہم کیا۔

''جی سر.....میں سمجھ گیا،اچھی طرح سمجھ گیا۔آپ بے فکر ہو جائیں۔'' ناصر نے جلدی سے کہا۔

''اور دیکھو۔اس لڑکے سے معافی مانگنا ہرگز نہ بھولنا۔تم نے اس معصوم لڑکے کے ساتھ بہت ظلم کیا ہے۔اس وقت سے ڈرو جب تمہارے بیٹے کے ساتھ کوئی ایسا ہی ظلم کرے.....اوکے۔''شفیق راجپوت نے فون بند کر دیا۔

ریسیور رکھ کر ناصر نے گہرا اور ٹھنڈا سانس لیا۔طوفان محض گرج چمک کے ساتھ گزر گیا تھا۔اس نے برس کر کوئی نقصان نہیں پہنچایا تھا۔وہ فوراً ایکشن میں آ گیا۔پہلے اس نے ڈاکٹر نوشاد سے پوچھا۔''محترم وہ لڑکا آپ کا کیا ہے؟ کیا بیٹا۔''

''وہ میرا بیٹے جیسا داماد ہے۔''

''پہلے تو میں آپ سے معذرت چاہتا ہوں۔میں کسی غلط فہمی کا شکار ہو گیا تھا۔میں آپ کے داماد سے بھی معافی چاہوں گا۔'' یہ کہہ کر وہ اٹھا۔''میں اسے لے کر آتا ہوں۔''

عابر کو آزاد ہونے میں پانچ منٹ سے زیادہ نہ لگے۔ڈاکٹر نوشاد، عابر کو لے کر تھانے سے نکل آیا۔عابر نے دفتر میں جو کچھ دیکھ لیا تھا اور اس کے بعد اس کے ساتھ جو کچھ ہوا تھا، وہ کسی غیرت مند انسان کے لیے ڈوب مرنے کے مترادف تھا۔ڈاکٹر نوشاد کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ عابر سے کیا کہے اور کس طرح کہے۔

گاڑی کے قریب پہنچ کر ڈاکٹر نوشاد نے فرنٹ سیٹ کا دروازہ کھولا اور اپنے لہجے میں سارے جہاں کی محبت بھر کر بولا۔''آؤ بیٹا.....گھر چلیں۔''

جواب میں عابر نے دوٹوک انداز میں جو کچھ کہا، وہ ڈاکٹر نوشاد کے ہوش اُڑا دینے کے لیے کافی تھا۔

☆.....☆.....☆

انارہ کے اندر جاتے ہی مائی پنکھی اٹھ کر بیٹھ گئی۔رات میں وہ بالکل نہ سوتی تھی۔سونے کا وقت صبح کا ہی تھا۔''کوے کی بیٹھنی'' پی کر اس پر ایسی مدہوشی طاری ہوتی تھی کہ وہ خود کو روکنا چاہتی تو روک نہ سکتی تھی۔اس پر گہری نیند کا غلبہ ہوتا،نشہ طاری ہوتا یا وہ بے ہوش ہو جاتی تھی۔کچھ پتا نہ تھا۔بس وہ ''بیٹھنی'' پی کر دو ڈھائی گھنٹے کے لیے دنیا سے کنارہ کر جاتی، کسی اور ہی جہاں میں پہنچ جاتی۔

اس وقت رات کے ڈھائی بجے تھے۔صحن میں تاریکی چھائی تھی۔نیم کے درخت پر بھی خاموشی مسلط تھی۔مائی پنکھی نے چالیس پھیرے اپنے صحن کے لگائے۔وہ پھیروں کے دوران کچھ پڑھتی جاتی تھی۔ایک چکر پورا کر کے وہ آسمان کی طرف منہ اٹھاتی اور زور سے آواز لگاتی۔

''آبگا.....!'' یہ نعرہ بلند کر کے وہ پھر چکر کاٹنے میں مشغول ہو جاتی۔

جب چالیس پھیرے مکمل ہو گئے تو اس نے صحن میں پڑی ہوئی کھڑی چارپائی کو اٹھا کر کھڑا کیا اور پھر اسے دیوار سے ٹکا کر بیچ صحن میں لائی اور کچھ پڑھتے ہوئے چارپائی اینٹوں کے فرش پر الٹ دی۔اب چارپائی کے پائے اوپر ہو گئے تھے اور اوپر کا حصہ زمین سے لگ گیا تھا۔

مائی پنکھی نے الٹی پڑی چارپائی کے گرد چکر لگانے شروع کیے۔وہ کچھ پڑھتی جاتی اور چکر لگاتی جاتی تھی۔ہر چکر کے اختتام پر نعرہ مستانہ بلند کرتی۔''آبگا۔''

سات چکر پورے کرنے کے بعد وہ الٹی چارپائی پر اس طرح بیٹھ گئی کہ اس کے دونوں ہاتھ پائنتی کے پایوں پر تھے۔

دونوں پائے پکڑنے کے بعد اس نے زور زور سے جھومنا شروع کیا۔وہ اب ایک خاص انداز سے جھومتی جاتی تھی اور کچھ بولتے ہوئے دونوں ہاتھوں سے ایک پائے کو پکڑتی اور پھر زوردار آواز میں پکارتی۔''آبگا۔''

گیارہ بار یہ عمل دُہرانے کے بعد مائی پنکھی یوگا کے انداز میں بیٹھ گئی۔اس نے آنکھیں بند کر لیں۔

کچھ دیر گزری تھی کہ اسے چارپائی لرزتی ہوئی محسوس ہوئی۔

پھر اسے ایک باریک سی آواز سنائی دی۔''لے آ گیا بگا۔''(جاری ہے)

PDF BY Manzoor

یہ سنتے ہی مائی پنکھی کی رگ رگ میں خوشی سرایت کرگئی۔ وہ خوشی سے سرشار ہوکر بولی۔ ''تو آ گیا بگا..... تیری بڑی کرپا۔''

مائی پنکھی کے سامنے سفید چمکیلا دھواں نمودار ہورہا تھا۔ اس دھویں نے ایک انسانی ہیولے کی شکل اختیار کی اور پھر منجمد ہوگیا۔

''اب تو الٹی کھاٹ کا پاٹھ پڑھے گی تو میں کیسے رکوں گا۔ مجھے آنا ہی ہوگا۔'' سفید چمکیلے دھویں کے منجمد ہیولے سے آواز آئی۔ وہ اب چارپائی کی پٹی کے نزدیک تھا۔ لگ رہا تھا جیسے وہ کھڑا ہو۔

مائی پنکھی نے چارپائی کی پٹی پر اپنا سر رکھ دیا اور اپنے دونوں ہاتھ آگے بڑھا دیئے جیسے وہ ماتھا ٹیکتے ہوئے اس کے چرن چھونا چاہتی ہو۔

''ہاں، پنکھی بول..... کیوں بلایا؟'' سفید چمکیلے ہیولے سے آواز آئی۔

''بس تجھے دیکھنے کو جی چاہ رہا تھا۔'' مائی پنکھی نے ہنس کر کہا۔

''عورت پن چھوڑ، سیدھی صاف بات کر، چل جلدی بول۔'' بگا ناراض ہوا۔

''میں اس انجو کا کیا کروں؟'' مائی پنکھی فوراً مقصد پر آ گئی۔

''کیوں۔ کیا ہوا؟'' بگا نے پوچھا۔

''اب تو وہ روز ہی پوچھنے لگی ہے اپنے بارے میں۔ میں کب تک اسے اِدھر اُدھر کی باتیں کر کے بہلاؤں۔ بگا سچ تو یہ ہے کہ مجھے اس پر ترس آتا ہے۔ اس بے چاری کو کبھی سکھ ملا ہی نہیں۔'' مائی پنکھی نے اداس لہجے میں کہا۔

''دیکھ پنکھی۔ ہر منش کا سکھ الگ ہوتا ہے۔ ہم آگ میں خوش رہتے ہیں، کوئی پانی میں خوش رہتا ہے، کسی کو ہوا چاہئے، کوئی دولت پا کر پرسن (خوش) ہوتا اور کوئی سب کچھ کھو کر اطمینان پاتا ہے، تُو اس پر ترس نہ کھا، وہ ہمارے لئے بہت قیمتی ہے۔ تو اچھی طرح جانتی ہے کہ کتنے جتن سے تو نے اسے حاصل کیا ہے۔'' بگا نے ماضی یاد دلایا۔

''بگا..... وہ میری منزل نہیں، مجھے آگے جانا ہے۔'' مائی پنکھی نے اپنا عزم ظاہر کیا۔

''پھر کیا چاہتی ہے تو۔ کیا اسے آزاد کرنا چاہتی ہے؟'' منجمد چمکیلے دھویں سے آواز آئی۔

''ہاں، جی تو یہی چاہتا ہے۔'' مائی پنکھی نے دل میں چھپی بات ظاہر کی۔

''ابھی اس کا وقت نہیں آیا تو خود کو سنبھال، اس پر مہربان نہ ہو۔'' بگا نے تنبیہ کی۔

''بگا۔ اتنی اجازت تو دے کہ میں اس کا جیون اس پر کھول دوں۔''

''مجھ سے اجازت لے رہی ہے جبکہ تو اسے ایک گھر دکھا چکی ہے۔'' بگا نے کسی قدر غصے سے کہا۔

''ہاں، مجھ سے غلطی ہوئی۔ میرے دل میں دیا آ گئی تھی۔''

''دیا، رحم، معافی۔ یہ اور اس طرح کے شبد ہمارے ہاں ممنوع ہیں۔ کیا تو نہیں جانتی ہم آگ والے ہیں۔ یہ لفظ ہمیں زیب نہیں دیتے۔ گھوڑے کو گھاس سے یاری نہیں کرنا چاہئے۔'' بگا نے اپنی باریک آواز میں اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

''بگا..... تو جانتا ہے کہ میں کیسی ہوں۔'' مائی پنکھی بولی۔

''اسی لئے بگا تجھے سمجھا رہا ہے کہ ایسی نہ بن کہ تو کسی مشکل میں پھنس جائے۔'' بگا نے کہا۔ ''چل تیری خوشی اگر اس میں ہے کہ اس کا جیون اس پر کھول دے، تو کھول دے۔ تجھے اجازت دیتا ہوں لیکن اسے آزاد کرنے کی غلطی نہ کرنا۔ پھر کہتا ہوں کہ اس کا وقت نہیں آیا، جب آئے گا تو بتا دوں گا۔ ٹھیک ہے، کوئی اور بات یا میں چلوں؟''

''ٹھیک ہے بگا تو جا، تیری مہربانی کہ تو آیا۔'' مائی پنکھی نے ایک مرتبہ پھر اس کے سامنے ماتھا ٹیک کر چرن چھوئے۔

اسی وقت سفید چمکیلے ہیولے میں حرکت ہوئی اور پھر وہ دھیرے دھیرے معدوم ہوتا گیا۔

اور جب وہ مکمل طور پر غائب ہوگیا تو مائی پنکھی پُرمسرت انداز میں الٹی چارپائی سے اٹھی، اسے سیدھا کر کے دیوار کے ساتھ لگایا اور پُرسکون انداز میں لیٹ گئی۔ وہ خوش تھی کہ بگا نے اس کی غلطی کو نظر انداز کر دیا تھا۔ اب وہ پورے اطمینان سے انجو کا جیون اس پر کھول سکتی تھی۔

انجو کا خیال آتے ہی اس نے گردن موڑ کر کمرے کے دروازے کی طرف دیکھا تو وہ اسے دکھائی نہ دی۔ اس نے سوچا وہ اندر سو رہی ہوگی۔

☆.....☆.....☆

عابر گاڑی کا کھلا دروازہ بند کر کے فیصلہ کن انداز میں بولا۔ ''انکل، میں اب آپ کے ساتھ نہیں جاؤں گا۔''

''بیٹا۔ ہم سے غلطی ہوگئی ہے، ہمیں معاف کردو۔'' ڈاکٹر نوشاد نے نوٹنکی کا آغاز کیا۔

''مجھے بیٹا نہ کہیں، کوئی باپ اپنے بیٹے کے ساتھ ایسا سلوک نہیں کرتا جیسا آپ نے کیا۔'' عابر بڑے مستحکم انداز میں بولا۔ ''میں اب یہ بات اچھی طرح جان گیا ہوں کہ آپ سے غلطی نہیں ہوئی، آپ نے جو کچھ کیا، جان بوجھ کر اور سوچ سمجھ کر کیا۔''

''بیٹا۔ غصہ مت کرو۔'' ڈاکٹر نوشاد نے خوشامدانہ لہجے میں کہا۔ ''ہمیں معاف کردو، میں تمہارے پاؤں پڑتا ہوں۔'' یہ کہتے ہوئے وہ اس کے قدموں کی طرف جھکا۔

''چھوڑیں یہ ڈرامہ بازی۔'' عابر یکدم پیچھے ہٹتے ہوئے بولا۔ ''جائیں اپنی بیٹی کیلئے کوئی نیا باس تلاش کرلیں۔ ہونا تو یہ چاہئے کہ میں سزا کے طور پر ملکہ کو طلاق نہ دوں لیکن جانتا ہوں کہ اس سے آپ کی صحت پر کوئی اثر نہ پڑے گا۔ عزت میری خراب ہوگی۔ میرے حق میں بہتر یہی ہے کہ میں اسے یہیں کھڑے کھڑے آزاد کردوں۔ اور اپنی راہ لوں۔''

''نہیں بیٹا، ایسا مت کرنا۔'' ڈاکٹر نوشاد نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روکتے ہوئے کہا۔ ''میں جانتا ہوں کہ وہ تم سے شدید محبت کرتی ہے۔ ٹھہرو میں تمہاری اس سے بات کراتا ہوں۔''

ڈاکٹر نوشاد نے عابر کے جواب کا انتظار نہ کیا۔ جیب سے موبائل نکال کر کھٹا کھٹ نمبر ملایا اور فون اٹھائے جانے کا بے چینی سے انتظار کرنے لگا۔

جیسے ہی ملکہ نے فون اٹھایا۔ ڈاکٹر نوشاد نے بڑی تیزی سے کہا۔ ''ملکہ..... عابر صاحب کو سمجھاؤ، یہ تمہیں طلاق دے رہے ہیں۔''

''کہاں ہیں آپ لوگ؟'' ملکہ نے پوچھا۔

''ہم لوگ تھانے کے باہر کھڑے ہیں۔'' ڈاکٹر نوشاد نے بتایا۔

''گھر آئیں۔'' ملکہ نے بے قراری سے کہا۔

''یہ گھر آنے کے لئے تیار نہیں۔ تمہیں طلاق دے کر چلے جانا چاہتے ہیں۔ ملکہ ان سے بات کرو۔'' ڈاکٹر نوشاد کی پریشانی دیدنی تھی۔

ڈاکٹر نوشاد نے ملکہ کا جواب سنے بغیر موبائل عابر کی طرف بڑھا دیا۔ عابر نے ایک نظر موبائل کو دیکھا۔ وہ اب کسی سے بات کرنے کے لئے تیار نہ تھا۔ وہ کیا بات کرتا۔ اب بات کرنے کو رہ کیا گیا تھا۔ جو چھپا تھا، وہ سامنے آ گیا تھا۔ ہر چیز صاف اور واضح ہوگئی تھی۔ اب فیصلے کا وقت تھا۔

PDF BY Manzoor

''پلیز عابر صاحب۔'' ڈاکٹر نوشاد نے بڑی عاجزی سے کہا اور موبائل دوبارہ اس کے ہاتھ میں دینے کی کوشش کی۔

نہ چاہتے ہوئے بھی عابر نے موبائل فون ہاتھ میں لے لیا۔ چند لمحے اس نے اپنے اندر دہکتے طوفان کو قابو میں کرنے میں لگائے۔ جب اس نے ''ہیلو'' کہا تو اسے خود اپنی آواز اجنبی محسوس ہوئی۔

''عابر۔ گھر آجائیں، ہم یہاں بیٹھ کر بات کرلیں گے۔'' ملکہ نے اس کی آواز سنتے ہی کہا۔

''گھر، کون سا گھر؟'' عابر کے لہجے میں غصے سے زیادہ دکھ تھا۔

''عابر۔ آپ کا اپنا گھر، جہاں آپ رہتے ہیں۔'' ملکہ بولی۔

''میرا کوئی گھر نہیں۔ عورت کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس کا کوئی گھر نہیں ہوتا۔ میں مرد ہو کر یہ بات کہہ رہا ہوں اور سچ کہہ رہا ہوں کہ میرا کوئی گھر نہیں۔'' عابر جانے کیا کہہ رہا تھا، خود اس کی سمجھ میں بھی نہیں آرہا تھا۔

''عابر میرے پاس آجائیں۔ میں وہ ملکہ ہوں جس کے سر پر آپ نے محبت کا تاج رکھا تھا۔''

''اب وہ ملکہ رہی نہ تاج رہا۔ میں، میں نہ رہا۔ تو تو نہ رہی۔ سب تباہ ہوگیا۔'' عابر کے دل سے دھواں اٹھ رہا تھا۔

''عابر، میں وہ ہوں جس پر آپ مرمٹے تھے۔''

''غلطی انسان سے ہی ہوتی ہے، مجھ سے بھی ہوگئی۔'' عابر کی زبان پر سچائی تھی۔

''عابر مجھے طلاق نہ دینا، میرا ساتھ نہ چھوڑنا، میں تنہا ہو جاؤں گی۔'' ملکہ کی آواز میں التجا تھی۔

''میں تمہیں خوشی سے طلاق نہیں دوں گا۔ میری تنہائی کا تمہیں اندازہ نہیں۔ پر اب یہ درد جدائی سہنا ہی ہوگا۔'' عابر بولا۔ ''کاش! میں تمہیں جان لیتا۔''

''عابر گھر تو آئیں۔ میں اپنے بارے میں سب کچھ بتادوں گی، کچھ نہیں چھپاؤں گی۔'' ملکہ نے ایسی بات کہہ دی کہ عابر کچھ سوچنے پر مجبور ہوگیا۔

اس نے فیصلہ کیا کہ جو اس نے دل میں ٹھان لی ہے، وہ اپنی جگہ اٹل ہے لیکن اس کی بات سننے میں کیا حرج ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ زندگی بھر اسی پچھتاوے میں مبتلا رہے کہ اس کی بات سنے بغیر اس سے علیحدگی اختیار کرلی۔

''ملکہ ٹھیک ہے، میں آتا ہوں۔ لیکن اتنا یاد رکھنا کہ کوئی بات جھوٹ نہ ہو، اب میری برداشت آخری حدوں تک پہنچ چکی ہے۔'' عابر نے موبائل آف کیا اور گاڑی کا پچھلا دروازہ کھول کر بیٹھ گیا۔ وہ اس مکروہ شخص کے برابر بیٹھنا نہیں چاہتا تھا۔

عابر کو گاڑی میں بیٹھتے دیکھ کر ڈاکٹر نوشاد کی باچھیں کھل گئیں۔ وہ خوش تھا کہ اس کی بیٹی نے ''کام'' دکھادیا تھا۔ لیکن اسے یہ اندازہ نہ تھا کہ اس کی بیٹی کام دکھانے نہیں بلکہ اس کا کام تمام کرنے جارہی ہے۔

عابر نے راستے میں ڈاکٹر نوشاد سے کوئی بات نہ کی۔ وہ خاموش بیٹھا رہا۔

جب عابر، ڈاکٹر نوشاد کے ساتھ گھر میں داخل ہوا تو یوں لگا جیسے کسی کی موت ہوگئی ہو۔ لاؤنج میں کوئی نہ تھا۔ ٹی وی بند تھا۔ شائستہ کے کمرے سے ڈیک کی آواز نہیں آرہی تھی۔

ملکہ اپنے کمرے میں تھی۔ کمرے کا دروازہ کھلا تھا۔ لیکن جس کے انتظار میں یہ دروازہ کھلا تھا، وہ اندر نہ آیا۔

جب عابر کو ٹی وی لاؤنج میں ملکہ نظر نہ آئی تو اس نے ڈرائنگ روم کا رخ کیا اور ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔ وہ اب اس گھر کا مکیں نہ تھا، مہمان تھا۔ ڈاکٹر نوشاد نے کوشش کی کہ وہ ملکہ کے پاس چلا جائے لیکن وہ ٹس سے مس نہ ہوا۔ مجبوراً ڈاکٹر نوشاد کو ملکہ کو ڈرائنگ روم میں بھیجنا پڑا۔

ملکہ ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی تو عابر نے منہ پھیر لیا۔ اس نے دروازہ بند کیا، مقفل کیا اور اس کے برابر بیٹھنے کے بجائے سامنے والے صوفے پر نشست اختیار کی۔

''آپ کا منہ پھیرنا بجا۔ میں اسی قابل ہوں کہ مجھ سے نفرت کی جائے۔ میں جانتی ہوں کہ آپ کے برابر بیٹھنے کے قابل نہیں رہی، اس لئے آپ کے برابر بیٹھنے کی جرأت نہ کرسکی۔ میں سزاوار ہوں، گناہ گار ہوں، ناقابل معافی ہوں۔'' ملکہ کی آواز میں شدید دکھ بول رہا تھا۔ یہ جانے بغیر کہ عابر پر اس کی بات کا کیا اثر ہو رہا ہے، وہ اپنی دُھن میں کہے جارہی تھی۔ ''عابر، کاش آپ نے مجھ سے شادی نہ کی ہوتی۔ کاش آپ نے میرے لئے اپنے والدین، اپنا گھر نہ چھوڑا ہوتا۔ آج میں جس احساس جرم میں مبتلا ہوں، وہ نہ ہوتی۔ میں.....''

''ملکہ۔ تم نے مجھے جس مقصد کے لئے بلایا ہے، وہ بیان کرو۔ اگر تمہارے پاس بتانے کو کچھ نہیں ہے تو پھر میں چلتا ہوں۔ میرے پاس وقت نہیں ہے۔'' عابر نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔

''سنو عابر، پھر..... میں اپنے اور اس گھر کے لوگوں کے بارے میں جو کچھ جانتی ہوں، وہ سب بتائے دیتی ہوں۔ عابر! پہلے تو یہ جان لو کہ ڈاکٹر نوشاد میرا سگا باپ نہیں۔''

عابر کو یہ سن کر دھچکا سا لگا لیکن وہ بولا کچھ نہیں۔

''ڈاکٹر نوشاد میرا ہی کیا، ہم سات بہنوں میں سے کسی کا بھی باپ نہیں۔ ہمارے معاشرے میں مرد تو چار شادیاں کرلیتا ہے لیکن کبھی یہ نہیں سنا ہوگا کہ کسی عورت نے چار شادیاں کی ہوں۔ میری ماں چاندنی نے ریکارڈ توڑا۔ اس نے چار شادیاں کیں۔ ڈاکٹر نوشاد میری ماں کا چوتھا شوہر ہے۔'' ملکہ نے آج ہر وہ بات آشکار کرنے کی ٹھان لی تھی جو اس کے دل میں محفوظ تھی۔ ''میری ماں کا تعلق غریب گھرانے سے تھا۔ باپ سبزی فروش تھا۔ ٹھیلے پر گلی محلوں میں سبزی بیچا کرتا تھا۔ ہم بہنوں کی طرح ماں کی بھی سات بہنیں تھیں۔ ان بہنوں میں سب سے خوبصورت ماں تھی۔ گھر میں اکثر فاقے ہوتے لیکن میری ماں کو بننے سنورنے کا بے انتہا شوق تھا۔ پیٹ بھر کھانے کو ہو نہ ہو، اچھے کپڑے چاہئیں۔ فلموں اور ٹی وی ڈراموں سے بے پناہ لگاؤ تھا۔ محلے کے کھاتے پیتے گھرانوں کی لڑکیوں سے دوستی گانٹھ رکھی تھی۔ ان کے گھروں میں گھسی رہتی۔ وی سی آر پر فلمیں دیکھی جاتیں۔ فلمیں اور ٹی وی ڈرامے دیکھ کر خواب بُنے جاتے۔ میری ماں سوتی تو محلوں کے خواب دیکھتی۔ فیشن کی ماری ماں نے میٹرک تک پہنچتے پہنچتے محلے کے کئی لڑکوں سے ''پرچے بازی'' کرڈالی تھی۔ ہر لڑکا ان پر جان چھڑکتا تھا اور سمجھتا تھا کہ یہ میری ہے لیکن وہ کسی کی نہ تھی۔ کالج میں قدم رکھتے ہی ماں نے چھکا لگایا اور ایک گاڑی والے کو اپنے ''دام الفت'' میں پھنسالیا۔ وہ لڑکا اپنی بہن کو لینے آیا تھا۔ میری ماں نے اس لڑکی سے، جس سے تھوڑی بہت دوستی تھی، از خود لفٹ مانگ لی۔ بس پھر یہ تھوڑی سی لفٹ اس لڑکے کے لئے ''وبال جان'' بن گئی۔ ماں اس طرح اس کے گلے کا ہار بنی کہ اسے شادی کرتے ہی بنی۔ یہ میری ماں کا پہلا شوہر تھا۔ اس شوہر سے شائستہ، فاخرہ اور ماجدہ نے جنم لیا۔ پھر ایک کوچنگ سینٹر کے پروفیسر سے راہ و رسم بڑھی، اتنی کہ پہلے شوہر سے خلع لے کر میری ماں نے پروفیسر سے شادی کرلی۔ میں پروفیسر صاحب کی بیٹی ہوں۔ پروفیسر صاحب کو میری فیشن زدہ ماں کی آزاد زندگی پسند نہ آئی۔ انہوں نے طلاق دے کر ماں سے جان چھڑائی۔ پھر تیسرے شوہر ماں کی زندگی میں آئے اور تین بیٹیاں دے کر زیادہ عرصہ زندہ نہ رہ سکے۔ تیسرے شوہر کی موجودگی میں ہی ڈاکٹر نوشاد سے ماں کی شناسائی ہوچکی تھی۔ چلتا پرزہ ڈاکٹر نوشاد نے ماں کو جانے کیا خواب دکھائے کہ ماں نے تیسرے شوہر سے طلاق کا مطالبہ کردیا۔ وہ کسی سیاسی پارٹی کا اثر ورسوخ والا بندہ تھا، اس نے طلاق دینے سے صاف انکار کردیا۔ اسے ہم چار بیٹیاں نوٹوں کی صورت میں نظر آتی تھیں۔ وہ ہم سے ہاتھ دھونے کو تیار نہ تھا۔ سنا ہے، ماں اور ڈاکٹر نوشاد نے مل کر اسے قتل کردیا۔ اس طرح تیسرے شوہر سے نجات پانے کے بعد ماں نے ڈاکٹر نوشاد سے نکاح کرلیا۔ ڈاکٹر نوشاد نے ماں کو ہر وہ چیز دے دی جس کی وہ خواہش مند تھی۔ میری ماں کو کپڑوں اور زیور سے عشق ہے۔ میری ماں روکھی سوکھی کھا کر گزارہ کرسکتی ہے لیکن اچھے کپڑوں اور نت نئے زیورات کے بغیر وہ ادھوری ہے۔ ماں کی چوتھے شوہر سے خوب گاڑھی چھننے لگی۔ دونوں نے مل کر ہمیں ''بیئر رچیک'' بنالیا۔ اگر ہم میں سے کوئی بہن ''کیش'' ہونے سے انکار کرتی تو اس کا کھانا پینا بند کرکے قید کردیا جاتا۔ بھوک، پیاس اور قید و تنہائی ہمارے ہوش ٹھکانے لگا دیتی۔ یوں بھی ہم نے اپنے بچپن سے اپنی ماں کو آزاد روپ میں دیکھا تھا۔ گھر کا ماحول ایک دم کھلا تھا۔ ہمارے چاروں طرف گنگا بہہ رہی تھی، ہمیں تو ہاتھ دھونے ہی تھے۔ ڈاکٹر نوشاد انتہائی اثر ورسوخ والا شخص ہے۔ اسے مشکل سے مشکل کام بتادیں، وہ اس کو آسان بنادیتا ہے۔ کسی کی کہیں کوئی گوٹ پھنسی ہو، کوئی فائل رکی ہو، ترقی نہ ہو رہی ہو، ملازمت دلوانی ہو تو ڈاکٹر نوشاد سے لوگ رجوع کرتے ہیں۔ ڈاکٹر نوشاد ہمیں ''فائل کا پہیہ'' بنادیتا ہے۔ بس پھر ''پہیہ'' لگتے ہی ہر چیز گردش میں آجاتی ہے۔'' ملکہ نے گہرا سانس لے کر کہا۔

''میرا خیال ہے کہ اب اس گھر کی ہر چیز صاف ہوگئی ہوگی۔''

''ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی کہ جب تم لوگوں کے ذریعے گھر کی گاڑی ٹھیک ٹھاک چل رہی تھی تو پھر تمہاری شادی کرنے کی کیا ضرورت تھی؟'' عابر نے پوچھا۔

''پہلی بات تو یہ ہے کہ اس گھر کے لئے ایک سیدھا سادہ چوکیدار چاہئے تھا۔ وہ آپ کی صورت میں مل گیا۔ دوسرے میں اس گھر کی ''ہاٹ کیک'' ہوں۔ اس کیک کو اچھی پیکنگ کی ضرورت تھی تاکہ بوقت ضرورت محفوظ کیا جاسکے۔ دکان کے اندر بے شک جو بھی کاروبار ہوتا ہو لیکن دھوکا دینے کے لئے ایک اچھے سائن بورڈ کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ آپ کی صورت میں اس دکان نما گھر کو میسر آگیا۔'' ملکہ نے تلخی سے کہا اور سر جھکا کر بیٹھ گئی۔

PDF BY Manzoor

’’آج جو باتیں تم نے بتائی ہیں، اگر کل مجھ پر آشکار کر دیتیں تو کتنا اچھا ہوتا۔‘‘ عابر نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

’’میں نے کئی بار چاہا کہ میں آپ کو ہر وہ بات بتا دوں جو مجھے معلوم ہے لیکن بتا نہ سکی، بس ارادہ باندھ کر رہ گئی۔ میں نے اشارہ تو کیا لیکن آپ نے کوئی توجہ نہ کی۔ آپ اپنی محبت سے مجبور تھے اور میں اپنے گھر والوں کی تنبیہہ سے۔ راز کھولنے کی صورت میں مجھے زہر دیا جا سکتا تھا۔‘‘ ملکہ نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

’’کیا اب زہر سے بچ جاؤ گی؟‘‘ عابر نے پوچھا۔

’’اب مجھے زہر دے کر مارا جائے یا کسی چھری سے میرا گلا کاٹا جائے، مجھے کوئی خوف نہیں۔ میرے دل پر ایک بوجھ تھا، وہ میں نے اتار دیا۔‘‘ ملکہ نے بڑے پُرسکون انداز میں کہا۔ ’’یوں ایک بات کہوں، پتا نہیں آپ کو میری بات کا یقین آئے گا کہ نہیں۔ میں اس گندگی کا حصہ ضرور تھی لیکن اس گندگی کو کبھی دل سے قبول نہیں کیا۔ آپ کے نکاح میں آ کر یہ احساس اور بڑھا۔ عابر میں اس گند سے نکلنا چاہتی ہوں۔ میں اس گھر کو چھوڑنا چاہتی ہوں۔ آپ مجھے اپنے ساتھ لے چلیں۔ مجھے آپ سے محبت ہو گئی ہے۔ ہم اپنی ایک نئی دنیا بسائیں گے۔‘‘

’’نہیں، اب بہت دیر ہو چکی۔‘‘ عابر کے ہونٹوں پر ایک تلخ مسکراہٹ آئی۔ ’’میری آنکھیں کھل چکی ہیں، میں انہیں بند نہیں کر سکتا۔‘‘

’’عابر۔ ایسا نہ کہو، اپنی ملکہ کا کچھ خیال کرو۔‘‘ ملکہ نے التجا کی۔

’’تمہارا خیال کرتے ہوئے ہی میں نے فیصلہ کیا ہے۔‘‘ عابر مستحکم انداز میں بولا۔

’’فیصلہ...... کیسا فیصلہ؟‘‘ ملکہ نے چونک کر کہا۔

’’میں نے اس دکان کو، اسے گھر کہنا تو گھر کی توہین ہے، چھوڑ دینے کا فیصلہ کیا ہے۔ ساتھ ہی میں نے تمہیں بھی چھوڑنے کا فیصلہ کیا ہے۔ بلاؤ اس شیطان ڈاکٹر نوشاد کو، بلاؤ اس حرافہ چاندنی کو، بلاؤ اپنی کٹھ پتلی بہنوں کو تاکہ ہر شخص میرا فیصلہ اپنے کانوں سے سن لے۔‘‘ عابر نے تقریباً چیخ کر کہا۔

ملکہ صوفے سے اٹھی۔ وہ اس کے قدموں میں آ بیٹھی۔ آنکھوں میں آنسو بھر کر بولی۔ ’’کیا آپ مجھے معاف نہیں کر سکتے؟‘‘

’’معاف کر تو دیا اور کیسے کروں؟ ورنہ جو کچھ میں نے دیکھا، وہ واجب القتل تھا۔ لیکن تم نے دیکھا کہ میں نے تمہیں قتل نہیں کیا، میں نے تو تم سے کچھ بھی نہیں کہا۔ میرے قدموں سے اٹھ جاؤ، میرے صبر کو مت آزماؤ، جاؤ سب کو بلا کر لاؤ۔‘‘ عابر اتنا کہہ کر دوسرے صوفے پر جا بیٹھا۔

عابر کے لہجے میں کوئی ایسی بات تھی کہ وہ اس سے مزید بات نہ کر سکی۔ ناچار اٹھی اور ڈرائنگ روم کا دروازہ کھول کر باہر نکل گئی۔

گھر کا ہر فرد اس وقت ٹی وی لاؤنج میں موجود تھا۔ ملکہ دوپٹے سے اپنے آنسو پونچھتی لاؤنج میں داخل ہوئی اور سب پر ایک نظر ڈالتے ہوئے بولی۔ ’’آپ سب کو عابر بلا رہے ہیں۔‘‘

سب سے پہلے چاندنی اٹھی۔ ڈاکٹر نوشاد دوڑ کر ملکہ کے نزدیک پہنچا۔ چاندنی نے پوچھا۔ ’’خیریت تو ہے نا؟‘‘

’’قیامت گزر چکی، اعمال نامہ ہاتھ میں آنے کا وقت آ پہنچا۔‘‘ ملکہ نے عجیب سے انداز میں کہا۔

چاندنی کی سمجھ میں اس کی بات نہ آئی۔ اس نے ڈاکٹر نوشاد کی طرف دیکھا۔ ڈاکٹر نوشاد نے کھلے دروازے کی طرف اشارہ کیا۔ پھر دونوں تیزی سے ڈرائنگ روم میں داخل ہو گئے۔ ان کے پیچھے لڑکیاں تھیں، سب سے آخر میں ملکہ اندر آئی۔

’’بیٹا۔ خیر تو ہے؟‘‘ چاندنی نے کسی قدر جھجکتے ہوئے پوچھا۔

’’میں بیٹا کیسے ہوا؟ گھر داماد بیٹا نہیں، گھر کا چوکیدار ہوتا ہے، سائن بورڈ ہوتا ہے تاکہ اس کی آڑ میں جو چاہے کاروبار کیا جا سکے۔ میں اس سائن بورڈ کو آج توڑتا ہوں۔ میں اس دکان کو چھوڑ کر جا رہا ہوں۔ میں ملکہ کو طلاق دیتا ہوں۔‘‘ عابر نے اس جملے کو تین بار دہرایا اور پھر یہ دیکھنے کی بھی کوشش نہ کی کہ اس جملے کا کس پر کیا اثر ہوا۔

طلاق دے کر وہ ایک لمحہ بھی وہاں نہ ٹھہرا۔ مضبوط قدموں سے چلتا ہوا گھر سے باہر نکل گیا۔

اس کے جانے کے بعد سب ایک دوسرے کی شکلیں دیکھنے لگے۔ کسی کی سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ وہ بولے تو آخر کیا بولے۔

ڈاکٹر نوشاد کے جی میں جانے کیا آئی کہ وہ تیزی سے دروازے کی طرف بڑھا۔ اس سے پہلے کہ ڈاکٹر نوشاد ڈرائنگ روم سے نکلتا، چاندنی نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور صاف لہجے میں بولی۔ ’’بس اب کھیل ختم ہوا، جانے والا چلا گیا، اس کا تعاقب بیکار ہے، اب آگے کی سوچو۔‘‘

عابر چاہتا بھی یہی تھا کہ اب اس کے تعاقب میں کوئی نہ آئے۔ وہ یہاں گزارے وقت کو کسی ڈراؤنے خواب کی طرح بھول جانا چاہتا تھا۔ بازی الٹ گئی تھی، اب پھر سے بساط بچھانے کا کوئی فائدہ نہ تھا۔ وہ اس گھر سے واپس آنے کے لئے نہیں نکلا تھا۔

اس وقت رات کے دس بج رہے تھے۔

وہ دھیرے دھیرے قدم بڑھاتا آگے بڑھ رہا تھا۔ اس کی کوئی منزل نہ تھی، جدھر اس کا منہ اٹھا، چل دیا تھا۔ اس وقت اس کی کیفیت کسی ہارے ہوئے جواری کی سی تھی جو اپنا سب کچھ لٹا کے بے سمت جا رہا تھا۔ ان لوگوں نے اس کا سب کچھ لوٹ لیا تھا، اس کی محبت لوٹ لی تھی، اس کا وقار داؤ پر لگا دیا تھا، اس کی اَنا ٹکڑے ٹکڑے کر دی تھی، اس کی روح پر ایسا گھاؤ لگایا جو نظر تو نہیں آ رہا تھا لیکن اس گھاؤ سے رسنے والا کرب اسے تڑپائے دے رہا تھا۔

اچانک اسے اپنا باپ یاد آیا۔ علی نثار کی کہی ہوئی بات یاد آئی۔ انہوں نے کہا تھا کہ کوئی نوکری، کوئی ملازمت تمہارے پاس نہیں۔ وہ ایک بے روزگار شخص کو اپنی بیٹی کیسے دے رہے ہیں۔ پھر نازنین نے بھی شبہ ظاہر کیا تھا کہ ضرور کچھ دال میں کالا ہے۔

واقعی دال میں بہت کچھ کالا تھا۔ اس نے اپنے والدین کی بات نہ مانی اور وہ غصے میں گھر چھوڑ کر چلا آیا۔ اپنا گھر چھوڑ کر کیا ملا۔ ذلت اور رسوائی۔ کاش اس نے اپنا گھر نہ چھوڑا ہوتا۔ خوبصورت لڑکی کے چکر میں آ کر اپنی زندگی برباد نہ کی ہوتی۔

وہ اپنی دُھن میں چلا جا رہا تھا کہ اچانک کوئی اس سے ٹکرایا۔

☆......☆......☆

آج پھر اماوس کی رات تھی۔ مائی پنکھی کے گھر میں جادو ٹونے کرنے والوں کا اجتماع تھا۔ جل مسان تقسیم ہو چکا تھا۔ مکروہ چہرے والے مرد، عورتیں اپنے اپنے مسائل بیان کر کے مائی پنکھی سے ماہرانہ رائے لے رہے تھے۔ جب ہر شخص اپنے سوال کا جواب پا چکا تو مائی پنکھی نے عذرا ڈیوڈ عرف سریلی کی طرف دیکھا۔

’’ہاں۔ سریلی کچھ سنائے گی؟‘‘ مائی پنکھی نے پوچھا۔

’’آپ جو حکم کریں رانی جی۔‘‘ عذرا نے سعادت مندی سے کہا۔

’’بس وہیں سے شروع کر۔‘‘ مائی پنکھی بولی۔

’’مجھ سے پہلی سی محبت میرے محبوب نہ مانگ۔‘‘ عذرا نے پوچھا۔ ’’یہیں سے نا رانی جی!‘‘

’’ہاں۔‘‘ مائی پنکھی نے کہا۔

ڈھائی بجے کا عمل۔ صحن میں ٹمٹماتا ایک مریل سا بلب، پُراسرار اندھیرا، نیم کے درخت سے جھڑتی زرد پتیاں، مرد و عورتوں سے بھرا ہوا صحن...... عجب فضا تھی اس گھر کی۔

عذرا اپنی جگہ سے اٹھی۔ اس نے مائی پنکھی کے گھٹنوں کو ہاتھ لگایا اور پھر وہ پائنتی کی جانب چارپائی پر بیٹھ گئی۔

عذرا نے الاپ لے کر جب ’’مجھ سے پہلی سی محبت‘‘ شروع کی تو لگا جیسے فضا ٹھہر گئی ہے۔

دروازے پر کھڑے سپاہی نے گانے کی آواز سنی تو وہ دوڑا ہوا دلدار بخش کے پاس پہنچا اور بڑی رازداری سے بولا۔ ’’سر جی۔ جوا ختم، مجرا شروع۔‘‘

یہ سنتے ہی دلدار بخش کو کرنٹ سا لگا۔ وہ گاڑی سے چھلانگ مار کر باہر آیا اور مائی پنکھی کے دروازے کی طرف بڑھا۔

دلدار بخش، مائی پنکھی کو اپنے ذہن سے نکال نہیں سکا تھا۔ رب نواز کے قاتل بننے اور تھانے میں کوؤں کی بھرمار کی وجہ سے وہ اس سے کچھ خوف زدہ ضرور تھا لیکن اتنے لوگوں کے گھر سے غائب ہو جانے کا تجسس جیسے اس کی روح میں اتر گیا تھا۔ وہ ہر قیمت پر اس راز سے پردہ اٹھائے جانے کا خواہش مند تھا۔

نتیجے میں اس نے سادہ لباس میں پولیس والوں کو اس کے گھر کی نگرانی پر مامور کر دیا تھا۔ یہ نگرانی چوبیس گھنٹے جاری تھی۔ مائی پنکھی کو اس بارے میں کچھ معلوم نہ تھا۔

دلدار بخش کو جیسے ہی معلوم ہوا کہ آدھی رات کے بعد سے اس کے گھر پر لوگوں کی غیر معمولی آمد کا سلسلہ جاری ہے تو وہ پولیس پارٹی کے ساتھ گلی میں آ دھمکا تھا۔

مائی پنکھی کے دائیں بائیں مکانوں کا سلسلہ تھا۔ وہاں سے لوگوں کا فرار ممکن نہ تھا۔ گھر کے سامنے وہ خود موجود تھا۔ البتہ قبرستان والی دیوار سے فرار ہونا ممکن تھا۔ اس مرتبہ اس نے قبرستان میں بھی اپنے لوگ تعینات کر دیئے تھے۔ اب کسی طرف سے گھر میں موجود لوگوں کے فرار کا کوئی راستہ نہ بچا تھا۔

دلدار بخش دروازے پر پہنچا تو اسے اندر سے گانے کی آواز آئی۔ دلدار بخش نے سوچا کہ کوئی اور ہاتھ آئے نہ آئے یہ ’’پہلی سی محبت‘‘ ضرور ’’پکڑی‘‘ جائے گی۔ اسے معلوم تھا کہ دروازہ محض ایک بھاری پتھر رکھ کر بند کیا جاتا ہے۔ اس نے ایک کواڑ کو اس انداز سے دھکا دیا کہ پیچھے سے پتھر ہٹ گیا۔

’’اپنی جگہ سے کوئی نہ ہلے ورنہ گولی مار دوں گا۔‘‘ چند قدم اندر آنے کے بعد اس نے تنبیہہ کی۔

اسے سامنے فرش پر بیٹھے لوگ نظر آئے تھے لیکن مائی پنکھی دکھائی نہ دی تھی۔ دراصل اس کی چارپائی باورچی خانے کی آڑ میں تھی اور چارپائی قبرستان والی دیوار سے لگی تھی۔ مائی پنکھی کے ساتھ عذرا بیٹھی گا رہی تھی۔

اس دھمکی کو سن کر صحن میں بیٹھے لوگوں کے ہوش اُڑ گئے۔ مائی پنکھی جو ’’پہلی محبت‘‘ میں گم تھی، ایک دم چونکی اور دلدار بخش کی دھمکی سنتے ہی اس کے سارے حواس بیدار ہو گئے۔ اس نے قدموں میں بیٹھی رنگل کے پیر پر پیر مارا اور دھیرے سے بولی۔ ’’اس کی آنکھوں میں دھول جھونک۔‘‘

رنگل نے کسی ’کمانڈو‘ کی طرح چھلانگ لگائی اور پھر رقص کے انداز میں گھنگھرو چھنکاتی ہوئی دلدار بخش کے سامنے آ گئی۔ پُرکشش جسم کو اس نے اس انداز سے حرکت دی کہ دلدار بخش گولی چلانا بھول گیا۔ وہ ریوالور کو ہاتھ کے اشارے سے حرکت تو دے رہا تھا لیکن یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ یہ عورت آخر کرنا کیا چاہتی ہے۔ وہ کلاسیکی انداز کا رقص کر رہی تھی جس میں اس کی آنکھیں، گردن اور ہاتھ کی انگلیاں بہت تیزی سے مل رہی تھیں۔

دلدار بخش اپنے ساتھیوں سمیت دم بخود کھڑا تھا۔

بس اتنی مہلت مائی پنکھی کے لئے کافی تھی۔ مائی پنکھی چارپائی سے اٹھ کر یکدم دلدار بخش کے سامنے آ گئی۔ اس نے رنگل کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ’’بس!‘‘

رنگل نے مائی پنکھی کا حکم سنتے ہی دو بار پاؤں زمین پر مارا اور پھر جیسے پتھر کی ہو گئی۔

مائی پنکھی دو قدم آگے بڑھی اور مسکرا کر بولی۔ ’’آخر تجھے چین نہ آیا، پھر آ گیا۔‘‘

دلدار بخش بغیر پلک جھپکے اسے دیکھتا رہا، کچھ نہ بولا۔

’’لا کا کا...... اپنی یہ بندوق مجھے دے دے۔‘‘ مائی پنکھی نے عجیب سے انداز میں کہا۔

جانے اس کی آواز میں ایسا کیا تھا کہ دلدار بخش نے کسی ہارے ہوئے سپاہی کی طرح ریوالور اس کے سپرد کر دیا۔ مائی پنکھی نے ریوالور لے کر ان سپاہیوں کو دیکھا جو دلدار بخش کی پشت پر مٹی کے مادھوؤں کی طرح کھڑے تھے۔

مائی پنکھی نے پاس کھڑی رنگل کو ایک منتر بتایا۔ پھر بولی۔ ’’پڑھو اور نکلو۔‘‘

اب وہاں موجود بندے بندیاں دل ہی دل میں وہ منتر پڑھتے، پولیس کی آنکھوں میں دھول جھونکتے دروازے سے نکل گئے۔ سب سے آخر میں رنگل گھنگھرو چھنکاتی دلدار بخش کے سامنے آئی۔ چند لمحے بھاؤ بتائے اور پھر مٹکتی ہوئی اس کے سامنے سے گزر گئی۔

صحن خالی ہو چکا تھا۔ گھر میں موجود سب لوگ بخیر و عافیت جا چکے تھے۔ مائی پنکھی آگے بڑھی، اس نے ریوالور، دم بخود دلدار بخش کے ہاتھ میں تھمایا اور شرارتی انداز میں بولی۔ ’’ہاں کا کا، کیسے آیا؟‘‘

دلدار بخش کو یہ سنتے ہی جھٹکا سا لگا اور پھر وہ فوراً ایکشن میں آ گیا۔ یوں لگا جیسے رکی ہوئی فلم دوبارہ چل پڑی ہو۔ دلدار بخش کو یاد آیا کہ اس نے گھر میں گھستے ہی وارننگ دی تھی۔ اسے صحن میں بیٹھے ہوئے لوگ نظر آئے تھے لیکن چشم زدن میں جانے کیا ہوا تھا کہ اب وہاں کوئی بھی نہ تھا، بس مائی پنکھی اس کے سامنے کھڑی تھی۔

’’او۔ مائی پھر تو نے ہاتھ دکھا دیا۔ کہاں گئے سارے لوگ؟‘‘ دلدار بخش حیرت زدہ تھا۔

’’کا کا۔ تو کن لوگوں کی بات کر رہا ہے، یہاں میں اکیلی رہتی ہوں یا میرے ساتھ میری پالتو بلی ہوتی ہے انجو...... تو کہے تو اسے بلاؤں۔‘‘ مائی پنکھی نے کہا۔

’’او۔ مائی۔ دیکھ تو مجھے دھوکا نہیں دے سکتی۔ میں نے خود یہاں لوگوں کو بیٹھے ہوئے دیکھا ہے۔ ادھر کوئی عورت گا رہی تھی۔ مجھ سے پہلی سی محبت میرے محبوب نہ مانگ...... وہ عورت کدھر ہے؟‘‘ دلدار بخش نے آگے بڑھ کر چاروں طرف نظر دوڑائی۔

’’کبھی تو کہتا ہے لوگ بیٹھے تھے، کبھی تو کہتا ہے کہ کوئی عورت گا رہی تھی۔ کا کا کہیں ٹیپ بج رہا ہوگا۔‘‘ مائی پنکھی نے اسے الجھانا چاہا۔ ’’میرا گھر تیرے سامنے ہے، تو تلاشی لے لے۔‘‘

دلدار بخش نے اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ اس نے پیچھے مڑ کر اپنے ساتھیوں سے کہا۔ ’’اس گھر کا کونا کونا چھان مارو۔‘‘

’’جی سر۔‘‘ سپاہی بڑی مستعدی سے پورے گھر میں پھیل گئے اور گھر کا کونا کونا چھان مارا۔

لیکن نتیجہ کچھ نہ نکلا۔ گھر میں بلی کے سوا کوئی اور نہ تھا۔

دلدار بخش کو خیال آیا کہ گھر میں موجود لوگ کہیں قبرستان کی طرف سے تو نہیں نکل گئے۔ اس نے ایک پولیس والے کو باورچی خانے کی چھت پر چڑھایا۔ چھت پر چڑھ کر اس نے دیوار سے قبرستان کی طرف جھانکا اور ادھر موجود پولیس والے سے پوچھا۔ ’’قاسم، ادھر سے کوئی بندہ تو نہیں نکلا؟‘‘

’’نہیں ادھر تو کوئی نہیں آیا۔‘‘ قاسم نے جواب دیا۔

PDF BY Manzoor

دیوار کے اس طرف کھڑے دلدار بخش نے اپنے آدمی کا جواب سن لیا تھا۔ دیوار سے بھی کوئی بندہ ادھر نہیں کودا۔ یہاں عورتیں بھی تھیں، ان کا دیوار پر چڑھنا اور پھر کودنا کوئی آسان کام نہ تھا۔ دروازے پر وہ مع سپاہیوں کے موجود تھا۔ اس کے سامنے سے کوئی نہیں گزرا تو پھر ان لوگوں کو زمین نگل گئی یا آسمان کھا گیا..... آخر ہوا کیا؟

وہ یہاں اس راز سے پردہ اٹھانے آیا تھا کہ پچھلے چھاپے میں گھر میں موجود لوگ کہاں غائب ہو گئے تھے۔ آج کے چھاپے نے گتھی سلجھانے کے بجائے مزید الجھا دی تھی۔ اس کے لوگوں نے ایک ماہ تک اس گھر کی کڑی نگرانی کی تھی۔ آج جب گھر میں طرح طرح کے مرد اور عورتیں اکٹھا ہونے لگے تو وہ خود جائے واردات پر آ پہنچا تھا۔ اس نے یہ آپریشن خود اپنے ہاتھوں کیا تھا لیکن ہاتھ کچھ نہ آیا تھا۔

''کاکا..... کیا سوچ رہا ہے؟'' مائی پنکھی نے سپاٹ لہجے میں پوچھا۔

''مائی..... میں سوچ رہا ہوں کہ پولیس کی نوکری چھوڑ کر تیری چاکری کر لوں۔'' دلدار بخش نے جل کر جواب دیا۔

''تیری سوچ بالکل ٹھیک ہے۔'' مائی پنکھی نے ہنس کر کہا۔ ''میرا چاکر نہیں شاگرد بن جا، بہت فائدے میں رہے گا۔''

''مائی۔ میں نے تجھے استاد مانا۔ بس مجھے اتنا بتا دے کہ یہ کون لوگ ہوتے ہیں اور کیسے غائب ہو جاتے ہیں؟'' دلدار بخش کے لہجے میں بے چارگی تھی۔

مائی پنکھی کو اس پر اچانک ترس آ گیا۔ وہ چارپائی کی طرف اشارہ کر کے بولی۔ ''آ بیٹھ کاکا۔ میں تجھے بتاتی ہوں۔ پر تو اپنے بندوں کو یہاں سے نکال۔''

دلدار بخش نے اپنے ساتھیوں سے کہا۔ ''چلو تم لوگ باہر نکلو۔ میں آتا ہوں۔''

''دیکھ کاکا۔ پہلے تو اپنی یہ غلط فہمی دور کر لے کہ میں یہاں کوئی جوئے کا اڈا چلاتی ہوں یا یہاں عورتوں کا کاروبار ہوتا ہے۔'' مائی پنکھی نے سنجیدگی سے کہا۔ ''یہاں ایسا کچھ نہیں ہوتا۔ ہر اماوس کی رات کو یہ لوگ میرے پاس آتے ہیں۔ یہ مختلف عملیات کے ماہر ہوتے ہیں۔ یہ اپنے اپنے مسئلے لے کر یہاں آتے ہیں۔ میں ان کے مسائل کا حل انہیں بتاتی ہوں۔ یہ تو ہو گیا اس بات کا جواب کہ یہ کون لوگ ہوتے ہیں۔ رہی یہ بات کہ کیسے غائب ہو جاتے ہیں، یہ میں تجھے بتاتی ہوں اور بتا اس لئے رہی ہوں کہ تو اس گھر کا پیچھا چھوڑ دے۔ مجھ سے وعدہ کر کہ ان لوگوں کا راز جاننے کے بعد تو ادھر کا رخ نہیں کرے گا۔ میں تجھے ذاتی طور پر آنے سے منع نہیں کر رہی ہوں، تو سو باری آ، میں تیرا ہر مسئلہ حل کروں گی۔ پر تو یہاں اپنی فوج فراٹ کے ساتھ مت آ..... وعدہ کر کہ تو نہیں آئے گا اور آئے گا تو اکیلا آئے گا۔ دلدار بخش بن کر۔''

''چل مائی، وعدہ رہا۔'' دلدار بخش نے وعدہ کرنے میں ہی عافیت جانی۔

''اب سن، غور سے سن۔ اتنے لوگوں کا چند لمحوں میں آنکھ سے اوجھل ہو جانا کوئی بڑا کمال نہیں، یہ کوئی بچہ بھی کر سکتا ہے۔ پچھلی دفعہ جب تو آیا تھا تو دروازہ بجا کر آیا تھا۔ مجھے تھوڑی سی مہلت مل گئی تھی۔ اس بار تو نے یہ مہلت بھی نہ دی۔ میں گانا سننے میں محو تھی کہ تو دندناتا ہوا اندر آ گیا، تب میں نے رنکل کو تیرے سامنے بھیجا۔ اس نے تیرے سامنے آ کر اچانک ناچنا شروع کیا تو تیری سمجھ میں نہ آیا کہ یہ کیا چیز تیرے سامنے آ گئی ہے۔ بس اتنی ہی مہلت مجھے درکار تھی۔ میں نے تجھ پر اور تیرے سپاہیوں پر منتر پھونکا، تو میری گرفت میں آ گیا تو میں نے تیرے ہاتھ سے بندوق لے لی، اب تو وہ کرنے پر مجبور تھا جو میں چاہتی، اب تو وہ دیکھنے پر مجبور تھا جو میں دکھاتی۔ اگرچہ رنکل میرے ساتھ کھڑی تھی لیکن تو اسے اپنے سامنے وحشیانہ رقص کرتے اپنی مرضی کے لباس میں دیکھ رہا تھا۔ تو میری بات سمجھ گیا نا؟''

دلدار بخش نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ''ہاں، مائی۔''

''بس پھر کیا تھا، ہر شخص منتر پڑھتا تیرے سامنے سے گزر گیا اور تو اور تیرے ساتھی کسی کو جاتا نہ دیکھ سکے۔ کاکا یوں سمجھ لے، یہ ایک طرح سے نظر بندی کا کھیل تھا۔ پھر جب میں نے بندوق تیرے ہاتھ میں تھمائی تو، تو میرے سحر سے آزاد ہوا، بس اتنی سی بات تھی جس کے لئے تو نے اتنا وقت ضائع کیا۔'' مائی پنکھی نے اپنی بات ختم کر کے دلدار بخش کو دیکھا۔

''اس کا مطلب ہے کہ تو جادوگرنی ہے۔'' دلدار بخش کے دل نے ایک نئی کروٹ لی۔

''جادوگرنی میرے لئے چھوٹا لفظ ہے، میں بہت آگے کی چیز ہوں۔'' مائی پنکھی بولی۔

''مائی۔ میری نظر میں تو کسی بڑے شیطان سے کم نہیں۔'' دلدار بخش چارپائی سے اٹھتا ہوا بولا۔ ''تو نے میرے محکمے کے بندے کو قاتل بنا دیا۔ اگر تو اسے اس کی بیوی کے بارے میں نہ بتاتی تو وہ بھلا اپنی بیوی اور اس کے آشنا کو قتل کیوں کرتا لیکن تو شر پھیلائے بغیر نہ رہ سکی۔ اب بھی تو اپنے چیلے چانٹوں کے ساتھ یہی کام کر رہی ہے، پھر میں کیوں نہ اس شر کو جڑ سے کاٹ دوں۔ نہ ہوگا بانس، نہ بجے گی بانسری۔ چل مرنے کے لئے ہو جا تیار۔'' یہ کہہ کر دلدار بخش نے چارپائی پر بیٹھی مائی پنکھی پر ریوالور تان لیا۔

''او۔ کاکا، تو رہا کاکے کا..... کاکا۔'' مائی پنکھی طنزیہ انداز میں بولی۔ ''تیرے رب نواز کو میں نے تو نہیں کہا تھا کہ قتل کر دے، جو کیا اس نے اپنی مرضی سے کیا، اس میں میرا کیا قصور۔''

''اب میں تیری کوئی بکواس سننے کے لئے تیار نہیں۔'' دلدار بخش نے ریوالور سیدھا کیا۔ ''میں تجھ جیسی شیطان عورت کو ہرگز زندہ نہیں چھوڑوں گا۔''

''کاکا۔ میرا جرم تو بتا۔ پولیس کا کام لوگوں کو مارنا نہیں، ان کی حفاظت کرنا ہے۔'' مائی پنکھی اسے باتوں میں الجھا کر اپنا مقصد پورا کرنا چاہتی تھی۔

''پولیس کا کام تجھ جیسے شیطانوں کی حفاظت کرنا ہرگز نہیں۔ تو ایسی مجرم ہے جس کا جرم کسی عدالت میں ثابت نہیں کیا جا سکتا۔ بس تجھے اسی طرح مار کر معاشرے سے گند دور کیا جا سکتا ہے۔'' دلدار بخش نے فیصلہ سنایا۔

''اچھا۔ چل پہلے میرے ہاتھ پر گولی مار۔'' مائی پنکھی نے اپنا ہاتھ اس کے سامنے کیا۔

دلدار بخش کو اس کی ہتھیلی پر جو نظر آیا، اسے دیکھ کر اس کے ہوش اڑ گئے۔

PDF BY Manzoor

ہوش کیوں نہ اُڑتے۔

اس نے اپنے بڑے بیٹے کو ہتھکڑیاں لگے پولیس وین سے اترتے دیکھا۔ جس وین سے وہ اترا، وہ ملحقہ تھانے کی تھی۔

یہ منظر دیکھتے ہی دلدار بخش ساری چوکڑی بھول گیا۔ وہ فوراً باہر کی طرف بھاگا۔ اسے بھاگتے دیکھ کر مائی پنکھی نے پیچھے سے آواز لگائی۔ ''او، کاکا۔ بھاگ کیوں رہا ہے۔ چلانا گولی۔''

''تو فکر نہ کر مائی۔ میں آؤں گا، ضرور واپس آؤں گا۔ تجھے چھوڑوں گا نہیں۔ پہلے میں ذرا اپنے بیٹے کی خبر لے لوں۔ اسے پولیس نے کیوں گرفتار کیا ہے؟''

مائی پنکھی چارپائی سے اٹھ گئی۔ اس نے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ ''کوئی جرم کیا ہوگا۔ تب ہی تیرے بیٹے کو پولیس نے پکڑا ہے۔ پولیس کسی معصوم کو تو نہیں پکڑتی، ہیں نا۔''

دلدار بخش دروازے سے نکل چکا تھا۔ اس نے مائی پنکھی کا طنز بھرا جملہ سن تو لیا تھا لیکن جواب دینے کا اس کے پاس وقت نہ تھا۔

''کاکا۔ تیرے حق میں اچھا یہ ہے کہ تو واپس نہ آئے۔ واپس آیا تو نقصان اٹھائے گا۔'' اس نے دروازہ بند کرتے ہوئے زور سے کہا۔ اس کا خیال تھا کہ اس کی بات دلدار تک ضرور پہنچ گئی ہوگی۔

دلدار بخش کا بیٹا جس کی گرفتاری کا منظر اس نے مائی پنکھی کی ہتھیلی پر دیکھا تھا، کالج اسٹوڈنٹ تھا۔ دلدار کے چار بچے تھے۔ بیٹا جس کا نام شمشاد تھا، بڑا تھا، اس سے تین چھوٹی بیٹیاں تھیں۔ وہ بھی پڑھ رہی تھیں۔ دلدار کو بیٹیوں کے مقابلے میں شمشاد سے زیادہ لگاؤ تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ شمشاد پڑھ لکھ کر کچھ بن جائے۔ اس نے پڑھائی کے معاملے میں اسے ہر سہولت دے رکھی تھی۔ دلدار کی اپنے بیٹے کے بارے میں بہت اچھی رائے تھی۔ اس کا خیال تھا کہ پڑھائی کے علاوہ اس کا دھیان کسی اور طرف نہیں ہے۔ لیکن حقیقت کچھ اور تھی۔ پڑھائی کے علاوہ اس کا 'دھیان' ہر طرف تھا۔ وہ ہر سال اچھے نمبروں سے پاس ہو جاتا تو باپ سمجھتا تھا کہ پڑھائی کے علاوہ یہ کسی اور چیز سے آشنا نہیں ہے۔ شمشاد ایک چالاک اور شاطر لڑکا تھا۔ وہ پولیس والے کا بیٹا تھا لہٰذا کلاس پاس کرنے میں سارے ہتھکنڈے استعمال کرتا تھا۔

شمشاد کو ہتھکڑی میں دیکھ کر دلدار کو شدید جھٹکا لگا تھا۔ آخر ایسا کیا ہوا کہ اس کے 'پڑھاکو' بیٹے کو پولیس نے گرفتار کر لیا۔ جب وہ ملحقہ تھانے پہنچا تو وہاں کئی اور 'جھٹکے' اس کے منتظر تھے۔

اس تھانے کا انچارج اتفاق سے اس کا دوست تھا۔ خالد قریشی نا صرف اس کا کلاس فیلو تھا بلکہ وہ پولیس میں ایک ساتھ ہی بھرتی ہوئے تھے۔

رات کے پچھلے پہر دلدار بخش کو اپنے کمرے میں داخل ہوتے دیکھ کر وہ حیران ہو گیا۔ ''اوئے۔ دلدار خیریت۔ تو اس وقت۔'' خالد قریشی نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

''اوئے۔ یار تو نے میرا بیٹا پکڑ لیا۔ پھر اس وقت میں کیسے نہ آتا۔'' دلدار بخش کے لہجے میں شکوہ تھا۔

''تیرا بیٹا۔ کیسی بات کرتا ہے دلدار۔ میں بھلا تیرا بیٹا پکڑوں گا۔'' خالد قریشی نے کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''تو بیٹھ، میں بھٹی کو بلاتا ہوں۔''

خالد قریشی کی لاعلمی نے دلدار بخش کو پریشان کیا۔ وہ سوچنے لگا کہ کہیں مائی پنکھی نے کوئی فریب تو نہیں دے دیا۔ اگر اس کا بیٹا یہاں ہوتا تو خالد قریشی کے علم میں ضرور ہوتا۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ شمشاد نے اپنی شناخت ہی نہ کروائی ہو۔ لیکن یہ ممکن نہ تھا۔ وہ گرفتار ہوتا تو اپنی جان چھڑانے کے لیے اپنے باپ کا نام ضرور لیتا۔

اردلی کے ذریعے بلوائے جانے پر اے ایس آئی شریف بھٹی کمرے میں داخل ہوا، اس نے سلام کیا اور خالد قریشی سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''جی سر۔''

''بھٹی تم انہیں جانتے ہو؟'' خالد قریشی نے دلدار کی طرف اشارہ کیا۔

''اچھی طرح سر۔'' بھٹی بولا۔ ''ایس ایچ او دلدار بخش صاحب۔ آپ کے دوست۔''

''یار۔ تم نے مجھے ان کے سامنے شرمندہ کروا دیا۔'' خالد قریشی نے کہا۔

''کیوں سر۔ ایسا کیا ہوا؟'' شریف بھٹی کی کچھ سمجھ میں نہ آیا۔

''بھٹی۔ تم نے دلدار کا بیٹا پکڑ لیا اور مجھے بتایا تک نہیں۔'' خالد قریشی نے انکشاف کیا۔

''سر ایسا بھلا کیسے ہو سکتا ہے۔'' بھٹی نے بڑے یقین سے کہا۔ ''ضرور کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔''

''کیا تم نے آج کوئی گرفتاری کی ہے؟'' خالد نے پوچھا۔

''ایک گھنٹہ پہلے میں ایک لڑکے کو پکڑ کر لایا ہوں لیکن اس نے تو سر کا نام نہیں لیا۔'' بھٹی بولا۔

''نام کیا ہے اس کا؟'' اس بار دلدار بخش نے گفتگو میں مداخلت کی۔

''اس کا نام شمشاد ہے جی۔'' بھٹی بولا۔

''یہی نام ہے میرے بیٹے کا۔'' دلدار بخش نے بے تاب ہو کر کہا۔

''تم نے اسے کس جرم میں گرفتار کیا ہے؟'' خالد قریشی اسے تیز نظروں سے گھورتے ہوئے بولا۔

''سر جی۔ اس نے ایک لڑکی کے چہرے پر تیزاب پھینکا ہے۔'' بھٹی نے فرد جرم بتائی۔

''تیزاب پھینکا ہے، میرے بیٹے نے؟'' دلدار بخش کے لیے یہ جھٹکا اعصاب شکن تھا۔

''بھٹی۔ شمشاد کو فوراً لے کر ادھر آؤ اور اپنے دماغ میں یہ بات اچھی طرح بٹھا لو کہ تم نے شمشاد کو گرفتار نہیں کیا۔ اس کی جگہ کوئی اور لڑکا تلاش کرو۔ چلو جلدی کرو۔'' خالد قریشی نے حکم دیا۔

''جی سر۔ بہت اچھا۔'' بھٹی نے مرے ہوئے لہجے میں کہا اور حکم کی تعمیل کرنے کے لیے کمرے سے نکل گیا۔

بھٹی کے جانے کے بعد خالد قریشی نے اس سے معذرت کی۔ ''یار، معاف کرنا غلطی ہو گئی۔''

''کوئی بات نہیں یار۔'' دلدار بخش ممنون لہجے میں بولا۔ ''غلطی میرے بیٹے کی ہے کہ اس نے اپنا تعارف کیوں نہیں کرایا۔ اس کا مطلب ہے کہ یہ جرم اسی سے ہوا ہے۔ شاید وہ شرمندگی کی وجہ سے میرا نام نہیں لے سکا۔ وہ تو اچھا ہوا کہ کسی طرح مجھے اس کی گرفتاری کا علم ہو گیا۔ ورنہ میڈیا پر خبر آنے کے بعد جان چھڑانا مشکل ہو جاتی۔ یار تیرا بہت شکریہ۔ تو نے دوستی کا حق ادا کر دیا۔''

''کوئی بات نہیں یار۔'' خالد قریشی بولا۔ ''لیکن تجھے کیسے پتا چلا کہ تیرا بیٹا یہاں ہے؟'' خالد قریشی کا تجسس جاگا۔

جواب میں دلدار بخش نے مائی پنکھی کے بارے میں ہر وہ بات بتا دی جو اس کے علم میں تھی۔

''اس کا مطلب ہے کہ وہ خاصی کام کی عورت ہے۔'' خالد قریشی نے ساری داستان سن کر اپنی رائے سے نوازا۔ ''تو خواہ مخواہ اس کی جان کا دشمن ہوا ہے۔''

دلدار بخش نے سوچا۔ خالد قریشی ٹھیک کہتا ہے۔ مائی پنکھی واقعی کام کی عورت ہے۔ اگر وہ ہتھیلی پر شمشاد کی گرفتاری کا منظر نہ دکھاتی، تو وہ کس طرح اسے تھانے سے مکھن سے بال کی طرح نکال کر لے جا سکتا تھا۔ یہ ٹھیک ہے کہ مائی پنکھی نے یہ کارروائی اپنی جان بچانے کے لیے کی تھی، لیکن اس نے دلدار کو فائدہ پہنچا دیا تھا۔ ایک تو اسے خواہ مخواہ قاتل ہونے سے بچا

PDF BY Manzoor

دیا تھا۔ دوسرے اس کی اطلاع پر اس کا بیٹا بچ گیا تھا۔ اب خالد قریشی نے ایک نیا راستہ بھایا تھا۔ اس عورت سے واقعی کام لیا جا سکتا تھا۔

اگلے دن شام کو دلدار، خالد قریشی کے ساتھ مائی پنکھی کے گھر پہنچ گیا۔ اس کے ہاتھ میں مٹھائی کا ڈبا اور ڈبے کے اندر پانچ ہزار روپے تھے۔

o.....o.....o

عابر سے ٹکرانے والا وہی فقیر تھا جو اسپتال سے باہر آتے ہوئے ملا تھا۔ جس نے علی نثار سے صدقہ مانگا تھا اور عابر کا چہرہ دیکھ کر کہا تھا۔ ''تجھے دنیا ڈھونڈ رہی ہے۔''

عابر نے اسے فوراً پہچان لیا۔ چہرہ ایسا تھا جسے ایک بار دیکھ کر بھولا نہیں جا سکتا تھا۔ چھوٹی داڑھی، کندھے پر پڑے کالے اور گھنے بال۔ روشن آنکھیں جن میں محبت کے سوا کچھ نہ تھا۔

فقیر نے محبت بھری آنکھوں سے عابر کا اوپر سے نیچے تک جائزہ لیا۔ پھر اوپر آسمان کی طرف گردن اٹھائی۔ آسمان کو یوں دیکھا جیسے کچھ تلاش کر رہا ہو۔ چند لمحوں کے بعد اس فقیر نے عابر کی آنکھوں میں دیکھا۔ عابر اسی کی طرف دیکھ رہا تھا لیکن وہ اس کی روشن آنکھوں کی تاب نہ لا سکا۔ اس نے نظریں جھکا لیں۔

''تجھے دنیا ڈھونڈ رہی ہے۔'' اس فقیر نے کہا۔

''بابا۔ یہ دنیا مجھے کب تک ڈھونڈتی رہے گی۔ مجھ تک پہنچتی کیوں نہیں؟'' عابر کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

اس کی بات سن کر فقیر نے ایک زوردار قہقہہ لگایا۔ پھر وہ پیٹھ موڑے بہت دیر تک ہنستا رہا۔ عابر کو لگا کہ بابا شاید پاگل ہو گیا ہے۔ اس نے اسے، اس کے حال پر چھوڑ کر آگے قدم بڑھایا۔

فقیر نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور اپنی ہنسی روک کر انتہائی سنجیدہ لہجے میں بولا۔ ''کہاں جاتا ہے۔ بے وقوف اپنے گھر جا۔ تیری ماں شدید بیمار ہے۔''

عابر یہ سن کر یکدم پریشان ہو گیا۔ اس کا گھر جانے کا کوئی ارادہ نہ تھا۔ وہ اپنے باپ کے مزاج سے اچھی طرح واقف تھا۔ جس طرح وہ گھر چھوڑ کر آیا تھا، اس کے بعد اس گھر میں اس کی قطعاً گنجائش نہ تھی۔ وہ اسے کبھی گھر میں داخل نہ ہونے دیتے لیکن اس وقت فقیر کی بات سن کر وہ تڑپ گیا تھا۔

اسے گھر سے نکلے کئی ماہ ہو گئے تھے۔ جب سے گھر چھوڑا تھا، اس نے پلٹ کر خبر نہ لی تھی کہ اس کے گھر چھوڑنے کے بعد والدین پر کیا گزری۔ اس نے اپنی بہن صائمہ سے رابطہ کیا تھا اور نہ اس کے رابطہ کرنے کی گنجائش چھوڑی تھی۔ اس نے اپنے موبائل کی سم تبدیل کر لی تھی۔ اسے یقین تھا کہ کوئی اور رابطہ کرے نہ کرے، بہن اس کے لیے ضرور تڑپے گی۔

فقیر جا چکا تھا اور وہ سڑک کے کنارے کھڑا کسی سواری کا انتظار کر رہا تھا۔ اتنے میں ایک رکشا نظر آیا۔ اس نے اسے ہاتھ دے کر روکا اور اپنے گھر کا پتا بتا کر رکشا میں بیٹھ گیا۔

گھر کے دروازے پر جب رکشا رکا تو عابر کے دل کی دھڑکن ایک دم تیز ہو گئی۔ اس نے دھڑکتے دل کے ساتھ گیٹ پر لگے گھنٹی کے بٹن پر ہاتھ رکھا۔ بٹن دبتے ہی گھر کے اندر سے بیل کی آواز آئی۔ وہ دروازے سے تھوڑا سا پیچھے ہو کر کھڑا ہو گیا۔ وہ گھر تک آ تو گیا تھا لیکن اب اس کے اعصاب جواب دے رہے تھے۔

علی نثار اس وقت کوئی 'ٹاک شو' دیکھ رہے تھے۔ صائمہ بھی اتفاق سے گھر میں موجود تھی۔ وہ رات رکنے کے لئے آ گئی تھی۔ اس وقت وہ نازنین کے ساتھ بیڈ روم میں تھی۔ گھنٹی کی آواز سن کر وہ کمرے سے باہر نکلی اور لاؤنج میں بیٹھے علی نثار سے مخاطب ہو کر بولی۔ ''اس وقت کون آ گیا؟''

علی نثار نے لاؤنج میں لگی گھڑی کی طرف نظر ڈالی۔ گیارہ بج رہے تھے، وہ بولے۔ ''پتا نہیں۔ ٹھہرو، میں دیکھتا ہوں۔''

گیٹ کی طرف بڑھتی ہوئی صائمہ رک گئی۔ ''جی، اچھا۔''

علی نثار یہ سوچتے ہوئے گیٹ کی طرف بڑھے کہ اس وقت کون آ سکتا ہے۔ لیکن وہ اندازہ نہ لگا سکے۔ گیٹ کے نزدیک پہنچ کر انہوں نے بلند آواز میں پوچھا۔ ''کون؟''

''جی۔ ابو، میں ہوں عابر۔'' عابر کی مری ہوئی آواز باہر سے آئی۔

عابر کی آواز سن کر علی نثار کے جسم میں یکدم جان سی پڑ گئی۔ انہوں نے فوراً پیچھے مڑ کر دیکھا۔ پیچھے دروازے پر صائمہ کھڑی تھی۔ اس نے عابر کی آواز سن لی تھی۔

چند لمحے اس پر سکتہ سا ہو گیا۔ کتنے عرصے کے بعد اس نے عابر کی آواز سنی تھی۔ وہ جلدی سے آگے بڑھی۔ اس سے پہلے کہ علی نثار کوئی ردعمل ظاہر کرتے، صائمہ ان کے نزدیک آ کر سرگوشی میں بولی۔ ''پلیز ابو۔'' اس کی آواز میں التجا تھی۔

علی نثار نے گہرا سانس لے کر گھر کا بیرونی گیٹ کھول دیا۔

عابر تیزی سے اندر آیا۔ اس نے سامنے کھڑے اپنے باپ کو ایک نظر دیکھا اور جھک کر ان کے پاؤں پکڑ لیے۔ ''ابو مجھ سے غلطی ہو گئی۔ مجھے معاف کر دیں۔''

جوان بیٹے کو اپنے پاؤں پکڑتے دیکھ کر ان کے اندر کا باپ جاگ گیا اور ان کی اصول پسندی کہیں پیچھے سو گئی۔ انہوں نے قدموں میں جھکے عابر کو اٹھا کر سینے سے لگا لیا۔ باپ کے سینے سے لگ کر عامر کی آنکھیں چھلک پڑیں۔

علی نثار کو گلے لگاتے دیکھ کر صائمہ سے وہاں کھڑا نہ رہا گیا۔ وہ روتی ہوئی اندر بھاگی۔ ''امی، امی۔''

نازنین نے کچھ دیر پہلے نیند کی گولی کھائی تھی۔ اب ان کی آنکھوں میں نیند اترنے کو تھی کہ صائمہ کی چیخ آواز سنائی دی۔ ان کا دل بیٹھنے لگا اور آنکھوں سے نیند غائب ہو گئی۔

''امی۔ امی۔'' صائمہ پھولی سانسوں کے ساتھ بیڈ روم میں داخل ہوئی اور ماں سے لپٹ گئی۔

''میری بچی۔'' نازنین نے اسے لپٹا لیا اور پریشان ہو کر بولیں۔ ''کیا ہوا؟''

''امی۔ عابر آ گیا ہے۔'' صائمہ نے خبر سنائی۔

''ہیں۔ عابر آ گیا۔ کہاں ہے میرا بچہ۔'' نازنین نے صائمہ کو ہٹا کر اٹھتے ہوئے کہا۔ اس خبر نے ان پر جادو کا سا اثر کیا تھا۔ ورنہ ان سے اُٹھنا بیٹھنا مشکل تھا۔ اب کہاں کی بیماری! کیسی نقاہت! وہ بڑی تیزی سے اٹھ کر بیٹھ گئیں اور بیڈ سے پاؤں اُتار کر چپل پہننے کو تھیں کہ عابر اندر داخل ہوا۔

اس نے ماں کو اٹھنے سے روکا اور ان کے برابر بیٹھ کر ماں کو خود سے لپٹا لیا اور رونے لگا۔

''اوہ۔ میرے عابر۔ میرے بچے۔ تو کہاں چلا گیا تھا۔'' نازنین بے تاب ہو کر بولیں۔

''بس۔ بھول ہو گئی امی۔ مجھے معاف کر دیں۔'' وہ آنسوؤں کے دوران بولا۔

صائمہ نے اس کے نزدیک بیٹھ کر کندھے پر اپنا سر ٹکا دیا تھا۔ وہ بے آواز رو رہی تھی۔ عابر نے بہن کو نزدیک دیکھ کر اسے اپنے قریب کر لیا۔ اب وہ تینوں رو رہے تھے۔ علی نثار دروازے پر کھڑے اس منظر کو شفیق نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ آنکھیں ان کی بھی بھیگی ہوئی تھیں۔ وہ وہاں زیادہ دیر نہ کھڑے ہو سکے۔ ٹی وی لاؤنج میں آ کر بیٹھ گئے۔ چلتا ٹاک شو

بند کیا اور ٹی وی کی سیاہ اسکرین پر نظریں جما دیں۔

جب آنسوؤں کا سیل رواں تھما تو نازنین نے عابر کے چہرے کو دونوں ہاتھ میں تھام لیا اور محبت بھری نظروں سے دیکھنے لگیں۔ ان کا لخت جگر کئی ماہ بعد دکھائی دیا تھا۔ اس کی دید ان کے لیے راحت جاں تھی۔

''امی۔ اب آپ کی کیسی طبیعت ہے؟'' عابر نے پوچھا۔

''میں ٹھیک ہوں۔ مجھے کیا ہوا؟'' نازنین نے عابر کی پیشانی چومتے ہوئے کہا۔

''امی۔ آپ بہت کمزور دکھائی دے رہی ہیں۔'' عابر فکر مند ہو کر بولا۔

''عابر۔ تمہارے جانے کے بعد امی شدید بیمار ہو گئی تھیں۔ اٹھنا بیٹھنا بھی مشکل تھا۔ یہ تو تمہیں دیکھ کر یکدم ان میں جان آئی ہے۔ ورنہ رو رو کر امی نے برا حال کیا ہوا تھا۔'' صائمہ نے بتایا۔

''اس کا مطلب ہے کہ اس فقیر نے ٹھیک کہا تھا۔'' عابر کو یک لخت اس فقیر کا کہا یاد آ گیا۔

''کس فقیر نے عابر؟'' صائمہ نے پوچھا۔

''آپی یاد ہے جس دن میں اسپتال سے باہر آیا تھا تو ایک فقیر نے ابو سے صدقہ مانگا تھا۔'' عابر نے یاد دلایا۔

''ہاں اچھی طرح یاد ہے۔ وہ تمہیں کہاں مل گیا؟''

''فٹ پاتھ پر۔'' عابر نے بتایا۔ ''اس نے یہ کہہ کر کہ جا اپنے گھر جا، تیری ماں شدید بیمار ہے۔ میرا رخ موڑ دیا۔ ورنہ اس وقت میں جانے کہاں بھٹک رہا ہوتا۔''

''اللہ اس فقیر کو خوش رکھے جس نے مجھے میرا بیٹا لوٹا دیا۔'' نازنین کے دل سے دعا نکلی۔ ''بیٹا آئندہ تمہیں وہ فقیر کہیں دکھائی دے تو اسے گھر لے آنا۔''

''عابر۔ تم آخر کہاں غائب ہو گئے تھے۔ تم نے ہم پر بہت ظلم کیا۔'' صائمہ نے کہا۔

''آپی۔ ظلم مجھ پر بھی بہت ہوا۔ گھر چھوڑ کر مجھے بھی چین نہ ملا۔'' عابر بولا۔ ''لیکن یہ گڑھا خود میں نے کھودا تھا۔ کسی سے کیا شکوہ کرتا۔''

''ہوا کیا؟'' صائمہ بے چین تھی اس کی آپ بیتی سننے کے لئے۔

''صائمہ۔ یہ ابھی گھر آیا ہے۔'' نازنین نے ٹوکا۔ ''اس سے یہ تو پوچھو کہ کھانا کھایا ہے کہ نہیں؟''

''نہیں امی۔ میں نے کھانا نہیں کھایا۔ میں بہت بھوکا ہوں۔'' عابر کو یکدم اپنے پیٹ کا خیال آ گیا۔

''چل صائمہ۔ عابر کو کھانا گرم کر کے دے دے۔ اور یہ تیرے ابو کہاں ہیں؟'' نازنین نے کہا۔

''جی امی۔ ابو لاؤنج میں ہیں۔'' صائمہ نے بیڈ روم کے دروازے پر پہنچ کر لاؤنج میں نظر ڈالی۔

کھانا کھانے کے بعد عابر اپنے کمرے میں آ گیا۔ اس کمرے میں ہر چیز ویسی ہی رکھی تھی جیسی وہ چھوڑ کر گیا تھا۔ بس اس کی کمی تھی تو وہ لوٹ آیا تھا۔ کمرے میں صائمہ کے بچے سو رہے تھے۔ عابر نے سوتے بچوں کو پیار کیا۔ اتنے میں صائمہ اس کے لیے چائے لے کر آ گئی۔

بس پھر دونوں کی رات آنکھوں میں کٹی۔ عابر نے اپنی بڑی بہن سے کچھ نہیں چھپایا۔ وہ چھپا بھی نہیں سکتا تھا۔ اس کا دل تو پہلے ہی بھرا ہوا تھا۔ وہ خود ایسے ہمدرد سامع کی تلاش میں تھا جس کے سامنے وہ اپنا دل کھول کر رکھ دے۔ صائمہ سے اچھی سامع اسے کہاں مل سکتی تھی۔ وہ اس سے دو سال بڑی ضرور تھی لیکن عابر اس سے ہر بات کہہ لیا کرتا تھا۔

ساری رام کہانی سن کر صائمہ نے ان تلخ حقائق کو بھول جانے کی اور سرد آہ بھر کر بولی۔ ''عابر اس بات کو کبھی مت بھولنا کہ والدین اولاد کے حق میں ہمیشہ اچھا سوچتے ہیں۔ ابو کو وہ لوگ مشکوک دکھائی دیئے تھے۔ وقت نے ان کی بات سچ ثابت کر دی۔ کیسے کیسے لوگ اس دنیا میں پڑے ہیں۔''

''ہاں آپی۔ ابو اور امی نے جو کہا سچ کہا۔ میری آنکھوں پر پردہ پڑ گیا تھا۔'' عابر کے لہجے میں دکھ کے ساتھ شدید پچھتاوا تھا۔

''بس اب خوابوں کے پیچھے بھاگنا چھوڑ دو۔ اپنی زندگی سنوارو۔ اپنا کیریئر بناؤ، دیکھنا تمہیں ہزار ملکائیں مل جائیں گی۔'' صائمہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''نہیں آپی۔ اب مجھے ملکہ نہیں چاہئے۔ اللہ بچائے ملکہ جیسی لڑکیوں سے۔'' عابر پُرعزم لہجے میں بولا۔

علی نثار، نازنین اور صائمہ، سب بہت خوش تھے کہ عابر کی کایا پلٹ گئی تھی۔ اس نے عملی زندگی میں قدم رکھ دیا تھا۔ خوابوں کی دنیا میں رہنا چھوڑ دیا تھا۔

لیکن وہ خواب عابر کو مسلسل تین روز سے نظر آ رہا تھا۔ وہ اپنے دادا نثار ایوب کو عجب انداز سے دیکھ رہا تھا۔ پریشان ہو کر اس نے اس خواب کا تذکرہ اپنے باپ علی نثار سے کیا تو وہ حیرت زدہ رہ گئے۔

انہوں نے عابر سے سوال کیا۔ ''لیکن بیٹا تم نے تو اپنے دادا کو نہیں دیکھا، پھر خواب میں تم نے کیسے پہچان لیا کہ وہ تمہارے دادا ہیں؟''

''میں نے پہچانا نہیں، بس یہ احساس ہے کہ دادا ہیں۔'' عابر نے بتایا۔

''ان کے ساتھ کوئی ہے؟'' علی نثار نے پوچھا۔

''کوئی بزرگ ہیں ان کے ساتھ۔'' وہ بولا۔

''یہ خواب تم کب سے دیکھ رہے ہو؟''

''ابو۔ مجھے تین دن ہو گئے اس خواب کو دیکھتے ہوئے۔ ایک جیسا خواب اور خواب دیکھنے کا وقت بھی تقریباً ایک ہے۔ صبح پانچ سوا پانچ بجے یہ خواب نظر آتا ہے۔ میری آنکھ کھلتی ہے تو مجھے خوف محسوس ہوتا ہے۔''

''کیا دیکھتے ہو؟'' علی نثار نے پوچھا۔

''ابو۔ میں دیکھتا ہوں کہ جیسے دادا ہیں، ان کے ہاتھوں میں کوئی بچہ ہے۔ پاس کھڑے بزرگ دادا کو مخاطب کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ قبر کھودنی ہے اور اس شیطان کو زندہ دفن کرنا ہے۔ بس اس کے بعد میری آنکھ کھل جاتی ہے۔'' عابر نے خوفزدہ انداز میں بتایا۔

عابر تین دن سے جو خواب دیکھ رہا تھا۔ وہ حقیقت پر مبنی تھا لیکن علی نثار کو حیرت اس بات پر تھی کہ اس واقعہ سے عابر قطعاً ناواقف تھا اور ان کے والد نثار ایوب کا انتقال عابر کی پیدائش سے پہلے ہو گیا تھا۔ عابر نے اپنے دادا کو بس تصویروں میں ہی دیکھا تھا اور یہ تصویریں دیکھے ہوئے بھی اسے ایک عرصہ بیت گیا تھا۔ اس واقعہ سے نازنین کسی حد تک واقف تھیں لیکن

انہیں بھی یہ معلوم نہ تھا کہ اس بچے کے ساتھ کیا معاملہ کیا گیا تھا۔ اس قصے سے اگر کوئی پوری طرح واقف تھا تو وہ علی نثار تھے۔

یہ قصہ علی نثار کی شادی سے شروع ہوا۔ علی نثار کے لیے ان کی شادی جی کا جنجال بن گئی۔ اس شادی میں عشق وشق کا کوئی دخل نہ تھا۔ یہ رشتہ والدین کی مرضی سے ہوا تھا۔ نازنین، علی نثار کے والد نثار ایوب کو شروع ہی سے پسند تھیں۔ وہ ان کے ایک قریبی دوست کی بیٹی تھیں۔ خوبصورت ہونے کے ساتھ سلیقہ مند تھیں۔ علی نثار نے نازنین کو دیکھ رکھا تھا۔ انہیں کوئی اعتراض نہ تھا۔ نازنین اسکول میں ٹیچر تھیں۔ علی نثار یا گھر کے لوگوں کو ان کی ملازمت پر اعتراض نہ تھا۔ لہٰذا اسکول میں ٹیچنگ کرتی رہیں۔

شادی کی رات جب علی نثار نے نازنین کے چہرے سے گھونگھٹ اٹھایا تو ان کے حسن میں کھو گئے۔ ان کے اصرار پر نازنین نے جھکی آنکھیں اٹھائیں اور علی نثار کے چہرے پر نظر کی تو ان کے ہوش اُڑ گئے۔ علی نثار بے شک پُرکشش نوجوان تھے لیکن اتنے بھی حسین نہیں کہ کوئی ان کے حسن کی تاب نہ لا کر بے ہوش ہو جائے۔

نازنین، علی نثار کا چہرہ دیکھتے ہی بے ہوش ہو گئی تھیں۔ علی نثار کی سمجھ میں ان کی بے ہوشی کی وجہ نہ آئی۔ آخر ایسا انہوں نے کیا دیکھا تھا کہ ان کے حواس جاتے رہے۔ خیر گھر والوں کی مدد سے وہ انہیں ہوش میں لائے۔ پھر وہیں سے سلسلہ شروع کیا جہاں سے ٹوٹا تھا۔ اس بار عافیت رہی۔ علی نثار کو ہر وہ خوشی مل گئی جو انہیں درکار تھی۔

صبح ناشتے کے بعد جب انہوں نے نازنین سے بے ہوشی کی وجہ دریافت کی تو یکدم ان کا چہرہ فق ہو گیا۔ ان کے چہرے کا رنگ اُڑتے دیکھ کر علی نثار نے اِدھر اُدھر کی باتیں شروع کر دیں۔ جب فضا سازگار ہو گئی تو پھر انہوں نے بے ہوشی کی وجہ پوچھی اور ساتھ ہی کہا۔ ''حقیقت چاہے جتنی تکلیف دہ ہو بلا جھجک بیان کر دو۔ آج کی تکلیف کل کی راحت بنے گی۔''

''میں خود بھی بتانا چاہتی ہوں۔ لیکن ڈرتی ہوں کہ کہیں آپ ناراض نہ ہو جائیں۔'' نازنین نے جھجکتے ہوئے کہا۔

''نہیں۔ میں ناراض نہیں ہوں گا، چاہے حقیقت کتنی ہی تلخ کیوں نہ ہو۔'' علی نثار نے پُریقین انداز میں کہا۔

''ٹھیک ہے میں بتاتی ہوں۔'' نازنین نے یہ کہتے ہوئے فوراً علی نثار کے چہرے سے نظریں ہٹالیں اور دھیرے سے بولیں۔ ''میں نے جب آپ کا چہرہ دیکھا تو.....''

علی نثار نے محسوس کیا کہ وہ بولنا چاہ رہی ہیں لیکن بول نہیں پا رہیں۔ انہوں نے نازنین کا ہاتھ تھام لیا اور بولے۔ ''اچھا جب تم نے میرا چہرہ دیکھا تو پھر کیا ہوا۔ کیا میرے سر پر سینگ نکل آئے تھے؟''

''نہیں۔ میں نے آپ کے پیچھے ایک اور چہرہ دیکھا۔ انتہائی ڈراؤنا۔ وہ چہرہ کسی بن مانس سے ملتا تھا۔ اسے دیکھ کر میں اپنے ہوش گنوا بیٹھی۔'' نازنین اتنا بتا کر تھر تھر کانپنے لگیں۔

ابھی تو نازنین نے ہوش گنوائے تھے۔ ایک رات علی نثار کے حواس قابو میں نہ رہے۔ ایک رات سوتے ہوئے اچانک علی نثار کی آنکھ کھلی۔ کمرے میں بلیو نائٹ بلب روشن تھا۔ انہوں نے دائیں جانب لیٹی نازنین پر نظر کی، وہ بڑے پُرسکون انداز میں محوِ خواب تھیں۔

علی نثار دیوار گیر گھڑی پر نظر ڈالتے ہوئے اٹھ بیٹھے۔ گھڑی میں ڈیڑھ بجا تھا۔ انہوں نے واش روم کا رخ کیا۔ پانچ منٹ کے بعد جب وہ واش روم سے باہر آئے تو ان کی نظر نازنین پر پڑی جو کمرے میں ٹہل رہی تھیں۔ انہیں بڑی حیرت ہوئی کیونکہ نازنین جس پُرسکون انداز میں گہری نیند سو رہی تھیں، ان کی نیند ٹوٹنے کا امکان نہ تھا۔ شاید واش روم کی ضرورت نے انہیں اٹھایا اور واش روم خالی نہ پا کر وہ انتظار میں ٹہلنے لگیں۔ یہ کوئی پریشان کن بات نہ تھی۔

ہوش ان کے اس وقت اُڑے جب انہوں نے نازنین کو اسی طرح محوِ استراحت پایا جیسا وہ انہیں چھوڑ کر گئے تھے۔ اب صورت حال یہ تھی کہ ایک نازنین ٹہل رہی تھی اور ایک نازنین سو رہی تھی۔

کمرے میں دو نازنین تھیں اور یہ بات ان کے اعصاب چٹخانے کے لیے کافی تھی۔ وہ فوراً ہی دروازہ کھول کر کمرے سے نکل گئے۔ گھر کے سب افراد سو رہے تھے۔ انہوں نے کسی کو ڈسٹرب کرنا مناسب نہ سمجھا۔ فریج سے ٹھنڈی بوتل نکال کر علی نثار نے دو گلاس پانی پیا۔ حواس بحال ہوئے تو سوچا یہ کیا ہوا؟ بھلا ایسے کیسے ہو سکتا ہے کہ ایک نازنین کی دو نازنین بن جائیں۔ ضرور یہ ان کی نظروں کا فتور ہو گا۔ یہ فیصلہ کر کے کہ چلو پھر چل کر دیکھتے ہیں۔ وہ اپنے کمرے کی طرف بڑھے۔

اتنے میں نازنین دروازہ کھول کر باہر آئیں اور انہیں لاؤنج میں دیکھ کر بولیں۔ ''کیا ہوا؟''

''ایک منٹ۔'' علی نثار نے کہا اور کمرے میں داخل ہو گئے۔ بیڈ خالی تھا۔ وہ فوراً واپس آ گئے اور بولے۔ ''نازنین لگتا ہے میری آنکھیں خراب ہو گئی ہیں۔''

''کیوں.....کیا ہوا؟'' نازنین نے حیرت سے پوچھا۔

''مجھے ایک کے دو دو نظر آنے لگے ہیں۔'' علی نثار نے بتایا۔

''اس وقت میں آپ کو کتنی نظر آ رہی ہوں؟'' نازنین نے ہنس کر کہا۔

''فی الحال تو ایک ہی نظر آ رہی ہو۔ لیکن کچھ دیر قبل.....''

''اللہ کے واسطے۔ میرے بارے میں کوئی خوفزدہ کرنے والی بات مت کیجیے گا۔'' نازنین نے علی نثار کی بات کاٹ کر کہا۔

علی نثار نہ چاہتے ہوئے بھی جانے کیوں خاموش ہو گئے۔ پھر انہوں نے اس بات کو فریب نظر سمجھ کر دماغ سے نکالنا چاہا لیکن یہ بات فریب نظر نہ تھی، حقیقت پر مبنی تھی۔

ایک رات پھر انہوں نے نازنین کو اسی طرح ٹہلتے اور اسی طرح لیٹے دیکھا۔ تب انہوں نے اس صورتحال کا ذکر نازنین سے کیا، نہ اپنی ماں کو بتایا۔ انہوں نے اس مسئلے پر براہ راست اپنے والد نثار ایوب سے بات کی۔ ان کے والد کے ذہن میں پہلی رات کو علی نثار کو دیکھ کر بے ہوش ہو جانے والا واقعہ محفوظ تھا۔

نثار ایوب نے اپنے بیٹے علی نثار سے دو چار سوالات کیے اور پھر بس اتنا کہا۔ ''پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔''

علی نثار اپنے باپ سے بات کر کے مطمئن ہو گئے لیکن پریشانیوں کا سلسلہ تھما نہیں۔

ایک دن اسکول میں نازنین کلاس لے کر نکلیں اور نیچے اسکول کے دفتر میں جانے کے لیے سیڑھیاں اترنے لگیں تو انہیں ایسا احساس ہوا جیسے کسی نے پیچھے سے دھکا دے دیا ہو جبکہ پیچھے کوئی نہ تھا۔ وہ دو چار سیڑھیاں نیچے گریں۔ ان کے گھٹنے میں چوٹ آئی۔

شام کو نازنین نے علی نثار کو گھٹنے کی چوٹ دکھائی اور کسی کے دھکا دینے کی بات بتائی۔ گھٹنے کی چوٹ تو دو چار دن میں ٹھیک ہو گئی لیکن گھٹنے کا درد نہ گیا بلکہ درد بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی۔ یہ واقعہ دوبارہ اسی طرح پیش آیا۔ سیڑھیاں اترتے ہوئے نازنین کو کسی نے دھکا دیا۔ وہ دو چار سیڑھیاں نیچے گریں۔ اس بار دوسرے گھٹنے میں چوٹ آئی۔ چوٹ دو چار دن میں ٹھیک ہو گئی لیکن گھٹنے کا درد نہ گیا۔ گھٹنوں کی یہ تکلیف اس قدر بڑھی کہ اٹھنا بیٹھنا دوبھر ہو گیا۔ نوعمری میں گویا پیرانہ سالی نے آ گھیرا۔

جب اٹھنا بیٹھنا محال ہوا تو نازنین نے اسکول سے چھٹی لے لی۔ علی نثار نے اپنے والد نثار ایوب کو دھکا دیے جانے والے واقعات گوش گزار کر دیے تھے۔ جواب میں نثار ایوب

نے دونوں بار بس یہی کہا تھا۔ ''پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔''

''ابا جان۔ آخر کب تک پریشان نہیں ہوں گا۔ نازنین اسکول جانے کے قابل نہیں رہی ہے۔'' علی نثار نے پریشان ہو کر کہا۔

''تو اچھا ہے۔ ہمیں بہو کی نوکری کی کون سی ضرورت ہے۔'' نثار ایوب نے آرام سے جواب دیا۔

''ابا جان۔ چلیں نوکری کو چھوڑیں۔ اس کے لیے اٹھنا بیٹھنا دشوار ہے۔'' علی نثار نے دوسری دلیل دی۔

''اچھا چلو۔ میں کسی اور اچھے ڈاکٹر کا پتا کرتا ہوں۔'' نثار ایوب نے دوسرا راستہ اختیار کیا۔

''ابا جان۔ کئی اچھے ڈاکٹروں کو دکھایا جا چکا ہے۔ سارے ٹیسٹ ہو چکے ہیں۔ ہر ڈاکٹر یہ کہتا ہے کہ ان کے گھٹنوں میں کوئی مرض نہیں۔'' علی نثار نے وہ بات بتائی جسے نثار ایوب اچھی طرح جانتے تھے۔

''کسی بڑے اسپتال میں نہ دکھالیں؟'' نثار ایوب نے پھر نیا راستہ دکھایا۔

''ابا جان۔ آپ پروفیسر صاحب سے کیوں بات نہیں کرتے؟'' علی نثار کو بالآخر وہ کہنا پڑا جو کہنا نہیں چاہتے تھے۔

''پروفیسر مجاہد کی بات کر رہے ہو؟'' نثار ایوب نے سوال کیا۔

''جی ابا جان۔ میں انہی کی بات کر رہا ہوں۔ یہ کیس ڈاکٹروں کے بس کا نہیں۔''

''بھئی میں ان سے کئی بار بات کر چکا ہوں۔ ہر بار بس اتنا کہہ کر چپ ہو جاتے ہیں کہ اچھا دیکھتا ہوں۔'' نثار ایوب نے بتایا۔

''ان سے پوچھیں آخر کب تک دیکھیں گے؟'' علی نثار نے اکسایا۔ ''آخر وہ آپ کے دوست ہیں۔''

''وہ میرے دوست ضرور ہیں لیکن اپنی مرضی کے مالک ہیں۔ میں انہیں مجبور نہیں کر سکتا۔'' نثار ایوب نے صاف گوئی سے کہا۔ پھر علی نثار کو تسلی دیتے ہوئے بولے۔ ''اچھا، میں ایک بار پھر بات کرتا ہوں۔''

لیکن پھر بات کرنے کی نوبت نہ آئی۔ اتوار کے دن صبح ہی صبح پروفیسر مجاہد گھر تشریف لے آئے۔ علی نثار نے گیٹ کھولا۔ سامنے پروفیسر مجاہد کو پایا تو انہیں دیکھ کر علی نثار کا دل باغ باغ ہو گیا۔ بڑے ادب سے سلام کیا۔

''ارے بھئی۔ گھر پر تمہارے ابا ہیں؟'' پروفیسر مجاہد نے سلام کا جواب دے کر پوچھا۔

''جی جی۔ ہیں۔ آپ اندر آ جائیے۔ میں انہیں ڈرائنگ روم میں بھیجتا ہوں۔'' علی نثار نے کہا۔

پروفیسر مجاہد نے بیٹھتے ہوئے کہا۔ ''بیٹا۔ ایک گلاس پانی مل جائے گا؟''

''جی کیوں نہیں۔'' علی نثار نے جواب دیا۔

کچھ دیر بعد دونوں باپ بیٹے ایک ساتھ ڈرائنگ روم میں داخل ہوئے۔ علی نثار نے پانی سے بھرا گلاس جو شیشے کی خوبصورت پلیٹ میں رکھا اور جھالردار سرپوش سے ڈھکا تھا، میز پر رکھا۔

پروفیسر مجاہد نے ایک نظر گلاس پر ڈالی۔ پھر نثار ایوب سے مخاطب ہو کر بولے۔ ''آپ کی بہو کہاں ہیں، ذرا انہیں بلائیے۔''

''بہو کا یہاں آنا دشوار ہوگا۔ آپ اندر چل کر دیکھ لیجیے۔'' نثار ایوب نے ان کا مقصد سمجھتے ہوئے جواب دیا۔

''بھئی آپ لوگوں نے خواہ مخواہ انہیں بیمار بنا رکھا ہے۔'' یہ کہہ کر انہوں نے گلاس اٹھایا اور سرپوش ہٹا کر ایک پھونک ماری اور بولے۔ ''جائیے بیٹا، اپنی بیگم کو پانی پلائیے، اور پھر دیکھیے تماشا۔ وہ دوڑی ہوئی چلی آئیں گی۔''

علی نثار نے گلاس ان کے ہاتھ سے لے لیا اور تیزی سے اندر کی طرف قدم بڑھائے۔

نازنین بیڈ پر بیٹھی ہوئی تھیں۔ انہوں نے گلاس کا سرپوش اٹھا کر کہا۔ ''نازنین۔ یہ پانی پی لیں۔''

نازنین نے عجیب انداز سے گلاس کی طرف دیکھا اور مشکوک لب و لہجے میں بولیں۔ ''کیسا پانی ہے یہ؟''

''یہ پڑھا ہوا پانی ہے۔ پروفیسر مجاہد نے دیا ہے۔ وہ ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہیں۔ تمہیں بلا رہے ہیں۔'' علی نثار نے گلاس ان کے ہاتھ میں دے دیا۔

''اچھا۔'' نازنین نے گلاس ہاتھ میں لیتے ہوئے پانی کی طرف دیکھا۔ ان کی آنکھوں میں ہلکا سا شک یقین میں بدلا اور چند لمحوں بعد انہوں نے گلاس لبوں سے لگا لیا۔

علی نثار، نازنین کو بغور دیکھ رہے تھے۔ یا نی بی کر ان کے چہرے پر جو ایک کرب کی سی کیفیت مسلسل درد رہنے کی وجہ سے منجمد ہو گئی تھی، وہ پگھلتی ہوئی محسوس ہوئی۔

PDF BY Mahzooi

اور پھر علی نثار نے حیرت انگیز منظر دیکھا کہ نازنین کسی سہارے کے بغیر بیڈ سے اتر کر سیدھی کھڑی ہوگئیں۔ انہوں نے دوپٹہ سر پر رکھا تھا۔ ہلکا سا گھونگھٹ نکالا اور علی نثار کی طرف دیکھ کر بولیں۔ ''آیئے چلیں۔''

پھر ویسا ہی ہوا جیسا پروفیسر مجاہد نے کہا تھا۔ وہ بڑے اطمینان سے چلتی ہوئی ڈرائنگ روم میں داخل ہوئیں۔ نازنین کو بغیر سہارے کے یوں آتا دیکھا تو نثار ایوب بولتے بولتے رک گئے اور حیرت زدہ نظروں سے اپنی بہو کو دیکھنے لگے۔

''بیٹھئے بیٹا۔'' پروفیسر مجاہد نے سامنے والے صوفے کی طرف اشارہ کیا۔

نازنین بہت ادب سے مسکرا کر سمٹ کر بیٹھ گئیں اور سر قدرے جھکا لیا۔

پروفیسر مجاہد نے چند لمحوں کے لیے اپنی آنکھیں بند کیں۔ پھر یک لخت آنکھیں کھول کر نازنین کے چہرے کی طرف دیکھا۔ نازنین کا آدھا چہرہ دوپٹے سے ڈھکا ہوا تھا۔ پھر انہوں نے ہاتھوں کی طرف توجہ کی اور کہا۔ ''بیٹا۔ ذرا اپنا بایاں ہاتھ آگے کیجئے۔''

نازنین نے اپنا بایاں ہاتھ جو چوڑیوں سے بھرا تھا، تھوڑا سا آگے کر دیا۔

پروفیسر مجاہد نے ہاتھ کے ناخنوں کو بغور دیکھا۔ پھر ان کی نظر انگوٹھے کے ناخن پر جم گئی۔ وہ کچھ دیر ناخن دیکھتے رہے اور پڑھتے رہے۔ پھر بولے۔ ''آپ کو کیا تکلیف ہے؟''

اس سے قبل کہ نازنین کوئی جواب دیتیں، نثار ایوب بول پڑے۔ ''ہماری بہو کے گھٹنوں میں شدید تکلیف ہے۔ یہ.....''

''نثار صاحب۔ میں نے آپ سے تو یہ سوال نہیں کیا۔'' پروفیسر مجاہد نے ان کی بات کاٹ کر کہا۔ ''یہ سوال میں نے آپ کی بہو سے کیا ہے۔ انہیں بولنے دیجئے۔''

''اس وقت تو مجھے کوئی تکلیف نہیں۔'' نازنین نے دھیمے لہجے میں جواب دیا۔

''سمندر بہت اچھا لگتا ہے آپ کو؟'' پروفیسر مجاہد نے پوچھا۔

''جی۔'' نازنین نے مختصراً جواب دیا۔

''سمندر پر گئے ہوئے کتنا عرصہ ہوگیا؟''

''کافی دن ہوگئے۔ میرا خیال ہے کہ آٹھ دس مہینے ہوگئے ہوں گے۔ میں شادی سے پہلے اپنی فیملی کے ساتھ پکنک پر ہاکس بے گئی تھی۔'' نازنین نے کچھ اس انداز میں جواب دیا کہ ہر اس سوال کا جواب آگیا جو پروفیسر مجاہد کے ذہن میں تھا۔

''ٹھیک ہے بیٹا۔ آپ جایئے۔'' یہ کہہ کر پروفیسر مجاہد نے پھر علی نثار کی طرف دیکھا۔ ''آپ بھی جایئے۔''

جب نازنین اور علی نثار ڈرائنگ روم سے نکل گئے تو پروفیسر مجاہد نے نثار ایوب کو مسکرا کر دیکھا اور بولے۔ ''پیارے بھائی۔ دیکھنے میں کچھ وقت لگتا ہے نا۔ پھر یہ ہماری بہو کا معاملہ تھا، اس پر خصوصی توجہ درکار تھی۔ اب میں نے بہت کچھ دیکھ لیا ہے۔ آپ حکم کریں تو کچھ عرض کروں؟''

''جی۔ پروفیسر صاحب فرمایئے۔'' نثار ایوب نے سنجیدگی سے کہا۔

جواب میں پروفیسر مجاہد نے جو فرمایا وہ خاصا ہوشربا تھا۔

o.....o.....o

دونوں پولیس والوں کو اپنے گھر کے دروازے پر دیکھ کر مائی پنکھی مسکرائی۔ دلدار بخش کا انداز بالکل بدلا ہوا تھا۔ وہ جو اس کے قتل کے درپے تھا، اب خود ''مقتول'' ہوگیا تھا۔ دلدار بخش کے ساتھ جو پولیس والا تھا، اس کا رویہ بھی ''فدویانہ'' تھا۔

مائی پنکھی دونوں کو اندر لے آئی۔ اس نے دیوار سے لگی چارپائی کو دیوار سے ہٹا کر دونوں کو بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ دلدار بخش اور خالد قریشی دائیں بائیں سرہانے کی طرف بیٹھ گئے۔ مائی پنکھی پائینتی کی جانب پٹی پر بیٹھ گئی۔ خالد قریشی بغور اس ''عجوبۂ روزگار'' بڑھیا کو دیکھ رہا تھا۔ دلدار کے مقابلے میں اس کا مشاہدہ زیادہ تیز تھا۔

اسی سال کی ایسی چاق و چوبند بڑھیا جس کی کمر تیر کی طرح سیدھی اور آنکھوں میں مردنی کے بجائے بھرپور زندگی تھی۔ ایسی بڑھیا اس نے آج تک نہ دیکھی تھی۔ یہ بڑھیا اسے بڑے کام کی نظر آئی۔

''او۔ مائی، تیرا نام کیا ہے؟'' دلدار بخش نے بڑے نرم لہجے میں پوچھا۔

''بڑی جلدی تجھے میرے نام کا خیال آگیا۔'' مائی پنکھی نے طنزاً کہا۔

''کاکا۔ میرا نام پنکھی ہے۔'' مائی پنکھی نے بتایا۔ ''سب مجھے مائی پنکھی کہتے ہیں۔''

''مائی پنکھی تیرا شکریہ۔'' دلدار بخش نے مٹھائی کا ڈبا اس کے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔ ''تو اس دن کمال نہ دکھاتی تو میرا بیٹا تو گیا تھا جیل میں۔''

''کاکا۔ یہ کون ہے؟'' مائی پنکھی نے خالد قریشی کی طرف اشارہ کیا۔

''مائی پنکھی۔ یہ میرا دوست ہے، تھانے دار خالد قریشی۔ یہ تجھ سے ملنے کا خواہش مند تھا۔'' دلدار بخش نے تعارف کرایا۔ پھر مٹھائی کا ڈبا اٹھا کر اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔

''یہ تیرے لیے مٹھائی لایا ہوں۔ لاہور کی سب سے بڑی دکان کی ہے۔''

مائی پنکھی نے ڈبا اس کے ہاتھ سے لے کر چارپائی پر رکھ دیا اور بولی۔ ''کاکا۔ میں تو مٹھائی نہیں کھاتی۔''

مائی پنکھی کا جواب سن کر خالد قریشی کی نوک زباں پر بے اختیار جملہ آیا۔ ''تو پھر کیا زہر کھاتی ہے۔'' لیکن وہ کہتے کہتے رک گیا۔ اور بولا۔ ''مائی پنکھی، پھر تو کیا کھاتی ہے؟''

''کاکا۔ میں سنکھیا کھاتی ہوں۔'' مائی پنکھی نے بڑی سادگی سے کہا۔

خالد قریشی بڑا حیران ہوا۔ اس کا مطلب ہے اس نے جو سوچا، سچ سوچا تھا۔ پھر بھی اس نے وضاحت چاہی۔ ''سنکھیا یعنی زہر۔''

''ہاں۔ سنکھیا کے علاوہ میں افیون بھی کھاتی ہوں۔ بس تو یوں سمجھ لے مٹھائی میرے لئے زہر ہے۔''

''پھر ہیروئن پیا کر۔''

''ہش۔'' مائی پنکھی عجیب انداز میں بولی۔ ''ہیروئن بچے پیتے ہیں۔ کاکا۔ اگر تجھے کہیں سے اصلی افیون مل جائے تو لے آنا۔''

''مائی پنکھی۔ یہ کوئی مسئلہ ہی نہیں۔'' دلدار بخش نے کہا۔ ''اچھا۔ مٹھائی نہیں کھاتی تو نہ کھا۔ ہمیں تو کھلا۔''

''اچھا۔'' مائی پنکھی نے ڈبا کھولا تو اس میں مٹھائی کے اوپر ایک لفافہ رکھا دکھائی دیا۔ اس نے پوچھا۔ ''کاکا۔ اس میں کیا ہے؟''

''مائی پنکھی..... کھول کر دیکھے گی تو پتا چلے گا نا۔'' دلدار بخش بولا۔

مائی پنکھی نے لفافہ کھول کر دیکھا تو اس میں ہزار روپے کے پانچ نوٹ رکھے نظر آئے۔ مائی پنکھی نے لفافہ جوں کا توں بند کر کے مٹھائی پر رکھا اور ہنس کر بولی۔ ''کاکا۔ پولیس تو رشوت لیتی ہے۔ یہ اس نے دینا کب سے شروع کر دیا۔''

''مائی پنکھی پولیس بھی انسان ہے۔ اس کی بھی کہیں گوٹ پھنس سکتی ہے۔'' خالد قریشی بولا۔

''اس کا مطلب ہے کہ تم لوگوں کی کوئی گوٹ پھنسی ہے۔ تبھی مٹھائی اور پیسے لے کر آئے ہو۔ او، کاکا۔ یہ اٹھا میرے سامنے سے۔ مجھے پیسہ چاہیے نہ مٹھائی۔ چل اپنا کام بتا۔''

جب خالد قریشی نے ''کام'' بتایا تو مائی پنکھی کے چہرے پر کئی رنگ آکر گزر گئے۔

PDF BY Manzoor

وہ سوچنے لگی۔ پولیس والے کس قسم کا کام اس کے پاس لے کر آئے ہیں؟ اگر کوئی فلمی ہیروئن کسی نجی محفل میں رقص کرنے کے لئے راضی نہیں تو وہ اسے کیسے مجبور کر سکتی ہے۔

''او۔ کاکا۔ وہ تم پولیس والوں کے قابو نہیں آتی تو میں بھلا کیا کر سکتی ہوں۔'' مائی پنکھی کو بالآخر کہنا پڑا۔

''اس کی پہنچ بہت اوپر تک ہے۔ سمجھ رہی ہے نا تو بات کو۔ ہم اگر کوئی ہتھکنڈا استعمال کریں تو لینے کے دینے پڑ سکتے ہیں۔'' خالد قریشی نے اندر کا حال کھولا۔

''تو پھر اس کی جان چھوڑ دو۔ ناچنے والیاں بہت۔'' مائی پنکھی نے اپنی جان چھڑانے کی کوشش کی۔

''مائی پنکھی۔ نئی ناچنے والیوں کا ہم نے انتظام کر لیا ہے۔ یہ سرکاری افسروں کی خاص محفل ہے۔ سب سے اونچے افسر کی فرمائش ہے کہ سمیرا کو ہر قیمت پر شامل کیا جائے۔'' خالد قریشی نے اپنی بے بسی ظاہر کرتے ہوئے کہا۔ ''مائی پنکھی! تو کچھ ایسا کام دکھا دے کہ وہ جانے پر مجبور ہو جائے۔''

''اسے اچھے پیسے دو۔ چلی جائے گی۔'' مائی پنکھی اپنے پروں پر پانی نہیں پڑنے دینا چاہتی تھی۔

''میں نے خود اسے منہ مانگے پیسوں کی پیشکش کی ہے، پر وہ پیسوں کی بات ہی نہیں کرتی۔ وہ کہتی ہے کہ مجھے ایک کروڑ روپے دو گے تب بھی نہیں جاؤں گی۔ میں نجی محفلوں میں پرفارم نہیں کرتی۔ مائی پنکھی، بڑی نخریل ہے وہ۔'' خالد قریشی نے بتایا۔

''اب تو کیا چاہتا ہے کہ میں اس کے نخرے توڑ دوں؟'' اس نے اپنی چمکیلی آنکھوں سے خالد قریشی کو دیکھا۔

''ہاں مائی پنکھی، یہ ہوئی نا بات۔ کچھ ایسا کر دے کہ وہ انکار نہ کر سکے۔''

''اچھا چل تو بھی کیا یاد کرے گا۔'' مائی پنکھی اپنی جون میں آ گئی۔ ''لا۔ ایک کاغذ دے مجھے۔ سادہ، کچھ لکھا نہ ہو اس پر۔''

خالد قریشی نے اپنی جیبیں کھنگال ڈالیں۔ جیبوں میں کاغذ تو تھے لیکن سادہ نہ تھے۔ تب دلدار بخش نے اپنی قمیض کی جیب سے چھوٹی ڈائری نکالی اور بولا۔ ''مائی۔ اتنے بڑے کاغذ سے کام چل جائے گا؟''

مائی پنکھی نے کھلی ہوئی ڈائری پر ایک نظر ڈالی اور کہا۔ ''ہاں۔ کاکا۔''

دلدار بخش نے ڈائری کا سادہ ورق پھاڑ کر مائی پنکھی کی طرف بڑھایا۔

مائی پنکھی کاغذ ہاتھ میں تھام کر چارپائی سے اٹھی اور بغیر کچھ کہے اندر کمرے میں چلی گئی۔

کچھ دیر کے بعد جب وہ واپس آئی تو کاغذ کی چار تہہ کر کے اس پر کالا دھاگا لپیٹا ہوا تھا۔ اس نے دھاگے میں لپٹا ہوا کاغذ خالد قریشی کی طرف بڑھایا اور تنبیہی انداز میں بولی۔ ''لے کاکا۔ یہ پریم پتر اس کو دے دینا۔ کیا نام ہے اس کا؟''

''سمیرا۔'' خالد قریشی جلدی سے بولا۔

''ہاں۔ سمیرا۔'' مائی پنکھی کو یاد آیا۔ ''بے شک وہ مجھے نہیں جانتی لیکن اس سے کہنا یہی کہ مائی پنکھی نے بھیجا ہے۔ اسے کھول کر اچھی طرح دیکھ لے۔ اور ہاں..... میری ایک بات تو غور سے سن لے۔ اگر تو نے اسے کھول کر دیکھنے کی کوشش کی تو پھر تجھے ناقابل تلافی نقصان پہنچ سکتا ہے۔ میرے پاس لوٹ کر مت آنا۔''

''نہیں میں ایسی غلطی ہرگز نہیں کروں گا۔ پر مائی وہ جانے پر راضی ہو جائے گی؟'' خالد قریشی نے تصدیق چاہی۔

''یہ تو اسی وقت پتا چلے گا جب تو یہ پریم پتر اسے دے گا۔'' مائی پنکھی نے اقرار نہ کیا۔

''ٹھیک ہے مائی۔ ہم اب چلتے ہیں۔ تیرا بہت شکریہ۔'' خالد قریشی اٹھا تو اس کے ساتھ دلدار بخش بھی کھڑا ہو گیا۔ انہوں نے مٹھائی کا ڈبا نہ اٹھایا۔

جب وہ جانے لگے تو مائی پنکھی نے پیچھے سے آواز لگا کر کہا۔ ''کاکا۔ یہ مصیبت اٹھاؤ یہاں سے۔ میری طرف سے اپنے بچوں کو کھلا دینا اور یہ پیسے پی پلا کر ختم کر دینا۔''

''اچھا۔ مائی پنکھی جیسی تیری مرضی۔ ہم تجھے ناراض نہیں کرنا چاہتے۔'' خالد قریشی خوشامدانہ لہجے میں بولا۔ ''میں بہت جلد تیرے لئے اعلیٰ قسم کی افیون لے کر آؤں گا۔''

''ہاں۔ کاکا۔ یہ ٹھیک ہے۔'' مائی پنکھی کی آنکھوں کی چمک بڑھ گئی۔

جب وہ دونوں گاڑی میں بیٹھنے لگے تو دلدار بخش بولا۔ ''او یار، یہ مائی نے کیا تعویذ سا پکڑا دیا۔ تیرا کیا خیال ہے کہ سمیرا اسے کھول کر دیکھ لے گی؟''

''یہ بات خود میری سمجھ نہیں آ رہی۔ کہیں میں، مذاق نہ بن جاؤں۔'' خالد قریشی بے یقینی سے بولا۔

''اس پریم پتر کو کھول کر نہ دیکھ لیں۔'' دلدار بخش کے اندر کا تجسس جاگا۔

PDF BY Manzoor

''اوئے نہیں۔ وہ سخت وارننگ دے چکی ہے۔ کہیں ہم مصیبت میں نہ پھنس جائیں۔'' خالد قریشی نے سمجھداری کا ثبوت دیا۔

''چل پھر۔ مائی کا پریم پتر سمیرا تک پہنچا۔'' دلدار بخش بولا۔ ''دیکھتے ہیں کیا ہوتا ہے!''

جب وہ دونوں سمیرا کی کوٹھی پر پہنچے جو لاہور کے ایک پوش علاقے میں واقع تھی تو وہاں حیرت انگیز طور پر کچھ ایسا ہوا کہ دونوں پولیس افسران انگشت بدنداں رہ گئے۔

وہ گاڑی سے اتر کر گیٹ پر آئے تو وہاں موجود گارڈ نے خالد قریشی کو سلام کیا اور بیل کا بٹن دبا کر اندر سے گھر کے ملازم کو بلایا۔ یہ اچھی بات تھی کہ سمیرا گھر پر موجود تھی۔ وہ کچھ دیر کے بعد شوٹنگ پر جانے والی تھی۔

ذاتی ملازم نے دونوں پولیس والوں کو چھوٹے ڈرائنگ روم میں بٹھایا اور کہا۔ ''میں میڈم کو جا کر بتاتا ہوں۔'' جبکہ اس نے سمیرا کی اجازت سے ہی ڈرائنگ روم کھولا تھا۔

پندرہ منٹ کے انتظار کے بعد سمیرا انتہائی سنجیدہ انداز میں ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی۔ اسے خالد قریشی کی آمد کی غرض و غایت کا اندازہ ہو گیا تھا۔ اس لئے اس نے پہلے ہی سے ایک لاتعلقی کا انداز اختیار کر لیا تھا۔

خالد قریشی اور دلدار بخش اسے دیکھتے ہی کھڑے ہو گئے۔ سمیرا نے دلدار بخش پر ایک اچٹتی سی نظر ڈالی لیکن اس کے بارے میں کوئی سوال نہیں کیا۔ بے نیاز لہجے میں بس اتنا کہا۔ ''بیٹھیں۔''

''یہ میرے دوست ہیں دلدار بخش۔ میرے ہم منصب۔ آپ کے بڑے پرستار ہیں۔ میرے ساتھ آپ کو دیکھنے چلے آئے۔'' خالد قریشی نے بساط کھولی۔

''اچھا۔'' سمیرا نے ایک نظر دلدار بخش کو دیکھا اور بس۔

''میں آپ کے لئے ایک خاص چیز لایا تھا۔'' خالد قریشی جلدی سے بٹوا نکال کر مائی پنکھی کا دیا ہوا ''پریم پتر'' نکالنے لگا۔ ساتھ وہ بولتا بھی جا رہا تھا۔ ''ایک بزرگ خاتون ہیں، نام ان کا مائی پنکھی ہے، بڑی اللہ والی ہیں، انہوں نے ایک خاص چیز آپ کو بھجوائی ہے۔ پتا نہیں کیا ہے، آپ خود کھول کر دیکھ لیں۔'' اس نے نوٹوں کے درمیان سے دھاگے میں لپٹا کاغذ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''یہ لیں۔''

ایک پہنچی ہوئی بزرگ کا نام سن کر سمیرا نے بڑی دلچسپی سے اس کاغذ کو الٹ پلٹ کر دیکھا۔

''آپ اسے ہمارے سامنے کھول کر دیکھنا نہ چاہیں تو اندر چلی جائیں۔'' خالد قریشی نے مشورہ دیا۔

''نہیں۔ میں اسے آپ کے سامنے ہی کھول کر دیکھوں گی۔ اس میں کہیں دھماکا خیز مواد تو نہیں بھرا ہے۔'' سمیرا نے مسکرا کر کہا۔

''ہمیں اسے کھول کر دیکھنے کی اجازت نہیں ورنہ میں آپ کو کھول کر دے دیتا۔'' خالد قریشی بولا۔

''ارے نہیں۔ میں ایسے ہی کہہ رہی تھی۔'' سمیرا نے ہنس کر کہا۔ ''میں یہیں بیٹھ کر کھولتی ہوں۔ ویسے عجیب تعویذ ہے جسے گلے میں ڈالنے کے بجائے کھول کر دیکھنے کو کہا گیا ہے۔''

سمیرا نے بہت تیزی سے کاغذ پر لپٹا ہوا کالا دھاگا کھول کر صوفے کے ہتھے پر رکھا اور ذرا سنبھل کر بیٹھی۔ پھر پُر شوق نگاہوں سے وہ چھوٹا سا لائنوں والا کاغذ کھولا۔

دونوں پولیس والے بغور اس کا چہرہ دیکھ رہے تھے۔

کاغذ کھولتے ہی سمیرا کے چہرے کی رنگت اُڑ گئی۔ خالد قریشی اور دلدار بخش اندازہ نہ کر پائے کہ آخر سمیرا کو اس چھوٹے سے کاغذ میں کیا نظر آیا جسے مائی پنکھی نے ''پریم پتر'' قرار دیا تھا۔

کاغذ پر ایسا جانے کیا تھا کہ سمیرا یکدم پریشان ہو گئی تھی۔ اس نے الجھے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ ''یہ مائی پنکھی کون ہیں؟''

''ہم آپ کو ملوا دیں گے۔ پہلے ذرا اسلام آباد سے ہو آئیں۔'' خالد قریشی نے ترپ کا پتا پھینکا۔

''اچھا۔ ہاں کب ہے آپ کا پروگرام؟'' سمیرا یکدم راہ راست پر آ گئی۔

''دو دن بعد ہفتے کی رات کو۔ اتوار کی شام تک واپسی ہو جائے گی۔ میڈم، آپ چل رہی ہیں نا۔'' خالد قریشی نے پوچھا۔

سمیرا نے ایک نظر کاغذ پر ڈالی۔ اب وہاں کچھ نہ تھا، محض سادہ کاغذ تھا۔ اس نے کاغذ کو مٹھی میں بھینچ کر اس پر تھوڑا سا دھاگا لپیٹ کر میز پر ڈال دیا اور بہت ٹھہرے لہجے میں بولی۔ ''ہاں میں چل رہی ہوں۔''

''بہت شکریہ میڈم آپ کا۔ آپ ہفتے کی شام کو تیار رہنا۔ میں گاڑی لے کر آ جاؤں گا۔ اب اجازت۔'' خالد قریشی فوراً کھڑا ہو گیا۔ اس سے پہلے کہ وہ فیصلہ بدلے، اس کی نظروں سے اوجھل ہو جانا اچھا تھا۔

''ٹھیک ہے۔'' سمیرا بھی کھڑی ہو گئی۔

تجسس کے مارے دلدار بخش نے میز پر پڑی ہوئی اپنی ٹوپی اس انداز سے اٹھائی کہ وہ دھاگے میں لپٹا مڑا تڑا کاغذ ٹوپی کے اندر آ گیا۔ اس نے پورے اطمینان سے ٹوپی سر پر رکھی اور ڈرائنگ روم سے باہر نکل آیا۔ وہ اپنے اس کارنامے پر بہت خوش تھا۔

خالد قریشی، سمیرا سے کچھ بات کرنے لگا تھا۔ وہ آنے جانے اور رقم کی تفصیلات سے اسے آگاہ کر رہا تھا۔ اتنے میں دلدار بخش اس کی کوٹھی سے باہر نکل آیا اور اپنی گاڑی میں آ بیٹھا۔

اس کاغذ میں ایسا کیا تھا جسے دیکھ کر سمیرا کے چہرے پر پریشانی دوڑ گئی تھی، وہ یہ معلوم کرنے کے لئے بے چین تھا۔ اسٹیئرنگ سیٹ پر بیٹھ کر اس نے کوٹھی کے گیٹ کی طرف دیکھا۔

گیٹ بند تھا۔ ابھی خالد قریشی باہر نہیں آیا تھا۔

اس نے ٹوپی اتار کر کاغذ ہاتھ میں لیا اور ٹوپی سر پر جمالی۔ پھر کاغذ سے کالا دھاگا ہٹایا۔ اسے کھڑکی سے باہر پھینکا اور بڑی احتیاط سے کاغذ کو سیدھا کرنے لگا۔

جب اس نے کاغذ کھول کر اس پر نظریں جمائیں تو وہ منظر اس کا دل دہلانے کے لئے کافی تھا۔

''اوئے۔ تم یہ پریم پتر وہاں سے اٹھا لائے۔ یار بڑی صفائی سے کام دکھایا۔ کیا ہے اس کاغذ میں۔ مائی پنکھی نے تو کمال کر دیا۔ اس سوہنے والی کے سارے نخرے توڑ دیے۔'' اچانک خالد قریشی کو احساس ہوا کہ دلدار بخش اس کی بات نہیں سن رہا ہے۔

وہ گم صم بیٹھا تھا۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔ اسے یہ معلوم ہی نہیں تھا کہ خالد قریشی کب گاڑی کے پاس آ کھڑا ہوا اور گفتگو شروع کر دی۔

''اوئے۔ یار تجھے کیا ہوا؟'' خالد قریشی نے اس کا کندھا ہلایا اور گاڑی میں اس کے برابر آ بیٹھا۔ ''لا...... دکھا کاغذ!''

دلدار بخش نے کاغذ کسی روبوٹ کی طرح اس کی طرف بڑھا دیا۔ دیتے وقت اس نے یہ ضرور دیکھ لیا تھا کہ وہ کاغذ یکدم کورا تھا۔

خالد قریشی نے کاغذ اپنے دونوں ہاتھ میں پکڑ کر بڑے اہتمام سے اس پر نظر ڈالی۔

وہ منظر دوبارہ نمودار ہوا اور خالد قریشی کا بھی دل دہلا گیا۔ اب اسے پتا چلا کہ دلدار بخش کیوں سکتے کے عالم میں بیٹھا تھا۔

کاغذ پر جو منظر نمودار ہوا تھا، وہ ان دونوں سے متعلق تھا۔ اس منظر سے سمیرا کا دور کا بھی واسطہ نہ تھا۔ تو پھر وہ اسلام آباد جانے پر کس طرح راضی ہو گئی تھی۔ خالد قریشی کو اچھی طرح یاد تھا کہ کاغذ کھولتے ہی سمیرا کا چہرہ فق ہو گیا تھا۔ آخر اس نے کاغذ پر کیا دیکھا تھا۔

ضرور اس نے کوئی ایسی چیز دیکھی تھی جس کے دباؤ میں آ کر وہ اس رقص و سرود کی محفل میں جانے کے لئے تیار ہو گئی تھی۔ اسے اس بات سے دلچسپی نہیں تھی کہ وہ کیا دیکھ کر اسلام آباد جانے پر مجبور ہو گئی تھی۔ اسے اس بات کی خوشی تھی کہ مائی پنکھی نے ناممکن کو ممکن کر دکھایا تھا۔

اور اب خالد قریشی کو پکی امید تھی کہ اس کے اس ''کارنامے'' پر ترقی تو ملے گی شاید کوئی پلاٹ بھی ہاتھ آ جائے۔

خالد قریشی وقت مقررہ پر اسلام آباد کے نواح میں اس شاندار فارم ہاؤس پر سمیرا کو لے کر پہنچ گیا جہاں یہ انتہائی خفیہ محفل سجائی گئی تھی۔ رقص کی اس محفل میں ایک وزیر اعلیٰ، چند اعلیٰ سرکاری افسران اور پولیس کے منتخب افسران مدعو تھے۔

فارم ہاؤس کے سبزہ زار پر ایک لمبا اسٹیج بنایا گیا تھا۔ یہ اسٹیج چار فٹ اونچا تھا۔ اسٹیج کے شروع میں سیڑھیاں تھیں تاکہ رقاصہ ان سیڑھیوں کے ذریعے اسٹیج پر پہنچ سکے۔ اس اسٹیج کے چاروں طرف آرام دہ صوفے رکھے گئے تھے۔ ان صوفوں کے سامنے شیشے کی نفیس میزیں تھیں جن پر ناؤ نوش کا سامان سجایا گیا تھا اور اسٹیج تیز روشنیوں میں نہایا ہوا تھا۔

یہ خاص لوگوں کی محفل تھی۔ بیوروکریٹس اور پولیس افسران کی دو کیٹگریاں بنائی گئی تھیں۔ اعلیٰ کیٹگری کے لوگوں کے لئے رات بارہ بجے کے بعد پروگرام رکھا گیا تھا جبکہ ادنیٰ کیٹگری والوں کو ڈنر کے بعد چلے جانا تھا۔ بارہ بجے کے بعد صرف چار اداکاراؤں کو اپنے ''فن'' کا مظاہرہ کرنا تھا۔ ان میں سمیرا کے ساتھ دو انڈیا کی آئٹم گرلز بھی مدعو تھیں۔

خالد قریشی اور دلدار بخش سادہ لباس میں تھے۔ ان لوگوں نے مقامی رقاصاؤں کا رقص دیکھا، کھایا پیا اور کرائے کی گاڑی میں بیٹھ کر عازم لاہور ہو گئے۔ سمیرا کے بارے میں منتظمین نے کہا تھا کہ وہ اس کی فکر نہ کرے، اسے بہ حفاظت لاہور پہنچا دیا جائے گا۔ خالد قریشی کو اس کی قطعاً فکر نہ تھی۔ اس نے ایک ''ٹیڑھی کھیر'' کو منزل تک پہنچا دیا تھا۔ اب اسے بہ حفاظت پہنچایا جائے یا لنگڑا لولا کر کے، اس کی بلا سے۔

یہ ''ٹیڑھی کھیر'' یونہی سیدھی نہیں ہو گئی تھی۔ فلموں میں آنے سے پہلے سمیرا نرسنگ کے پیشے سے وابستہ تھی۔ اس کے چچا نے جائداد پر قبضہ کر لیا تھا۔ تنگدستی کی وجہ سے اسے نرس بننا پڑا۔ ٹریفک کے ایک حادثے میں ٹانگ تڑوا کر جب اس کا چچا اسپتال میں داخل ہوا تو سمیرا نے بے ہوشی کی حالت میں ایک ایسا انجکشن لگا دیا جس کی وجہ سے اس کی موت یقینی تھی۔

کاغذ پر جو منظر دکھایا گیا، وہ یہ تھا کہ سمیرا چچا کو انجکشن لگا رہی ہے اور خوفزدہ نظروں سے دروازے کی طرف دیکھ رہی ہے کہ کوئی اندر نہ آ جائے۔ وہ اپنے چچا کی قاتل تھی اور یہ بات اس کے سوا کسی کو معلوم نہ تھی لیکن اب کسی اور کو بھی معلوم ہو گئی تھی تو جان بچانے کا آسان راستہ یہی تھا کہ اس نجی محفل میں شرکت کر کے کسی بڑی مصیبت سے خود کو محفوظ کر لیا جائے۔

سمیرا نے تو ہوش کے ناخن لے کر خود کو محفوظ کر لیا تھا لیکن ان دونوں نے اتنی چڑھا لی تھی کہ عقل ان کے ٹخنوں میں آ گئی تھی اور ہوش جاتے رہے تھے۔ وہ اسلام آباد ہائی وے پر جیٹ کی رفتار سے لاہور کی طرف چلے جا رہے تھے۔ خالد قریشی اس وقت ڈرائیونگ کر رہا تھا۔ دلدار بخش اس کے برابر بیٹھا مختلف رقاصاؤں کے خدوخال پر بے لگام تبصرہ کر رہا تھا۔ دونوں ہی بے قابو تھے۔ دلدار کو اپنی زبان پر قابو نہ تھا اور خالد قریشی کو اسٹیئرنگ پر۔ اس وقت وہ یہ بھی بھولے ہوئے تھے کہ ان دونوں نے کاغذ پر جو ایک جیسا منظر دیکھا تھا، وہ اگر ''لائیو'' ہو گیا تو کیا ہوگا۔

خالد قریشی اور دلدار بخش نے باری باری جو منظر دیکھا، وہ ایک خطرناک ایکسیڈنٹ کی نوید تھا۔ اب اس منظر کے ''زندہ'' ہونے کا وقت آ چکا تھا۔ خالد قریشی نے تیز رفتار گاڑی پر قابو پانے کی بہت کوشش کی لیکن وہ دوسری گاڑی سے ٹکرا کر قلابازی کھاتی چلی گئی۔

☆......☆......☆

''پیارے بھائی، بات یہ ہے۔'' پروفیسر مجاہد نے الف لیلہٰ چھیڑی۔ ''ہماری بہو کے پیچھے یہ خبیث سمندر سے لگا ہے۔ بہو جب اپنی فیملی کے ساتھ ہاکس بے گئی تو ضرورت کے تحت ان جھاڑیوں میں چلی گئی جو ہٹ کے بائیں جانب موجود تھیں۔ اگرچہ ہماری بہو اپنی دو بہنوں کے ساتھ گئی تھی لیکن بہنیں جھاڑیوں کے باہر کھڑی رہی تھیں جبکہ یہ اندر چلی گئی تھی۔ ادھر کسی کے آنے کا امکان نہ تھا۔ بہو احتیاطاً اپنی نگرانی کے لئے انہیں اپنے ساتھ لے گئی تھی۔ ہماری بہو کو یہ بات معلوم نہیں تھی کہ ان جھاڑیوں میں کسی خبیث کا بسیرا ہے۔ بہو جھاڑیوں سے خوفزدہ ہو کر ضرور نکلی لیکن وہ یہ ادراک نہ کر سکی کہ کس قسم کی بلا اس نے اپنے سر منڈھ لی ہے۔ اس طرح کی چیزیں بندے کے اندر داخل ہو جاتی ہیں۔ ان کا طریقۂ واردات یہ ہوتا ہے کہ یہ بندے کو مفلوج کر دیتی ہیں، اسے بیمار ڈال دیتی ہیں، اس کی رگوں میں خون کے ساتھ گردش کرنے لگتی ہیں۔ کسی کو اندازہ نہیں ہوتا کہ اس کے ساتھ ہو کیا رہا ہے۔ متاثر بندے کو بھی کچھ نہیں معلوم ہوتا، بس وہ خود کو بیمار سمجھتا ہے۔ اس خبیث نے بہو کو پوری طرح جکڑ لیا ہے۔ اس کے گھٹنے بیکار کر دیے ہیں۔ دم کئے ہوئے پانی سے وہ وقتی طور

PDF BY Manzoor

پر سنبھل گئی ہے لیکن یہ مستقل علاج نہیں۔ ہمیں بہو کو اس خبیث سے آزاد کرانا ہوگا۔“

ثار ایوب، پروفیسر کی کہانی منہ کھولے سن رہے تھے۔ اس انکشاف پر کہ ان کی بہو نازنین کسی کی چھپیٹ میں ہے، وہ سخت پریشان ہو گئے تھے۔ گھبرا کر بولے۔ ”پروفیسر مجاہد...... اب کیا ہوگا؟“

”کچھ نہیں ہوگا۔ انگریز یہاں سے جائیں گے اور پاکستان آزاد ہوگا۔“ پروفیسر مجاہد نے بات کو ہنسی میں اُڑانے کی کوشش کی۔

”پروفیسر صاحب۔ میں سنجیدہ ہوں۔“ ثار ایوب بولے۔

”تو پیارے بھائی۔ میں نے کون سی غیر سنجیدہ بات کی ہے۔ کیا انگریز کے جائے بغیر پاکستان آزاد ہو سکتا ہے؟“ پرنالہ پھر وہیں گرا۔

”آپ مجھے معاف نہیں کر سکتے۔“ ثار ایوب کی پریشانی میں کوئی کمی نہ آئی۔ ”میں بہت پریشان ہوں۔“

”لیکن آپ کی پریشانی سے کیا ہوگا۔ وہ خبیث تو بھاگنے سے رہا۔“

”پھر کون بھگائے گا اسے؟“

”میں بھگاؤں گا اس خبیث کو۔ ثار ایوب، آپ پریشان کیوں ہوتے ہیں۔“ پروفیسر مجاہد نے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔ ”جہاں سے وہ آیا ہے، اسے وہیں چھوڑ کر آنا ہوگا۔“

”جان چھوڑ جائے گا وہ؟“ ثار ایوب نے پوچھا۔

”کوشش تو میری یہی ہوگی۔“ پروفیسر مجاہد سنجیدگی سے بولے۔ ”میں ایک سفید دھاگا دوں گا، اس میں سات گرہ لگی ہوں گی۔ یہ دھاگا اسی جگہ سمندر میں پھینکنا ہوگا جہاں سے وہ پیچھے لگا تھا۔ بہو کو ساتھ لے جانا ہوگا، یہ کام آپ کی نگرانی میں ہوگا۔ علی ثار ہمراہ جا سکتے ہیں، بھابی کو بھی ساتھ لے جانا ہوگا۔“

”پروفیسر صاحب۔ کوئی پریشان کن مسئلہ تو درپیش نہیں ہوگا؟“ ثار ایوب جھجکتے ہوئے بولے۔ ”کیا آپ ساتھ نہیں جائیں گے؟“

”نہیں۔ میں ساتھ نہیں جاؤں گا۔ میں سیٹلائٹ کے ذریعے اس آپریشن کی نگرانی کروں گا۔ آخر کو میں کسی امریکی صدر سے کم ہوں۔“ ایک بار پھر ان کی رگِ ظرافت پھڑکی۔

”اچھا۔“ ان کی بات سن کر ثار ایوب مسکرائے بنا نہ رہ سکے۔ ”جانا کب ہوگا؟“

”آج کیا دن ہے؟“ پھر فوراً ہی بولے۔ ”آج تو اتوار ہے۔ تو پیارے بھائی، آپ کو ہاکس بے جانا ہوگا جمعرات کی صبح۔ ٹھیک ہے۔“

جمعرات کی صبح ساڑھے سات بجے کے قریب ثار ایوب اپنے بہو، بیٹے اور بیگم فریدہ کے ساتھ گاڑی میں ہاکس بے کی جانب عازم سفر ہوئے۔ پروفیسر مجاہد فجر کے بعد گھر آ کر ثار ایوب کو دھاگا دے گئے تھے، ساتھ بتا گئے تھے کیا کرنا، کیسے کرنا ہے۔

یہ بٹا ہوا دھاگا تھا، ڈوری نما۔ کوئی نو انچ لمبا ہوگا۔ اس میں سات گرہیں لگی تھیں۔ ثار ایوب نے بہت احتیاط سے اسے اپنی جیب میں رکھ لیا اور راستے بھر جیب پر ہاتھ رکھ کر تصدیق کرتے رہے کہ دھاگا جیب میں موجود ہے کہ نہیں۔

سر دست مسئلہ یہ تھا کہ اس جگہ کیسے پہنچا جائے جہاں دس ماہ پہلے نازنین کی فیملی نے پکنک منائی تھی۔ نازنین کو راستہ معلوم نہ تھا لیکن انہوں نے اتنا ضرور کہا تھا کہ اگر انہیں آس پاس کے علاقے میں پہنچا دیا جائے تو وہ ہٹ پہچان لیں گی۔ علی ثار نے نازنین کے بھائیوں سے بات کر کے اس ہٹ کی لوکیشن کا اندازہ کر لیا تھا۔ اس وقت گاڑی علی ثار ہی چلا رہے تھے۔

پروفیسر مجاہد کی ہدایت تھی کہ یہ دھاگا اسی ہٹ کے سامنے سمندر برد کیا جائے جہاں یہ پکنک منائی گئی تھی۔

”اگر ہم اس جگہ نہ پہنچ سکیں تو......؟“ ثار ایوب نے پوچھا تھا۔

”نہیں۔ ایسا نہیں ہوگا۔ آپ لوگ ضرور وہاں پہنچ جائیں گے۔“ پروفیسر مجاہد کے لہجے میں یقین تھا۔

اور ایسا ہی ہوا۔ کسی خاص دقت کے بغیر وہ لوگ مطلوبہ ہٹ تک پہنچ گئے۔ ثار ایوب نے اپنے بیٹے علی ثار کو گاڑی میں دونوں خواتین کے ساتھ چھوڑا اور خود سمندر کی طرف چلے۔

سڑک سے اترتے ہی ڈھلانی راستہ تھا جو ہٹ تک پہنچتے پہنچتے ہموار ہو گیا تھا۔ دائیں جانب گھنی جھاڑیاں تھیں۔ گاڑی میں موجود کسی کو یہ معلوم نہ تھا کہ ثار ایوب یہاں کیوں آئے ہیں۔ البتہ علی ثار کو تھوڑا بہت اندازہ تھا کہ ابا، پروفیسر مجاہد کی دی ہوئی کوئی چیز سمندر بُرد کرنے آئے ہیں۔ پروفیسر نے جو کچھ بتایا تھا، وہ بس ثار ایوب تک محدود تھا۔

ثار ایوب بظاہر پورے اعتماد سے سمندر کی جانب بڑھ رہے تھے لیکن کبھی چند لمحوں کے لئے خوف کی ایک لہر آ کر گزر جاتی تھی۔ ہٹ کے دائیں جانب سے راستہ گھوم کر سمندر پر نکلتا تھا۔

اس وقت صبح کے نو بجے تھے۔ سورج پوری آب و تاب کے ساتھ روشن تھا۔ سمندر پر ابھی رش زیادہ نہیں تھا۔ ایک دو خاندان سمندر کی لہروں سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ ثار ایوب نے اپنے جوتے اتار کر ریت پر رکھے اور پینٹ کے پائینچے چڑھا کر سمندر کی طرف بڑھے۔ جب وہ گھٹنوں تک پانی میں چلے گئے تو انہوں نے کھڑے ہو کر ایک نظر اپنے اطراف ڈالی۔ کوئی متوجہ نہ تھا۔

انہوں نے جیب سے دھاگا نکال کر اسے تہہ کیا اور جتنے زور سے اسے سمندر کی طرف اچھال سکتے تھے، اچھالا۔ اور فوراً واپسی کے لئے قدم اٹھا دیئے۔

پروفیسر مجاہد کی خاص ہدایت تھی کہ جب دھاگا سمندر میں پھینک دو تو پھر پیچھے پلٹ کر مت دیکھنا۔ ثار ایوب نے من و عن ان کی ہدایات پر عمل کیا تھا۔

نازنین اور فریدہ گاڑی میں بیٹھی تھیں۔ علی ثار گاڑی سے اتر کر سڑک پر ٹہل رہے تھے۔ وہ بے چینی سے ثار ایوب کا انتظار کر رہے تھے۔ جیسے ہی وہ انہیں آتے نظر آئے، وہ ان کی طرف لپکے اور قریب پہنچ کر بولے۔ ”ابا جان، ہو گیا کام؟“

”ہاں۔ بیٹا۔“ ثار ایوب نے بیٹے کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

”کوئی پریشانی تو نہیں ہوئی؟“ علی ثار نے پوچھا۔

”نہیں بیٹا۔“ ثار ایوب بولے۔ ”علی۔ ادھر کا حال سناؤ، یہاں تو کوئی گڑبڑ نہیں ہوئی۔ نازنین نے پریشان تو نہیں کیا؟“

”ابا جان۔ جیسے ہی آپ سمندر کی طرف گئے تو نازنین نے گاڑی سے نکلنے کی کوشش کی تھی۔ امی نے بڑی مشکل سے نازنین کو سمجھا بجھا کر روکا۔“ علی نے بتایا۔

”کیوں نکلنا چاہ رہی تھی؟“ ثار ایوب نے پوچھا۔

”وہ جھاڑیوں میں جانا چاہ رہی تھیں۔“ علی ثار نے بتایا۔

”پھر۔“ ثار ایوب بولے۔

”امی نے کہا کہ جب تک علی کے ابا جان نہیں آ جاتے، تم باہر نہیں نکل سکتیں۔ وہ باہر نکلنے کو سختی سے منع کر گئے ہیں۔“ علی ثار نے کہا۔

وہ دونوں باتیں کرتے گاڑی تک آ گئے تھے۔ علی ثار نے پوچھا۔ ”چلیں ابا۔“

”ہاں۔“ ثار ایوب نے کہا اور گاڑی کا دروازہ کھول کر بیٹھ گئے۔ علی ثار گھوم کر ڈرائیونگ سیٹ پر آ گئے۔

”ابا جان۔“ نازنین نے پیچھے سے مخاطب کیا۔ ان کی آواز میں عجب وحشت سی تھی۔

ثار ایوب پریشان ہو گئے۔ انہوں نے پلٹ کر کہا۔ ”جی بٹیا۔“

”ابا جان۔ میری بات سنیں۔“

ثار ایوب کو محسوس ہوا جیسے نازنین کوئی خاص بات کرنا چاہ رہی ہیں۔ انہوں نے پوچھا۔ ”کیا اتر کر تمہارے پاس آ جاؤں؟“

”جی ابا جان۔“ نازنین کے چہرے پر ہوائیاں اُڑی ہوئی تھیں۔

ثار ایوب فوراً گاڑی سے باہر آ گئے اور پچھلے دروازے سے نازنین نے اترنے کی کوشش کی تو فریدہ نے انہیں پکڑ لیا اور سختی سے بولیں۔ ”باہر مت نکلو۔“

”بھئی کیا مسئلہ ہے۔“ ثار ایوب نے بیوی سے مخاطب ہو کر کہا۔

”کچھ نہیں، آپ گاڑی میں بیٹھیں اور چلیں۔“ فریدہ فیصلہ کن انداز میں بولیں۔

ثار ایوب خاموشی سے فرنٹ سیٹ پر آ کر بیٹھ گئے تو پیچھے سے فریدہ کی آواز آئی۔ ”علی۔ جلدی چلو۔“

علی ثار نے تیزی سے گاڑی بیک کی اور پھر تیزی سے ہی گھما کر سڑک پر ڈال دی۔

ثار ایوب چاہ رہے تھے کہ کسی پبلک بوتھ سے ٹیلیفون کر کے پروفیسر مجاہد کو صورتحال سے آگاہ کر دیں لیکن راستے میں کوئی پبلک بوتھ نظر نہیں آیا۔ تب انہوں نے ایک جنرل اسٹور دیکھ کر گاڑی رکوائی اور علی سے کہا۔ ”بیٹا۔ دیکھنا یہاں ٹیلیفون ہے کیا؟“

علی نے اسٹور سے واپس آ کر بتایا۔ ”جی۔ ابا جان۔ ٹیلیفون ہے۔“

ثار ایوب گاڑی سے اترے تو فریدہ بھی باہر آ گئیں اور ان کے پیچھے آتے ہوئے بولیں۔ ”سنئے۔“

”کیا ہوا؟“ ثار ایوب نے رک کر پوچھا۔

”وہ نازنین کو واش روم کی شدید ضرورت ہے، پریشان ہو رہی ہے۔“ فریدہ نے کہا۔

”لیکن یہاں کہاں جائے گی؟“ ثار ایوب نے اِدھر اُدھر نظریں گھمائیں۔ بائیں ہاتھ ایک اور ذیلی سڑک تھی اور ساتھ کوارٹر نما گھر بنے ہوئے تھے۔ انہوں نے کہا۔ ”یہیں کسی گھر میں جانا ہوگا۔“

”ٹھیک ہے، میں لے جاتی ہوں۔“ فریدہ یہ کہہ کر گاڑی کی طرف بڑھیں۔

”بیگم، ایک منٹ۔“ ثار ایوب نے انہیں روکا۔ ”میں ذرا پروفیسر مجاہد کو فون کر کے آ جاؤں۔ پھر آپ لے جایئے گا۔“

”اچھا۔“ فریدہ نے اثبات میں گردن ہلائی اور گاڑی میں جا بیٹھیں۔

دو منٹ بعد ہی ثار ایوب اسٹور سے باہر آ گئے اور نازنین کو واش روم لے جانے کا ’گرین سگنل‘ دیتے ہوئے کہا۔ ”جلدی واپس آ جائیں۔“

دس پندرہ منٹ میں دونوں کی واپسی ہو گئی۔ گھر کے مکیں بااخلاق تھے۔ انہوں نے خندہ پیشانی سے استقبال کیا۔ یہاں تک کہ چائے پینے کی پیشکش کی۔ نازنین جو وحشت زدہ اور اُلجھی ہوئی سی دکھائی دے رہی تھیں، وہ اب شانت ہو چکی تھیں۔

واپسی پر جانے کیوں اس قدر ٹریفک جام ہو گیا کہ گھنٹے ڈیڑھ دو گھنٹے کا سفر تین چار گھنٹے میں کٹا۔ جب گھر پہنچے تو تھکن سے سب کا برا حال تھا۔

رات کو پروفیسر مجاہد، ثار ایوب کے گھر آ گئے۔ انہوں نے تفصیل سے سارا حال سنا اور پھر اپنے مخصوص انداز میں بولے۔ ”پیارے بھائی۔ آپ کا دورہ کامیاب رہا۔ وہ جہاں سے آیا تھا، اسے وہیں واپس بھیج دیا ہے۔ اس نے آخری کوشش کے طور پر بہو کو گاڑی سے نکال کر جھاڑیوں میں لے جانے کی کوشش کی تھی جسے بھابی نے ناکام بنا دیا۔“

”اگر نازنین، بیگم کے کنٹرول میں نہ آتی اور جھاڑیوں میں چلی جاتی تو......؟“ سوال ہوا۔

”تو کچھ نہ ہوتا۔ تھوڑی بہت پیچیدگی ہو جاتی، ہم سنبھال لیتے۔“ پروفیسر مجاہد نے کہا۔

”اب کیا کرنا ہے؟“

”اللہ کا شکر ادا کرنا ہے۔“ پروفیسر مجاہد مسکرا کر بولے۔

”اس کے علاوہ۔“ ثار ایوب نے پوچھا۔

”آپ ذرا بہو کو بلوائیں، میں ایک نظر دیکھ لوں۔ پھر آگے کا بتاتا ہوں۔“

ڈرائنگ روم کے اندرونی دروازے میں جا کر انہوں نے علی ثار کو آواز لگائی۔ ”علی۔ ذرا بہو کو تو لے کر آؤ۔“

”جی اچھا ابا جان۔“ اندر سے آواز آئی۔

”گھٹنے کی تکلیف کیسی ہے؟“

”کم ہے لیکن ختم نہیں ہوئی۔“

”ایک آدھ ہفتے میں ختم ہو جائے گی، انشاءاللہ۔“

”کوئی احتیاط وغیرہ۔“

”بس مغرب کے بعد بہو گھر سے باہر نہ نکلے۔“ پروفیسر مجاہد نے کہا۔ ”اور اگر نکلنا بہت ضروری ہو تو مغرب کے آدھ گھنٹے کے بعد گھر سے نکلے اور ٹیلیفون پر مجھے بتا دیں۔“

”ٹھیک ہے۔“ ثار ایوب نے کہا۔

اتنے میں نازنین، علی ثار کے ساتھ ڈرائنگ روم میں آ گئیں۔ پروفیسر مجاہد نے اُنہیں اپنے سامنے والے صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ ایک نظر اُدھ کھلے چہرے پر ڈالی اور دونوں ہاتھوں کے ناخنوں کو بغور دیکھا اور ایک پرسکون سانس لے کر بولے۔ ”اللہ تیرا شکر ہے۔“ اس کے بعد نازنین سے مخاطب ہوئے۔ ”بس جائیں بٹیا۔ اللہ نے آپ پر بڑا کرم کر دیا۔“

نازنین نے ادب سے پروفیسر مجاہد کو سلام کیا اور علی ثار کے ساتھ ڈرائنگ روم سے نکل گئیں۔

”پیارے بھائی، بات یہ ہے۔“ نازنین کے جانے کے بعد پروفیسر مجاہد، ثار ایوب سے مخاطب ہو کر بولے۔ ”سیلاب ہمیشہ تباہی لاتا ہے۔ جب وہ واپس جاتا ہے تو اپنی تباہی کے نشانات چھوڑ جاتا ہے۔ ان خبیثوں کا بھی یہی وتیرہ ہے۔ جب کسی لڑکی کو جکڑتے ہیں تو اسے توڑ پھوڑ کر رکھ دیتے ہیں اور واپسی پر اپنے اثرات چھوڑ جاتے ہیں۔ اللہ مالک ہے، پریشان

PDF BY Manzoor

ہونے کی ضرورت نہیں۔ پانی کی ایک بوتل منگاؤ۔ میں پانی دَم کر دیتا ہوں۔ بہو وہ پیتی رہے۔ پانی ختم ہونے لگے تو اسی میں اور ملا لے۔ ٹھیک ہے۔ ہاں، ایک بات اور.....''

پھر جو بات پروفیسر مجاہد نے بتائی، وہ خاصی چونکا دینے والی تھی۔

☆.....☆.....☆

ادھر دلدار بخش اور خالد قریشی کی گاڑی نے قلابازی کھائی اور ادھر مائی پنکھی کو کلے سے لگیر کھینچتی کھینچتی رک گئی۔ اس نے اچانک ایک زوردار دھماکے کے ساتھ آگ کے شعلے اٹھتے دیکھے۔

''نہیں مانے نا۔ اب بھگتو۔ زندہ جلو آگ میں۔'' مائی پنکھی غصے سے بولی۔

انارہ چارپائی پر بیٹھی، مائی پنکھی کو بغور دیکھ رہی تھی۔ اس نے انارہ کو آج کی رات دوسرا گھر دکھانے کی بات کی تھی۔ مائی پنکھی چھ گھر بنا چکی تھی، ساتواں بنانے جا رہی تھی کہ یکدم غصے میں آ گئی۔

''اماں کیا ہوا؟ کیوں غصہ کر رہی ہے؟'' انارہ نے پوچھا۔

''انجو۔ دو پولیسے ہیں۔ منع کیا تھا کہ کاغذمت دیکھنا لیکن نہیں مانے۔ اب بند گاڑی میں پڑے جھلس رہے ہیں۔ میں کیا کروں؟'' مائی پنکھی بولی۔ ''اچھا چل دفع کر انہیں۔ آ جا ہم اپنا کھیل شروع کرتے ہیں۔''

اس نے پھر ساتواں گھر مکمل کیا اور پھسکڑا مار کر بیٹھ گئی اور انارہ سے بولی۔ ''چل انجو۔ چل آ جا۔ دوسرے گھر میں بیٹھ جا۔''

انارہ اسی انداز میں جس طرح مائی پنکھی بیٹھی تھی، دوسرے گھر میں براجمان ہو گئی۔

مائی پنکھی نے گلے سے بھاری تعویذ اتار کر اسے بائیں ہاتھ پر رکھ کر مٹھی سختی سے بند کر لی اور انارہ سے بولی۔ ''دیکھا انجو دیکھ۔''

یکدم انارہ کے سامنے ایک منظر کھلا۔ ایک تیرہ چودہ سال کی لڑکی اسکول یونیفارم میں کندھے پر بیگ لٹکائے گلی میں جاتی نظر آئی۔ یہ ایک چوڑی گلی تھی، آمنے سامنے گھروں کے دروازے تھے، چھوٹے چھوٹے گھر، نچلے متوسط طبقے کی بستی۔

یہ تیرہ چودہ برس کی لڑکی نویں کلاس کی طالبہ تھی۔ اٹھان اچھی تھی لہٰذا اپنی عمر سے دو برس بڑی نظر آتی تھی۔ گوری چٹی، دلکش آنکھیں، مسحور کن سراپا۔ گلی محلے کے ہر لڑکے کی اس پر نظر تھی لیکن وہ اپنی نظریں ہمیشہ نیچی رکھتی۔ اسے معلوم ہی نہ ہوتا کہ کون لڑکا کہاں کھڑا ہے اور کون اس کے پیچھے چل رہا ہے۔ گلی کے آخر میں ایک چھوٹا سا چوک تھا، وہاں دو چار دکانیں تھیں۔ انہی میں ایک پنواڑی بھی تھا۔ باپ کے اچانک انتقال کے بعد اس کے سولہ سترہ سالہ لڑکے نے دکان سنبھال لی تھی۔ اس کی دکان پر محلے کے نوجوان اوباش لڑکے کھڑے رہتے تھے جو ہر آنے جانے والی لڑکی کو دیکھ کر اس پر کوئی جملہ کسنا یا کوئی گانا گا کر اپنی ناآسودہ خواہشوں کا اظہار کرنا، فرض اوّلین سمجھتے تھے۔

نویں کلاس کی یہ طالبہ افشاں ان کے خاص نشانے پر تھی لیکن اس کی شرافت کے سامنے اُن کی کوئی پیش نہیں چل رہی تھی۔ افشاں اپنی پڑوسی لڑکی طاہرہ کے ساتھ اسکول جایا کرتی تھی۔ طاہرہ کو نظریں نیچی رکھنے کی عادت نہ تھی۔ وہ اسکول جاتے ہوئے اردگرد کھڑے لڑکوں کے بارے میں اپنی ''رننگ کمنٹری'' جاری رکھتی تھی۔ افشاں اس کو کتنا ہی ٹوکتی لیکن اس کی ''صحت'' پر کوئی اثر نہ پڑتا۔

اس ''کمنٹری'' کا نتیجہ یہ نکلا کہ افشاں کے کان، آنکھیں بن گئے۔ وہ کافی عرصے سے کسی اسد نامی لڑکے کے بارے میں سن رہی تھی جو ان کے تعاقب میں رہتا تھا لیکن اس نے کبھی کوئی اوچھی حرکت نہیں کی تھی۔ وہ بس خاموشی سے ان کے پیچھے چلتا اور اسکول سے واپس لوٹ جاتا تھا۔ طاہرہ اکثر اسے اکساتی، نظریں اٹھا کر اس کی طرف دیکھنے کی فرمائش کرتی۔ یہ باور کرانے کی کوشش کرتی کہ وہ صرف افشاں کے لئے آتا ہے۔ افشاں ان باتوں کو ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے نکال دیتی۔

طاہرہ نے جب دیکھا کہ افشاں کے دل کا موم پگھلتا ہی نہیں تو اس نے ایک نیا گل کھلایا۔ ایک دن بے چین طاہرہ نے اپنے پاس سے گزرتے اسد سے بڑے رسان سے کہا۔ ''یوں آخر کب تک پیچھا کیے جاؤ گے، کچھ منہ سے تو بولو؟''

طاہرہ کی اس حرکت پر افشاں نے اس کے زور سے چٹکی لی۔ وہ بلبلا اٹھی۔ ''مجھے کیوں نوچتی ہے، اس گونگے سے کیوں نہیں پوچھتی؟'' پھر یکدم خیال آیا۔ ''کیا پتا کہیں یہ سچ مچ گونگا نہ ہو۔''

اسد مسکراتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ وہ کچھ نہیں بولا۔

اس کے آگے جانے کے بعد افشاں نے طاہرہ کی اچھی خاصی خبر لی۔ اسے شدید غصہ آیا اور اس غصے میں اس نے طاہرہ سے دوستی توڑ لی۔

آج وہ اکیلی اسکول گئی اور واپس آئی تھی۔ اسے سب سے زیادہ پریشانی پان کی دکان پر کھڑے لڑکوں کے قریب سے گزرتے ہوئے ہوتی تھی۔ طاہرہ ساتھ ہوتی تو وہ ہمت کر کے وہاں سے گزر جاتی تھی۔ آج اسکول جاتے اس دکان کے سامنے سے گزرتے اسے پسینے آ گئے تھے۔ ایک دو لڑکوں نے اس کا پیچھا بھی کیا تھا۔ انہی میں سے کسی لڑکے نے فلمی مکالمے بولتے ہوئے اس کا دوپٹہ کھینچنے کی کوشش کی تھی۔

نزدیک ہی اسد موجود تھا۔ وہ قد و کاٹھ کا اچھا تھا۔ اس نے اس سوکھے سڑے لڑکے کی اچھی خاصی پٹائی کر دی اور اسے بہ حفاظت اسکول تک چھوڑ کر گیا۔

اسکول کے گیٹ کے نزدیک پہنچ کر افشاں چند لمحوں کے لئے رکی۔ جیسے ہی اسد اس کے قریب آیا، اس نے پہلی بار نظر اٹھا کر اسد کو دیکھا اور دھیرے سے بولی۔ ''آپ کا شکریہ!'' پھر شکریہ ادا کر کے وہ وہاں رکی نہیں۔ اس نے اسد کا جواب بھی سننے کی کوشش نہیں کی تھی۔

اسد اچھے ڈیل ڈول کا اٹھارہ انیس سال کا وجیہہ لڑکا تھا۔ وہ ایک نظر میں اس کی آنکھوں میں بس گیا۔ اس کے بعد خطوط کا سلسلہ شروع ہوا اور چلتا رہا۔

افشاں میٹرک میں پہنچ گئی۔ اب اسے سوتے جاگتے، اٹھتے بیٹھتے، کھاتے پیتے، ہر وقت ہر جگہ اسد کا خیال رہنے لگا۔ اس کے اندر کی کیفیت بدل گئی۔ وہ جو ان معاملات سے دور بھاگتی تھی، اب اس ''معاملے'' میں اندر تک اتر گئی۔ طاہرہ سے پھر دوستی ہو گئی۔ جو باتیں اسے پہلے بری لگتی تھیں، اب وہ باتیں اچھی لگنے لگیں۔ اپنے دل کا حال تمام کہنے کے لئے اس نے طاہرہ کو رازدار بنا لیا۔

اسد نے اب باہر ملنے کا تقاضا شروع کیا۔ اس کے بے حد اصرار پر وہ طاہرہ کے ساتھ ایک پارک میں ملنے لگی۔ طاہرہ پارک میں جا کر الگ ہو جاتی اور وہ دونوں کسی تنہا بنچ پر جا بیٹھتے۔ ایسا دو تین بار ہوا۔ اسد کو طاہرہ کی موجودگی کھٹکتی تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ طاہرہ ان کی ملاقاتوں میں حائل نہ ہو لیکن افشاں خوفزدہ رہتی تھی۔ طاہرہ کی وجہ سے اسے تحفظ حاصل تھا۔ افشاں کے والد اور بھائی ایک گارمنٹس فیکٹری میں ملازم تھے۔ دیکھے جانے کی صورت میں اس پر قیامت ٹوٹ سکتی تھی۔

ایک دن اسکول سے چھٹی کے بعد اسکول سے باہر نکلی تو اسد گاڑی لئے سامنے کھڑا تھا۔ اس نے افشاں اور طاہرہ کو ساتھ بٹھایا۔ راستے میں اس نے افشاں کو بتایا کہ وہ اسے اپنی بڑی بہن سے ملانا چاہتا ہے۔ وہ اس سے ملنے کے بعد امی سے سفارش کریں گی۔ پھر امی ابو اس کے گھر آئیں گے۔ یہ ایک اچھی خبر تھی۔

افشاں چاہتی تھی کہ طاہرہ بھی ساتھ چلے لیکن اس نے جانے سے انکار کر دیا تو اسد نے طاہرہ کو گھر کے نزدیک چھوڑا اور اسے لے کر آگے بڑھ گیا۔

اسد ایک باتونی لڑکا تھا۔ وہ راستے بھر افشاں کو شادی کے خواب دکھاتا آیا۔ افشاں بہت خوش تھی کہ اس کی زندگی میں ایک ایسا لڑکا آیا تھا جس نے اس سے کبھی کوئی غیر اخلاقی بات نہ کی تھی، اب وہ اسے بڑی بہن سے ملانے لے جا رہا تھا کہ شادی میں حائل رکاوٹیں دور ہوں۔

جب وہ دونوں ہنستے مسکراتے سیڑھیاں چڑھتے آخری یعنی چوتھے فلور کے ایک فلیٹ کے دروازے پر پہنچے تو اسد نے ایک ایسی حرکت کی کہ افشاں پریشانی میں مبتلا ہو گئی۔

PDF BY Manzoor

اور بات تھی بھی پریشانی کی۔

اسد نے جینز کی جیب سے ایک لمبی چابی نکالی اور دروازے میں لگے تالے کے سوراخ میں ڈال دی اور اسے دیکھ کر مسکرایا۔

''یہ آپ کی بہن کا گھر ہے؟'' افشاں نے پریشان ہو کر پوچھا۔

''ہاں۔'' اسد نے پورے اعتماد سے چابی گھمائی۔

''وہ کہاں ہیں اور ان کے گھر کی چابی آپ کے پاس کیوں ہے؟'' افشاں کی گھبراہٹ بدستور تھی۔

اسد دروازہ کھولتے کھولتے رک گیا اور اس کی طرف پلٹتے ہوئے بولا۔ ''باجی ایک اسکول میں ہیڈ مسٹریس ہیں۔ انہوں نے کہا تھا کہ اگر مجھے اسکول سے آنے میں دیر ہو جائے تو پریشان نہ ہونا، یہ ڈپلی کیٹ چابی رکھ لو، دروازہ کھول کر اطمینان سے بیٹھ جانا اور افشاں کو کولڈ ڈرنک پلانا نہ بھولنا۔'' اتنا بول کر اس نے افشاں کی طرف دیکھا۔ ''اب تم بیٹھنا نہ چاہو تو واپس چلتے ہیں۔'' یہ کہہ کر اس نے افشاں کے جواب کا انتظار نہ کیا۔ دروازہ لاک کیا اور سیڑھیوں کی طرف قدم بڑھائے۔ ''آؤ چلیں۔''

''نہیں اسد۔ باجی برا مانیں گی۔ کچھ دیر انتظار کر لیتے ہیں۔'' افشاں بولی۔

''جیسی تمہاری مرضی۔'' یہ کہہ کر اس نے تیزی سے تالے میں چابی گھمائی اور دروازہ کھول کر اسے اندر آنے کی جگہ دی۔

جب وہ اندر آ گئی تو اسد نے لاؤنج کی لائٹ روشن کی۔ اگرچہ یہ دوپہر کا وقت تھا لیکن فلیٹ میں اندھیرا تھا۔ لاؤنج میں چار کرسیوں والی چھوٹی شیشے کی ڈائننگ ٹیبل پڑی تھی۔

افشاں نے اپنا بیگ ٹیبل پر رکھا۔ لاؤنج میں چاروں طرف نظریں گھمائیں۔ اسد نے دروازہ لاک کیا اور چابی تالے میں لگی چھوڑ دی۔ پھر اس نے ڈرائنگ روم کی لائٹ جلائی اور افشاں سے پوچھا۔ ''کہاں بیٹھیں گی محترمہ؟''

''اسد، یہیں بیٹھ جاتے ہیں۔'' افشاں ڈائننگ ٹیبل کی طرف بڑھتے ہوئے بولی۔ وہ چاہتی تھی کہ دروازے کے قریب رہے۔

''اس کا مطلب ہے کہ افشاں صاحبہ کو خاصی بھوک لگی ہے۔'' اسد نے شرارت سے کہا۔

''نہیں۔ جناب ایسی کوئی بات نہیں۔'' افشاں چوری بن گئی۔

''باجی کا گھر دیکھ لو۔ پھر جہاں دل چاہے بیٹھ جانا۔'' اسد نے بیڈ روم کی طرف قدم بڑھائے۔

اس فلیٹ میں دو بیڈ رومز تھے۔ نفاست سے سجے ہر کمرے سے بہن کا سلیقہ جھلکتا تھا۔ اسد بیڈ رومز کی لائٹ جلی چھوڑ کر اسے لاؤنج میں لے آیا اور بولا۔ ''جی افشاں، کہاں بیٹھیں گی؟''

''یہیں بیٹھ جاتے ہیں۔'' افشاں نے ڈائننگ ٹیبل کی ایک کرسی کھینچتے ہوئے کہا۔

''بھئی اس سے پہلے کہ باجی آ جائیں، ہمیں کولڈ ڈرنک پی لینی چاہئے۔ ورنہ وہ آتے ہی میری پٹائی کریں گی۔ آخر کو وہ ہیڈ مسٹریس ہیں۔'' اسد فریج کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔

افشاں مسکرا کر رہ گئی۔

اسد نے ٹھنڈے مشروب کی بوتل نکالی۔ اس میں بمشکل ایک ڈیڑھ گلاس مشروب نظر آ رہا تھا۔ اس نے دو گلاس اور بوتل میز پر رکھی، ڈھکن کھول کر مشروب گلاس میں انڈیلا۔ اس بوتل میں اتنا ہی مشروب تھا کہ گلاس بھر سکا۔

بھرا گلاس اسد نے افشاں کی طرف بڑھایا۔ ''لیجئے محترمہ! آپ شروع کیجئے۔''

''میں اکیلی پیوں گی کیا؟'' افشاں دوسرے خالی گلاس کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولی۔ ''آدھا آدھا کر لیتے ہیں۔''

''ارے نہیں۔'' اسد خالی گلاس اپنے قبضے میں کرتے ہوئے بولا۔ ''فریج میں ایک بوتل اور ہے، میں وہ نکالتا ہوں۔''

''دیکھ لیں۔ بوتل ہے بھی کہ نہیں۔'' افشاں ہنس کر بولی۔

''ایسا نہیں ہو سکتا۔ میری باجی ایسا غیر ذمے دارانہ کام نہیں کر سکتیں کہ فریج میں بوتل نہ ہو اور پینے کی دعوت دے دیں۔'' اسد نے بڑے یقین سے کہا۔

PDF BY Manzoor

فریج میں نئی بوتل موجود تھی۔اس نے ڈھکن کھول کر اپنا خالی گلاس بھر لیا اور اس کے سامنے آ بیٹھا اور پھر گھڑی پر نظر ڈالتے ہوئے بولا۔"پتا نہیں باجی کب آئیں گی۔میرا خیال ہے کہ کولڈ ڈرنک پی کر نکلتے ہیں۔بند گھر میں بیٹھنے سے کہیں بہتر ہے کہ باہر نکلیں۔چلو سمندر پر چلتے ہیں۔"

"چلیں گے۔پہلے باجی سے تو مل لیں۔"افشاں کے دل میں خالی فلیٹ دیکھ کر جو ہول اٹھا تھا،وہ اسد کی باتوں کی وجہ سے ختم ہو گیا تھا۔وہ پُرسکون ہو گئی تھی۔اسے یقین آ گیا تھا کہ اسد جو کہہ رہا ہے،وہ ٹھیک کہہ رہا ہے۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ گھر اسد کی باجی کا تھا۔مگر باجی نے افشاں کو ملاقات کے لئے گھر بلایا تھا یہ سو فیصد جھوٹ تھا۔باجی بے چاری اپنی فیملی کے ساتھ کوئٹہ گئی ہوئی تھی۔چابی وہ اپنی ماں کو دے گئی تھی کہ اسد کو بھیج کر گھر چیک کروالیں کیونکہ بند گھر چوروں اور ڈاکوؤں کیلئے انتہائی کشش رکھتا ہے۔

بہن کا خالی گھر دیکھ کر اسد نے "ڈاکے" کی منصوبہ بندی کر لی تھی۔اس وقت "ڈاکے" کا پہلا سین جاری تھا۔کولڈ ڈرنک میں پہلے سے خواب آور دوا ملائی جا چکی تھی۔"شکار" اپنے انجام سے بے خبر خوشی خوشی مشروب نوش جاں کر رہا تھا اور "شکاری" کی آنکھوں میں گلاس خالی ہوتے دیکھ کر نشہ بڑھتا جا رہا تھا۔

اسد نے گلاس اٹھا کر مشروب کا آخری گھونٹ لیا اور افشاں کو اس طرح کا تاثر دیا جیسے وہ اس انتظار میں ہے کہ کب افشاں گلاس خالی کرے اور وہ لوگ یہاں سے نکلنے کی تیاری کریں۔

عجلت کے اس تاثر نے اپنا کام دکھایا۔افشاں نے جلدی جلدی کولڈ ڈرنک کے گھونٹ بھرے اور گلاس خالی کر دیا۔

اسد نے دونوں خالی گلاس کچن میں جا کر دھوئے۔بوتل فریج میں رکھی اور افشاں کی طرف دیکھا اور بولا۔"ہاں افشاں چلیں۔باجی تو آئی نہیں۔"

"جی۔"افشاں نے جواب دیا لیکن اسے یہ یاد نہ رہا کہ اسد نے اس سے کیا کہا تھا جس کے جواب میں اس نے "جی" کہا تھا۔اس کے دماغ میں غبار سا بھر گیا تھا۔

اس سے قبل کہ وہ بے سدھ ہو کر کرسی سے گرتی،اسد نے اسے تھام لیا اور اٹھا کر بیڈ روم میں لے آیا۔

دو تین گھنٹے کے بعد جب افشاں کو ہوش آیا تو اسے اپنی تہی دامنی کا احساس ہوا۔شکار ہو جانے پر اس کے دل میں شدید ٹیس سی اٹھی۔اس کی آنکھیں بے اختیار چھلک پڑیں۔وہ تکیے کے میں منہ چھپا کر بلک بلک کر رونے لگی۔اپنے لٹنے کا احساس تو تھا ہی،یہ غم اس سے سوا تھا کہ اسد نے اس کے ساتھ دھوکا کیا تھا،اس کا اعتماد پارہ پارہ کیا تھا۔

اسد نے ہاتھ جوڑ کر اس سے معافی مانگی اور کہا کہ گہری نیند میں اس کا حسن بلا خیز دیکھ کر وہ خود پر قابو نہ رکھ سکا۔یہ نہ بتایا کہ کولڈ ڈرنک میں نیند کی گولی کس نے ڈالی تھی۔اس نے بہن کے بارے میں بتایا کہ وہ اسکول میں ٹیچرز کی میٹنگ میں پھنس گئی تھیں،اس لئے آ نہ سکیں۔یہ نہ بتایا کہ وہ اس شہر میں ہی نہیں تھیں اور آئندہ ان سے ملاقات کا کوئی امکان بھی نہیں۔

اسد نے اس کے آنسو پونچھ کر تسلی دی کہ وہ بہت جلد اپنے والدین کو اس کے گھر بھیجے گا۔اگر والدین نہ مانے تو وہ اس سے کورٹ میرج کر لے گا،اسے اپنا بنا لے گا،وہ پریشان نہ ہو۔

لیکن پریشانی تو اس کا مقدر ہو چکی تھی۔وہ افشاں کو گاڑی میں بٹھا کر اسے گھر کے قریب چھوڑ گیا،ہمیشہ کے لئے۔

PDF BY Manzoor

گھر کا دروازہ کھلا تھا۔ وہ گھر میں داخل ہوئی تو ماں کچن میں چائے بنا رہی تھی۔ افشاں کچن کے سامنے سے گزرتی ہوئی کمرے میں چلی گئی۔

بیگ رکھ کر ابھی وہ شوز اتار رہی تھی کہ ماں اندر آ گئی اور آتے ہی سخت لہجے میں بولی۔ ''کہاں تھی تو؟''

افشاں ایک سیدھی لڑکی تھی۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ وہ ماں سے کیا کہے لیکن جواب بہر حال دینا تھا۔ وہ اتنا ہی کہہ سکی۔ ''امی۔ میں اسکول میں تھی، ٹیچر نے روک لیا تھا۔''

''جھوٹ بولتی ہے تو۔ میں طاہرہ کے گھر گئی تھی، اس نے مجھے بتا دیا ہے کہ تو کسی کے ساتھ گئی تھی۔'' ماں نے اس کی اُجڑی صورت دیکھ کر اندازہ لگا لیا کہ وہ کیا کر کے آ رہی ہے۔ اس نے افشاں کا جوتا اٹھایا اور اُسے مارنے لگی۔ ''بتا تو کس کے ساتھ گئی تھی؟''

وہ چپ چاپ پٹتی رہی اور روتی رہی۔ وہ کیا جواب دیتی، اس کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ اس کا جسم ہی نہیں، روح بھی زخمی تھی۔

جب ماں مار مار کر تھک گئی تو اس نے جوتا پھینک دیا۔ تب افشاں نے ماں کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔ ''امی مجھے اور ماریں، اتنا ماریں کہ میں مر جاؤں، میں زندہ نہیں رہنا چاہتی۔''

ہونے والی بات ہو کر رہی۔ کوئی ٹوٹا ٹوٹکا، کوئی گولی کام نہ آ سکی۔ جب کسی کا آنا ٹھہر گیا تو افشاں کی ماں زاہدہ کی روح تک کانپ گئی۔ رسوائی اور بدنامی نے اس کا گھر دیکھ لیا تھا۔ افشاں سے زیادہ زاہدہ کی حالت خراب تھی۔ جو ہونے والا تھا، وہ اسے کسی قیمت پر برداشت کرنے کو تیار نہ تھی۔ زاہدہ، افشاں کو ایک قریبی کلینک لے کر پہنچی۔

زاہدہ نے لیڈی ڈاکٹر کی منت سماجت کی۔ اس کے پاؤں تک پکڑے کہ وہ کسی طرح افشاں کو اس ''مصیبت'' سے نجات دلا دے لیکن اصول پسند ڈاکٹرس سے مس نہ ہوئی۔ وہ ''قاتل'' ڈاکٹر بننے کے لئے ہرگز تیار نہ تھی۔

''نہیں بی بی۔ میں یہ ہرگز نہیں کر سکتی۔'' بالآخر اس نے حتمی انداز میں فیصلہ سنا دیا۔

''ڈاکٹر صاحبہ۔ اگر آپ نے ہمیں رسوائی سے نجات نہ دلائی تو میں اپنی بیٹی کو زہر دے دوں گی۔'' زاہدہ نے اپنے دوپٹے سے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

لیڈی ڈاکٹر کے پاس اس بات کا کوئی جواب نہ تھا۔ وہ خاموشی سے اسے دیکھتی رہی۔

زاہدہ، افشاں کو لے کر کلینک سے نکل گئی لیکن لیڈی ڈاکٹر کے دل میں پھانس سی چبھا گئی۔ وہ ماں کا دکھ سمجھتی تھی لیکن اس کے پاس دکھ کا مداوا نہ تھا۔ بس وہ بے بسی سے سوچتی رہ گئی۔

لیڈی ڈاکٹر کے حتمی فیصلے کی طرح زاہدہ نے بھی حتمی فیصلہ کر لیا تھا۔ اگر ڈاکٹر اس کی بیٹی کو رسوائی سے نجات دلانے سے قاصر تھی تو کیا ہوا، وہ خود تو بے بس نہ تھی۔ وہ اپنی افشاں کو اس رسوائی سے نجات دلانے پر قادر تھی۔

اسی رات اس نے افشاں کو اس کے آخری انجام سے دوچار کرنے کا پختہ ارادہ کر لیا۔ جب گھر کے سب افراد سو گئے تو زاہدہ نے اپنے برابر سوئی ہوئی افشاں کو اٹھایا۔ ''اُٹھ جا بدبخت۔''

''امی کیا ہوا؟'' افشاں آنکھ ملتی ہوئی اٹھ گئی۔

''اب بھی کچھ اور ہونے کو باقی رہ گیا ہے۔'' زاہدہ نے بڑے زہریلے انداز میں کہا۔ ''جانا کہ آ!''

''امی! کیوں؟ یہ کون سا وقت ہے نہانے کا۔'' افشاں حیران تھی۔

''اب تجھے اوپر جانا ہے۔ اچھا ہوگا کہ نہا دھو کر جائے۔'' زاہدہ نے عجیب لہجے میں کہا۔

''ٹھیک ہے امی۔'' افشاں کو جیسے ساری بات یکلخت سمجھ میں آ گئی۔

وہ اٹھ کر غسل خانے میں چلی گئی۔ دس منٹ کے بعد وہ واپس آئی تو اس کے چہرے پر بڑا نکھار تھا۔ چراغ بجھنے سے پہلے بھڑکتا ہے۔ اس کا چہرہ اسی کیفیت کا غماز تھا۔

زاہدہ نے اس کے چہرے سے فوراً نظر ہٹاتے ہوئے کہا۔ ''بیٹھ۔''

افشاں، زاہدہ کا حکم سن کر بیڈ پر بیٹھ گئی۔ زاہدہ نے لکڑی کی الماری سے بوتل نکالی۔ وہ ایک شاپر میں لپٹی تھی۔ زاہدہ نے بوتل شاپر سے نکالی اور افشاں کو دیتے ہوئے بولی۔ ''لے میری جان، پی جا اسے۔''

''امی۔ تم نے میری جان کہا، اب یہ سفر میرے لئے آسان ہو گیا، لاؤ بوتل دو مجھے۔'' افشاں نے ماں کے ہاتھ سے بوتل لے لی۔

پھر اس نے بوتل کا ڈھکن کھولا، اپنا چہرہ اوپر اٹھایا، منہ کھولا اور تیزی سے تیزاب پیتی چلی گئی۔

تیزاب کے اندر جاتے ہی اس کی حالت خراب ہو گئی۔ وہ بری طرح کراہنے لگی۔

تب ہی انارہ چیخ پڑی۔ ''اماں، اماں۔ اس منظر کو ہٹا میرے سامنے سے۔ مجھ سے نہیں دیکھا جا رہا۔ میرے جسم میں آگ سی لگ گئی ہے۔''

مائی پنکھی یکدم چونکی اور جلدی سے بولی۔ ''اچھا صبر کر۔''

یہ منظر انتہائی دلخراش تھا۔ افشاں کا سیال آگ میں جلتا وجود، اس کا تڑپتا جسم کسی بھی انسان کو خون کے آنسو رُلا سکتا تھا۔ مائی پنکھی نے مٹھی کھول کر تیزی سے کچھ پڑھا اور دوسرے گھر میں بیٹھی انارہ پر پھونک ماری۔

انارہ کی آنکھوں کے سامنے یکدم گہرا اندھیرا چھا گیا۔ افشاں کا تڑپتا وجود اس کی آنکھوں کے سامنے سے اوجھل ہو گیا۔ بس انارہ گہرے اندھیرے میں گہرے سانس لیتی رہ گئی۔

اسے لگا تیزاب افشاں نے نہیں، خود اس نے پیا تھا۔ ابھی تک اس کے وجود میں آگ لگی ہوئی تھی۔ وہ اس دل دہلانے والے منظر کو بھلا نہیں پا رہی تھی۔

''چل اٹھ جا انجو۔'' مائی پنکھی نے چاندی کا بھاری تعویذ اپنے گلے میں ڈالتے ہوئے کہا اور خود بھی ساتویں گھر سے نکل آئی۔ وہ چارپائی پر لیٹ گئی۔ اس پر شدید تھکن طاری تھی۔

انارہ اپنے حواس پر قابو پاتے ہوئے دوسرے گھر سے نکل آئی اور چارپائی کی پائینتی کی جانب بیٹھ گئی۔ اس نے مائی پنکھی کی لکڑی کی طرح سوکھی ٹانگوں کو اپنی گود میں رکھ لیا اور آہستہ آہستہ دبانے لگی۔

مائی پنکھی اپنا ایک ہاتھ آنکھوں پر رکھے کچھ دیر یونہی لیٹی رہی۔ پھر اچانک بولی۔ ''انجو۔ ابھی تو نے جو کچھ دیکھا، وہ کس کی جیون کتھا تھی؟''

''اماں۔ مجھے نہیں معلوم۔'' انارہ نے جانتے بوجھتے انکار کیا۔

''جنم جلی۔ یہ تیری جیون کتھا تھی، تیرا دوسرا گھر۔'' مائی پنکھی نے اپنے پاؤں سکوڑتے ہوئے کہا۔ ''جا اب اندر چلی جا۔''

''جاتی ہوں اماں۔'' انارہ اٹھتے ہوئے بولی۔ ''تو مجھے اپنے پاس بیٹھنے کیوں نہیں دیتی؟''

''تو مجھ بڑھیا کے پاس بیٹھ کر کیا کرے گی۔'' مائی پنکھی نے ہنس کر کہا۔ ''ویسے بھی میرے پاس وقت کہاں ہوتا ہے۔ چل جا اب تو۔''

انارہ کوئی جواب دیئے بغیر کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

☆.....☆.....☆

''دیکھو پیارے بھائی، اتنا یاد رکھو کہ وہ خبیث بہو کے وجود سے نکل ضرور گیا ہے لیکن جیسا میں نے کہا کہ سیلاب کی طرح اپنے اثرات چھوڑ گیا ہے۔ اب آپ کو اس بات کا خیال رکھنا ہے کہ جیسے ہی بہو کا پاؤں بھاری ہو، مجھے فوراً بتانا۔ بچے کی ولادت تک ہمیں بہو کا خاص خیال رکھنا ہوگا۔ اب میں چلتا ہوں۔ اللہ حافظ۔'' پروفیسر مجاہد اٹھتے ہوئے بولے۔

''اس کا مطلب ہے کہ یہ سلسلہ ابھی رکا نہیں۔'' نثار ایوب ساتھ چلتے ہوئے بولے۔

''بس یوں سمجھ لیں کہ ہاتھی نکل گیا ہے، اس کی دم باقی رہ گئی ہے یا یوں کہہ لیں کہ پلکوں کی سوئیاں رہ گئی ہیں، جو اچھا لگے، وہ سمجھ لیں۔ پر حقیقت یہی ہے کہ ابھی آخری مرحلہ باقی ہے۔ اللہ بہتر کرے گا۔'' پروفیسر مجاہد نے کہا۔ نثار ایوب سے ہاتھ ملایا اور رخصت ہو گئے۔

یہ آخری مرحلہ ضرور تھا لیکن کسی معرکے سے کم نہ تھا۔

پاؤں بھاری ہوتے ہی پروفیسر مجاہد کو مطلع کیا گیا۔ انہوں نے اسی دن مغرب کے بعد حاضری دی۔ بہو کو اپنے سامنے بٹھا کر دو تین منٹ کچھ پڑھا، پانی بھرے گلاس پر دم کیا اور نازنین کو پلا دیا اور بغیر ایک لفظ بولے گھر سے نکل گئے۔

دو گھنٹے کے بعد ان کا فون آیا کہ علی نثار کو میرے پاس بھیج دیں۔ نثار ایوب نے فوراً علی کو پروفیسر مجاہد کے گھر روانہ کر دیا۔

پروفیسر مجاہد نے علی نثار کو نازنین کے پیٹ پر باندھنے کے لئے ایک گنڈا دیا اور کہا۔ ''بہو سے کہنا کہ اسے ہر وقت پیٹ پر باندھے رکھے، اسے کسی بھی صورت اُتارے نہیں۔''

''جی اچھا۔'' علی نثار مؤدبانہ لہجے میں بولے۔

''مغرب کے بعد گھر سے نکلنے پر سخت پابندی ہے۔'' پروفیسر مجاہد نے ایک اور ہدایت دی۔ ''یہ پابندی کم از کم تین ماہ رہے گی، تین ماہ بعد بہو گھر سے باہر جا سکے گی لیکن میری اجازت کے بغیر نہیں۔''

PDF BY Manzoor

’’جی ٹھیک ہے۔‘‘علی نثار نے کہا۔

دوڈھائی ماہ خیریت سے گزر گئے پھر ایک واقعہ ہوا۔

نازنین اور علی نثار دوپہر کا کھانا کھا کر اپنی خالہ کے گھر سے واپس آرہے تھے۔وہ سیڑھیاں اتر رہے تھے،فلیٹ کی آخری پانچ چھ سیڑھیاں رہ گئی تھیں کہ اچانک علی نثار کو جانے کیا ہوا کہ وہ لڑھکتے ہوئے نیچے آرہے۔نازنین ان سے دو سیڑھیاں پیچھے تھیں۔اپنے شوہر کو گرتے دیکھ کر ان کی چیخ نکل گئی۔وہ کم سیڑھیوں سے گرے تھے لہٰذا کسی گہری چوٹ سے بچ گئے،بس ہاتھوں اور کہنی پر معمولی چوٹیں آئیں۔

نثار ایوب نے فون کر کے پروفیسر مجاہد کو اس واقعہ سے مطلع کیا۔انہوں نے علی نثار سے بات کرنے کی خواہش ظاہر کی۔جب علی نثار فون پر آئے تو پروفیسر مجاہد نے اپنے مخصوص لہجے میں کہا۔’’ہاں بھئی،کہاں گرتے پھر رہے ہو۔کیا ہوا تھا؟‘‘

جواب میں علی نثار نے واقعہ بیان کیا۔

’’کیا سیڑھیوں پر کوئی پھسلن وغیرہ تھی؟‘‘پروفیسر مجاہد نے پوچھا۔’’تمہارا پاؤں پھسلا تھا؟‘‘

’’نہیں۔پاؤں نہیں پھسلا بلکہ مجھے یہ محسوس ہوا جیسے کسی نے دھکا دیا ہے۔‘‘علی نثار نے بتایا۔

’’لیکن پیچھے تو تمہارے تمہاری بیگم تھیں،کیا انہوں نے دھکا دیا تھا؟‘‘پروفیسر مجاہد بولے۔

’’نہیں،ایسا ممکن نہیں۔‘‘علی نثار نے کہا۔’’ہوسکتا ہے یہ میرا وہم ہو۔‘‘

’’ہاں بیٹا۔ایسا ہی ہوگا۔‘‘پروفیسر مجاہد نے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔

پندرہ بیس دن آرام سے گزر گئے۔پھر ایک مسئلہ کھڑا ہوا۔

آدھی رات کو اچانک نازنین کی آنکھ کھلی۔کمرے میں گھپ اندھیرا تھا۔نائٹ بلب بھی روشن نہ تھا۔انہوں نے کوئی ڈراؤنا خواب دیکھا تھا۔اس کی دہشت سے آنکھ کھلی تھی۔ کمرے میں اندھیرا پا کر وہ مزید حواس گم کر بیٹھی تھیں۔ابھی وہ سوچ ہی رہی تھیں کہ وہ کہاں ہیں اور انہوں نے خواب میں کیا دیکھا تھا کہ کسی نوزائیدہ بچے کے رونے کی چیخ نما آواز آئی۔

یہ آواز ان کے پہلو سے آئی تھی۔وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھیں اور جلدی سے کمرے کی لائٹ آن کی۔گھبرا کر بیڈ کی جانب دیکھا۔بیڈ پر علی نثار موجود تھے اور وہاں کچھ نہ تھا۔

علی نثار کی لائٹ جلتے ہی آنکھ کھل گئی۔ان کی نظر متوحش نازنین پر پڑی تو وہ پریشان ہو کر اٹھ بیٹھے۔’’کیا ہوا نازنین؟‘‘

نازنین،علی نثار کے پاس آبیٹھیں۔وہ کانپ رہی تھیں۔علی نثار نے انہیں قریب کرتے ہوئے پوچھا۔’’کیا ہوا۔کوئی ڈراؤنا خواب دیکھ لیا کیا؟‘‘

’’جی ڈراؤنا خواب تو دیکھا ہی......لیکن آنکھ کھلتے ہی ایک عجیب بات ہوئی۔پہلے یہ بتائیں یہ نائٹ بلب کس نے بند کیا؟‘‘نازنین نے نیلے زیرو واٹ کے بلب کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

’’میں نے تو بند نہیں کیا۔‘‘علی نثار نے بٹن کی طرف دیکھا جو آن تھا۔وہ اٹھے اور بٹن کو آن آف کیا،بلب نہ جلا۔’’میرا خیال ہے فیوز ہوگیا۔‘‘

’’اس کمبخت نے بھی،ابھی فیوز ہونا تھا۔‘‘نازنین نے غصہ کیا۔

’’کچھ بتاؤ تو،آخر ہوا کیا؟‘‘علی نثار،نازنین کے قریب آبیٹھے۔

تب نازنین نے اچانک خوفزدہ ہو کر آنکھ کھلنے کی بات کی۔انہوں نے کوئی ڈراؤنا خواب دیکھا تھا۔خواب انہیں یاد نہ تھا،بس ایک احساس تھا۔پھر انہوں نے بتایا کہ اندھیرے میں یوں محسوس ہوا جیسے کوئی نوزائیدہ بچہ ان کے پہلو میں لیٹا چیخ رہا ہے۔

’’مجھے لگتا ہے کہ یہ بھی تم نے خواب میں ہی دیکھا۔‘‘علی نثار نے نازنین کی ساری بات سن کر کہا۔

’’نہیں......اس بچے کی چیخنے کی آواز میں نے پورے ہوش وحواس میں سنی۔‘‘نازنین اس چیخ کو خواب کا حصہ ماننے کو تیار نہ تھیں۔

اور ابھی یہ بحث چل رہی تھی کہ واش روم سے پھر ویسی ہی رونے کی چیخ نما آواز آئی۔یہ آواز انتہائی کرخت اور تیز تھی۔

’’ہائے اللہ۔‘‘نازنین خوف کے مارے علی نثار سے لپٹ گئیں۔’’کیا آپ نے یہ آواز سنی؟‘‘

’’ہاں۔میں دیکھتا ہوں۔‘‘علی نثار اٹھ کر واش روم کی طرف بڑھے۔

واش روم کا دروازہ مکمل بند نہ تھا،تھوڑا سا کھلا ہوا تھا۔علی نثار نے پورا دروازہ کھول دیا۔اندر ملگجا سا اندھیرا تھا۔کچھ دکھائی نہ دیا۔

انہوں نے واش روم کی لائٹ جلائی۔اتنے میں نازنین بھی بیڈ سے اٹھ کر دروازے پر آگئی تھیں۔علی نثار نے واش روم کے اندر جا کر اچھی طرح معائنہ کیا لیکن انہیں کہیں کوئی بچہ نہ دکھائی دیا۔

وقت گزرنے کے ساتھ وحشت بڑھتی گئی۔نازنین پر ہر دم ایک گھبراہٹ سی طاری رہنے لگی۔

پروفیسر مجاہد کا علاج جاری تھا۔انہیں ہر بات سے آگاہ رکھا جارہا تھا۔ان کا خیال تھا کہ جب تک بچے کی ولادت نہیں ہوجاتی،اس قسم کے واقعات پیش آتے رہیں گے۔بچے کی پیدائش کے بعد ہر طرف سکون چھا جائے گا۔

بچے کے جنم میں ابھی تین ماہ باقی تھے۔نازنین وحشت میں مبتلا تھیں۔جو کچھ ان پر بیت رہی تھی،وہ ان کا سکون برباد کرنے کیلئے کافی تھی۔

اب انہیں صرف بچے کی آواز سنائی نہیں دیتی تھی بلکہ بچہ بھی دکھائی دینے لگا تھا۔عجیب الخلقت بچہ۔اس کے سر اور چہرے پر بے پناہ بال تھے،کسی بن مانس کی طرح۔وہ کسی بھی وقت کہیں بھی دکھائی دے جاتا۔

کبھی پہلو میں لیٹا غرا رہا ہوتا،کبھی قالین پر پڑا ہاتھ پیر مار رہا ہوتا،کبھی نازنین کپڑے نکالنے کیلئے الماری کھولتیں تو وہ کپڑوں پر پڑا انگوٹھا چوس رہا ہوتا۔

نازنین اسے جب بھی دیکھتیں،ان کی دلخراش چیخ نکل جاتی۔گھر کے افراد پریشان ہو کر ان کے کمرے کی طرف بھاگتے۔

’’کیا ہوا۔کیا ہوا؟‘‘سب پوچھتے۔

وہ بیڈ پر بیٹھی رو رہی ہوتیں۔ان کا پورا جسم کانپ رہا ہوتا۔

فوراً پروفیسر مجاہد کو اطلاع کی جاتی۔وہ اگر گھر پر ہوتے تو بلا تاخیر آجاتے،جھاڑ پھونک کرتے،پانی دم کر کے دیتے اور نازنین کے سر پر ہاتھ رکھ کر تسلی دیتے۔’’بیٹا۔بس تھوڑا اور صبر کرلو،سب ٹھیک ہوجائے گا۔‘‘

پھر ایک دن تو حد ہی ہوگئی۔

دوپہر کا وقت تھا۔نازنین کھانا کھا کر بیڈ پر نیم دراز تھیں۔بیڈروم کا دروازہ کھلا تھا لیکن پردہ پڑا ہوا تھا۔

اتفاق سے وہ دروازے کی طرف ہی دیکھ رہی تھیں۔اچانک پردہ ہلا اور وہ نوزائیدہ شیطان بچہ چلتا ہوا اندر آیا اور بیڈ کے نزدیک آکر بولا۔’’اماں ڈو،ڈو۔‘‘

نازنین کے ہوش اُڑ گئے۔وہ چیخ بھی نہ سکیں،ان کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا آگیا اور وہ اپنی سدھ بدھ کھو بیٹھیں۔

نازنین جانے کتنی دیر بے ہوش پڑی رہیں۔فریدہ کسی وجہ سے کمرے میں آئیں تو انہوں نے نازنین کو بے ہوش پایا۔وہ دوڑ کر اپنے شوہر نثار ایوب کے پاس گئیں،انہیں صورتحال سے آگاہ کیا۔

فوری طور پر نازنین کو اسپتال پہنچایا گیا۔گمان یہ تھا کہ بلڈ پریشر یکدم ہائی ہونے کی وجہ سے نازنین پر بے ہوشی طاری ہوئی ہے۔لیکن ایسا نہ تھا۔بلڈ پریشر کنٹرول میں تھا لیکن دیگر معاملات کنٹرول میں نہ تھے۔

ایمرجنسی میں آپریشن کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔

علی نثار اور پروفیسر مجاہد اسپتال پہنچ چکے تھے۔پروفیسر مجاہد نے نثار ایوب کو ہدایت کر رکھی تھی کہ ڈلیوری کے وقت انہیں ضرور اسپتال بلوا لیا جائے۔اگرچہ فطری طور پر بچے کی پیدائش میں کچھ وقت باقی تھا لیکن صورتحال کی نزاکت کے پیش نظر آپریشن ناگزیر تھا۔

یہ چھوٹا اسپتال تھا،بنیادی طور پر میٹرنٹی ہوم تھا۔اس اسپتال کی روح رواں ایک تجربہ کار لیڈی ڈاکٹر نگہت خان تھیں۔وہ اطلاع ملتے ہی اسپتال آچکی تھیں۔آپریشن جاری تھا۔

پروفیسر مجاہد اسپتال کے پرائیویٹ روم میں بیٹھے سر جھکائے کچھ پڑھ رہے تھے۔ایک کرسی پر نثار ایوب اور بیڈ پر علی نثار بیٹھے تھے۔فریدہ آپریشن تھیٹر کے سامنے موجود تھیں۔وہ دل ہی دل میں بہو کے بخیر و عافیت فارغ ہونے کی دعا مانگ رہی تھیں۔

آپریشن تھیٹر میں عجب پراسراری سنسنی تھی۔جیسے ہی بچے نے جنم لیا،پہلے تو ڈاکٹر نگہت کے ہاتھ کانپے۔پھر کمزور دل نرس اسے دیکھتے ہی بے ہوش ہوگئی۔آیا نے اسے ہاتھ لگانے سے انکار کردیا۔وہ چیختی ہوئی باہر بھاگی۔

ڈاکٹر نگہت کے ہاتھوں ہزاروں بچے دنیا میں آچکے تھے لیکن انہوں نے ایسا عجیب الخلقت بچہ آج تک نہیں دیکھا تھا۔اس کا چہرہ بالوں سے ڈھکا تھا،گول سی آنکھیں،سیاہ رنگت،غیر معمولی ہاتھ پاؤں جو اندر کی جانب مڑے ہوئے تھے۔

یہ انسان کا بچہ تھا ہی نہیں۔پیدا ہوتے ہی اس نے انتہائی کریہہ چیخ ماری اور اٹھنے کی کوشش کی۔اس بچے کو دیکھ کر آپریشن تھیٹر میں موجود اسٹاف کی جان نکل گئی۔سب سے پہلے آیا تھیٹر سے نکل کر بھاگی،پھر بے ہوش نرس کے علاوہ وہاں کوئی نہ رہا۔اگر ڈاکٹر نگہت مضبوط اعصاب کی نہ ہوتیں تو شاید وہ بھی بے ہوش پڑی ہوتیں یا سر پر پیر رکھ کر آپریشن تھیٹر سے بھاگ چکی ہوتیں۔

فریدہ نے چیختی ہوئی آیا کو تھیٹر سے نکلتے دیکھا تو وہ دل تھام کر رہ گئیں۔آیا فریدہ کے قریب آئی اور بمشکل بولی۔’’خدا کی قسم باجی۔وہ انسان کا بچہ نہیں۔‘‘

’’یا اللہ رحم۔یا اللہ خیر۔‘‘فریدہ یہ کہتی ہوئیں کمرے کی طرف بھاگیں۔

پروفیسر مجاہد اور نثار ایوب انہیں دروازے کے باہر ہی مل گئے۔فریدہ کو خوفزدہ دیکھ کر وہ ان کی طرف بڑھے۔’’بیگم،خیر تو ہے؟‘‘

’’وہ بچہ۔وہ بچہ۔‘‘فریدہ نے رک کر گہرا سانس لیا اور پھر بولیں۔’’وہ انسان کا بچہ نہیں۔پتا نہیں کیا ہے۔‘‘

’’پریشان نہ ہوں۔اسے چادر میں لپیٹ کر باہر لے آئیں۔‘‘پروفیسر مجاہد جلدی سے بولے۔وہ جانتے تھے......کس کا بچہ ہے؟

’’ہائے نہیں۔‘‘فریدہ نے خوفزدہ ہو کر کہا۔

’’بیگم۔میں آپ کے ساتھ چلتا ہوں،ڈریں نہیں۔ڈاکٹر سے کہیں وہ بچہ ہمارے حوالے کردے۔میں دروازے پر کھڑا ہوں۔‘‘نثار ایوب نے فریدہ کا ہاتھ پکڑ کر آپریشن تھیٹر کی طرف لے جاتے ہوئے کہا۔

پھر اندر کیا ہوا؟ کس طرح ہوا؟ بہرحال فریدہ اس بچے کو چادر میں لپیٹ کر باہر لے آئیں۔آپریشن تھیٹر کے دروازے پر نثار ایوب موجود تھے۔انہوں نے لپک کر اس ’’شیطان‘‘ کو اپنے ہاتھوں میں لے لیا اور تیر کی طرح وہاں سے نکلے۔

راستے میں پروفیسر مجاہد مل گئے۔وہ اس غیر انسانی بچے کے قریب لگے۔انہوں نے چادر ہٹا کر ایک نظر اس ’’شیطان‘‘ کو دیکھا۔وہ انہیں دیکھ کر غیر انسانی آواز میں

PDF BY Manzoor

غرایا اور ہاتھ، پاؤں مارنے لگا۔

پروفیسر مجاہد نے اس کے چہرے پر چادر ڈالتے ہوئے کہا۔ ''نثار ایوب، جلدی چلیں۔ یہ مرنے نہ پائے۔''

☆......☆......☆

کمرے میں جا کر انارہ بیڈ پر بیٹھ گئی۔ اس کے دل کو سکون نہ تھا۔ بار بار افشاں کا تڑپتا جسم اس کی نگاہوں میں آ جاتا تھا۔ اسے اسد پر شدید غصہ آ رہا تھا جس نے معصوم افشاں کو انتہائی عیاری سے اپنے جال میں پھنسایا تھا۔ سزا تو اسے ملنی چاہئے تھی، تیزاب تو اسے پلایا جانا چاہئے تھا۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ اُڑتی ہوئی چلی جائے اور اسے تیزاب سے بھرے ڈرم میں دھکا دے دے۔ لیکن وہ ایسا کر نہیں سکتی تھی۔ اس نے سوچا مائی پنکھی سے بات کرے۔ اس کی مدد سے وہ اسد کے ٹھکانے پر پہنچ جائے۔

وہ ایک جھٹکے سے اٹھی اور کمرے سے باہر نکل آئی۔

مائی پنکھی چارپائی پر بیٹھی جاپ میں مصروف تھی۔ انارہ کو کمرے سے باہر آتے دیکھ کر اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ وہ ابھی تک آزاد تھی، نہ صرف آزاد تھی بلکہ وہ کمرے سے بھی نکل آئی تھی۔ مائی پنکھی ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی اور اسے ڈانٹتے ہوئے بولی۔ ''انجو تو باہر کیوں آئی۔ چل جلدی اندر چل۔ میں تجھے زنجیر کروں۔''

''اماں۔ کر دینا۔ میں کہیں بھاگ نہیں جا رہی۔'' انارہ نے اس کی ڈانٹ کی پروا نہ کرتے ہوئے کہا۔ ''مجھے ایک بات بتا۔ اماں جس لڑکے کی وجہ سے مجھے تیزاب پینا پڑا، کیا میں اس سے انتقام نہیں لے سکتی؟ اماں تو بڑی مہان ہے۔ بس ذرا مجھے اس لڑکے تک پہنچا دے۔ میں اسے جلا کر واپس آ جاؤں گی۔''

''او۔ میری انجو۔ تو بڑی بھولی ہے۔ یہ گزرے وقتوں کی باتیں ہیں۔ گزرے وقت کو چھیڑا نہیں جا سکتا۔ لکھے کرموں کو بدلا نہیں جا سکتا۔ جو گزر گیا اسے بھول جا۔ ماضی میں جانا ممکن نہیں، اگر تو اس طرح انتقام پر اترے گی تو تیرے ہاتھ کچھ نہیں آئے گا، تو اِدھر کی رہے گی نہ اُدھر کی۔'' مائی پنکھی نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

''اماں۔ بس میرا جی چاہا کہ اس کو زندہ آگ میں جلا دوں۔'' انارہ کو کسی کل چین نہ تھا۔

''اس کا مطلب ہے کہ مجھ سے غلطی ہوئی۔'' مائی پنکھی بولی۔

''تجھ سے بھلا کیا غلطی ہوئی؟'' انارہ اس کی بات نہ سمجھی۔

''تیرا جیون تجھ پر کھول کر۔'' مائی پنکھی نے کہا۔

''نہیں اماں۔ ایسا نہ کہہ۔'' انارہ تڑپ کر بولی۔ ''میں چاہتی ہوں کہ مجھے اپنے بارے میں سب معلوم ہو۔ میں کون ہوں، میں یہ جاننا چاہتی ہوں۔''

''بس یہی سوچ کر میں نے تجھ پر تیرا جیون کھولنا شروع کیا۔ تُو روز میرے کان کھاتی تھی کہ اماں بتا میں کون ہوں۔'' مائی پنکھی اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ''بڑی مشکل سے مجھے اس بات کی اجازت ملی۔ اب میں آئندہ اس وقت ہی تیرے جیون کے بارے میں کچھ بولوں گی جب تو مجھ سے وعدہ کرے گی۔''

''کیسا وعدہ اماں؟'' انارہ نے پوچھا۔

''یہی کہ جو کچھ دیکھے گی، اسے دیکھ کر چپ رہے گی۔''

''چل ٹھیک ہے اماں۔ وعدہ کیا۔'' انارہ نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ ''پر ایک بات ہے اماں۔ یہ مرد ہم پر کب تک ظلم کرتے رہیں گے اور ہم کب تک چپ رہیں گے؟''

''مورکھ انجو۔ تو نے ظلم دیکھے ہی نہیں۔ ایک وہ وقت تھا جب لڑکی کو زندہ دفن کر دیا جاتا تھا۔ پتی کے مرتے ہی اس کی پتنی کو، اس کے ساتھ چتا میں جلا دیا جاتا تھا اور وہ اُف نہ کرتی تھی۔ عورت بیوہ ہو جاتی تو اسے جیتے جی مار دیا جاتا۔ اس کے جذبات پر پتھر برسائے جاتے۔ پر اب وہ کل جیسی عورت نہ رہی۔ مرد اس پر تیزاب پھینکتا ہے تو اب عورت بھی اس پر تیزاب ڈالنے لگی ہے۔ اب بیوی اپنے شوہر کو مار کر اس کا ''سالن'' بنانے لگی ہے۔ کل کی انارہ اور آج کی انارہ میں بڑا فرق ہے۔ کل کی انارہ خاموشی سے تیزاب پی گئی لیکن آج کی انارہ انتقام پر اتر آئی۔ وہ وقت زیادہ دور نہیں جب بیوی ظالم شوہر سے چھٹکارا پانے کے لئے ہاتھ میں تیزاب سے بھری بوتل پکڑے گی اور اپنے شوہر سے کہے گی۔ مجھے فوراً طلاق دے ورنہ میں پھینکتی ہوں تجھ پر تیزاب۔ آج کوئی مرد اسے سگریٹ سے جلاتا ہے تو کل کوئی عورت گرم چمٹے سے اس کا جسم داغے گی۔'' مائی پنکھی اپنی دُھن میں بولتی گئی۔

''چھوڑ اماں۔ جانے تو کیا خواب دیکھنے لگی۔'' انارہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''دو چار مثالوں سے سماج نہیں بدلا کرتا۔ سماج بدلنے کے لئے انقلاب کی ضرورت ہوتی ہے، اور انقلاب مرد لایا کرتے ہیں۔ پھر عورتیں رہیں نا مفتوح کی مفتوح۔''

''میری انجو۔ تو نہیں جانتی کہ عورت کس قدر طاقتور ہوتی ہے۔ جب مرد کے اعصاب پر سوار ہوتی ہے تو اس کا سارا انقلاب، سارا فلسفہ، ساری عقل ٹخنوں میں آ جاتی ہے۔'' مائی پنکھی نے بڑے پتے کی بات کی۔ ''عورت کو اپنا آپ کھوجنا چاہئے۔ وہ کیسی دو دھاری تلوار ہے، اسے جاننا چاہئے۔ وہ کیسا میٹھا زہر ہے، اُسے سمجھنا چاہئے۔''

''اماں! ہمارا مسئلہ یہ ہے کہ ہم دوسرے کے مظالم کی تو بات کرتے ہیں لیکن خود جو ظلم کر رہے ہوتے ہیں، اس پر غور نہیں کرتے۔'' انارہ نے نیا موضوع چھیڑا۔

''انجو۔ کیا کہنا چاہتی ہے۔ صاف بول۔'' مائی پنکھی نے اسے گھورا۔

''اماں! صاف بولی تو...... تُو ناراض ہو جائے گی۔''

''نہیں ہوں گی ناراض۔ تیرے دل میں جو آیا ہے، اسے باہر نکال۔''

''اماں! تو نے مجھے قید کر رکھا ہے، کیا یہ ظلم نہیں؟'' انارہ نے بڑے پیار سے بڑے میٹھے انداز میں کہا۔ ''ہم مردوں کی تو بات کرتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ عورت، عورت پر زیادہ ظلم کرتی ہے۔''

''اچھا۔ بہت بول لی، اب چپ کر۔'' مائی پنکھی آئینے میں اپنی اصل شکل دیکھ کر غصہ ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔ ''چل اندر...... تو بلی ہی بھلی۔''

''تجھے کسی دن پنجہ ماروں گی، پھر پتا چلے گا میرے بلی ہونے کا۔'' انارہ یہ بات کہہ نہ سکی۔ بس سوچ کر رہ گئی اور سوچ، عمل کی پہلی سیڑھی ہوتی ہے۔

☆......☆......☆

وہ دونوں اسپتال سے باہر نکلے۔ نثار ایوب کے ہاتھوں میں وہ ''شیطان'' موجود تھا۔ چادر میں لپٹا ہونے کے باوجود وہ ہاتھ پاؤں مار رہا تھا۔ اس میں نوزائیدہ بچے سے کہیں زیادہ طاقت تھی۔

اتفاق سے اسپتال کے گیٹ پر ہی ایک خالی رکشا مل گیا۔ وہ دونوں تیزی سے اس میں سوار ہو گئے اور قریبی قبرستان چلنے کو کہا۔ رکشا والا فوراً چل پڑا۔

پروفیسر مجاہد مسلسل کچھ پڑھ رہے تھے۔ جیسے جیسے وہ پڑھ رہے تھے، وہ غیر انسانی بچہ اکڑتا چلا جا رہا تھا۔ اس کے ہاتھ پاؤں چلانے کے انداز میں سختی آتی جا رہی تھی۔

قبرستان پہنچ کر پروفیسر مجاہد نے کھڑے ہو کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ شاید قبرستان کا جائزہ لیا اور پھر تیزی سے ایک طرف چل دیئے۔ پروفیسر مجاہد کی رفتار بہت تیز تھی۔ نثار ایوب کو ان کے ساتھ چلنا دوبھر ہو رہا تھا۔

پروفیسر مجاہد مڑ کر ایک لمحے کو نثار ایوب کو دیکھتے اور انہیں اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کرتے۔ کافی اندر جا کر پروفیسر مجاہد ایک ٹوٹی قبر کے پاس ٹھہر گئے۔ راستے میں انہیں ایک پھاوڑا اور پانی کا کنستر رکھا ہوا نظر آیا تھا۔ انہوں نے پھاوڑا اٹھا لیا تھا۔ یہ پھاوڑا ان کے ہاتھ میں تھا۔

ٹوٹی قبر کے برابر ایک اور قبر تھی۔ ان دونوں قبروں کے درمیان اتنی جگہ موجود تھی کہ اس ''شیطان'' کے لئے گڑھا کھودا جا سکتا تھا۔

نثار ایوب نے چاہا کہ پروفیسر مجاہد اس شیطان کو اپنے ہاتھوں میں لے لیں تو وہ خود اس کے لئے گڑھا کھود دیں۔ لیکن پروفیسر مجاہد نے انہیں منع کر دیا۔ یہ کام وہ خود کرنا چاہتے تھے۔ یہ ان کے عمل کا حصہ تھا۔

''پیارے بھائی۔ اس منحوس کو کب تک گود میں اٹھائے رکھو گے۔ ارے پھینکو اسے زمین پر۔'' پروفیسر مجاہد نے آستین چڑھاتے ہوئے کہا۔

نثار ایوب نے چادر میں لپٹی اس غیر انسانی مخلوق کو زمین پر لٹا دیا اور وہ ابھی سیدھے کھڑے ہو ہی رہے تھے کہ عقب سے ایک کرخت آواز آئی۔ ''یہ کیا ہو رہا ہے؟''

PDF BY Manzoor

پروفیسر مجاہد نے پھاوڑا چلاتے ہوئے مڑ کر دیکھا۔ نثار ایوب نے ایک نظر چادر میں لپٹے ''شیطان'' پر ڈالی جو بڑی تیزی سے ہاتھ پاؤں مار رہا تھا۔ پھر انہوں نے بھی پیچھے مڑ کر دیکھا۔

چند قدم کے فاصلے پر ایک ادھیڑ عمر گورکن حیران پریشان کھڑا تھا۔

''یہ آپ لوگ کیا کر رہے ہیں؟'' اس نے دوبارہ پوچھا۔ ''قبر کھودنی تھی تو ہمیں بتاتے۔ ارے، یہ بچہ تو زندہ ہے۔'' ''نثار ایوب۔'' پروفیسر مجاہد ان سے مخاطب ہوئے۔ ''یہ تجربے کار گورکن ہے۔ اس نے سیکڑوں مردے دفنائے ہوں گے۔ اسے یہ انسان کا زندہ بچہ سمجھ رہا ہے۔ ذرا اسے، اس کا چہرہ تو دکھا دیں۔'' یہ کہہ کر وہ پورے اطمینان سے قبر کھودنے میں مصروف ہو گئے۔

''آجاؤ بھئی۔ زندہ بچہ دیکھ لو۔'' نثار ایوب نے خوفزدہ کرنے والے لہجے میں کہا۔

گورکن بغیر کچھ بولے دو قدم آگے بڑھ آیا اور ہلتی چادر پر نظریں جما دیں۔ نثار ایوب نے زمین پر پڑی اس غیر انسانی مخلوق کے چہرے سے بہت احتیاط سے چادر ہٹائی اور جیسے ہی چادر ہٹی، اس ''شیطان'' نے ایک غیر انسانی چیخ ماری۔ چیخ کے ساتھ جب گورکن کی اس پر نظر پڑی تو ہر وقت مردوں کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے کے باوجود وہ خود پر قابو نہ رکھ سکا۔ وہ گھبرا کر بولا۔ ''ارے جلدی کرو، اس مصیبت کو جلدی دفن کرو۔'' پھر وہ وہاں نہیں ٹھہرا۔

اس کے جانے کے بعد نثار ایوب نے پروفیسر مجاہد کے اشارے پر چادر میں اس کا چہرہ اچھی طرح لپیٹ دیا۔ وہ بیڈ کی چادر تھی جو خاصی بڑی تھی، اس نوزائیدہ ''شیطان'' کا چادر سے باہر نکل آنا ممکن نہ تھا۔ لیکن نثار ایوب محسوس کر رہے تھے کہ وہ چادر میں بری طرح ہاتھ پاؤں مار رہا تھا۔ اس کی کوشش تھی کہ کسی طرح آزاد ہو جائے۔

تب وہ نثار ایوب سے مخاطب ہو کر بولے۔ ''پیارے بھائی۔ اب میں ایک خاص عمل شروع کروں گا۔ آپ چار قدم آگے جا کر پیٹھ موڑ کر کھڑے ہو جائیں۔ آپ کسی صورت پیچھے مڑ کر نہیں دیکھیں گے، چاہے میرے چیخنے کی آواز ہی کیوں نہ آئے۔ اوّل تو ایسا کچھ نہیں ہوگا، یہ محض احتیاطاً بتایا ہے۔ میں اپنا کام کر کے خود آپ کے سامنے آؤں گا۔ پیچھے پھر بھی مڑ کر نہیں دیکھنا ہے۔ سمجھ گئے نا پیارے بھائی، میری بات؟''

''جی سمجھ گیا۔'' نثار ایوب نے پُر یقین انداز میں کہا۔

''چلیں پھر قدم بڑھائیں۔'' پروفیسر مجاہد نے ہدایت کی۔

نثار ایوب نے چار پانچ قدم آگے بڑھائے اور پھر ٹھہر گئے اور پیچھے مڑے بغیر بولے۔ ''ٹھیک ہے۔''

''ہاں جناب، ٹھیک ہے۔'' پروفیسر مجاہد نے کہا اور چادر میں لپٹے شیطان کی طرف متوجہ ہوئے۔

نثار ایوب پیٹھ موڑے کھڑے تھے۔ انہیں پروفیسر مجاہد کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ وہ کچھ پڑھ رہے تھے لیکن اتنی تیزی سے پڑھ رہے تھے کہ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا پڑھ رہے ہیں۔

اچانک ایک انتہائی تیز چیخنے کی آواز آئی۔ یہ اسی ''شیطان'' کی آواز تھی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ سخت تکلیف میں مبتلا ہو۔ پھر اس چیخ میں کئی مرد، عورتوں کی آوازیں شامل ہو گئیں۔ وہ سب چیخ چیخ کر رو رہے تھے۔ پھر یکلخت ساری آوازیں بند ہو گئیں۔

اب صرف پھاوڑا چلائے جانے کی آواز آ رہی تھی۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے پروفیسر مجاہد اُس گڑھے میں مٹی ڈال رہے ہوں۔ بلند آواز میں ان کے پڑھنے کی آواز مسلسل سنائی دے رہی تھی۔

گڑھا بھرا جا چکا تھا۔ پھاوڑے سے مٹی دبا دبا کر گڑھے کو سخت کر دیا گیا تھا۔ اب پروفیسر مجاہد اس ہموار گڑھے کی مٹی میں اپنی انگشت شہادت گھسا کر زیر لب تیزی سے پڑھ رہے تھے۔ یہ اس عمل کا آخری حصہ تھا۔

ہر کام اطمینان بخش طریقے سے ہو گیا تھا۔ غیر انسانی مخلوق زندہ دفنائی جا چکی تھی۔ مغرب کا وقت قریب تھا۔ قبرستان پر گہرا سناٹا چھایا ہوا تھا اور نثار ایوب شدت سے پروفیسر مجاہد کے سامنے آنے کے منتظر تھے۔

پروفیسر مجاہد نے ہموار قبر پر کچھ پڑھ کر تین بار پیر مارا، اپنے ہاتھ جھاڑے اور پھاوڑا اٹھا کر نثار ایوب کے مقابل آ گئے اور ان کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولے۔ ''مبارک ہو پیارے بھائی۔ وہ شیطان کا بچہ دفنایا گیا۔ بس اب سکھ ہی سکھ ہے۔''

پروفیسر مجاہد، نثار ایوب کے ساتھ قبرستان سے نکل آئے۔ راستے میں انہوں نے پھاوڑا جہاں سے اٹھایا تھا، وہیں واپس رکھا۔ گیٹ پر گورکن کو کھڑے دیکھ کر انہوں نے کچھ رقم جیب سے نکال کر اس کے حوالے کی اور اسے ہدایت کی کہ ہموار زمین پر بلاک رکھ دے اور گڑھے کو کھودنے کی ہرگز کوشش نہ کرے ورنہ اندھا ہو جائے گا۔ وہ بے چارہ پہلے ہی اس کی شکل دیکھ کر خوفزدہ ہو گیا تھا۔ اب کیا اسے پاگل کتے نے کاٹا تھا کہ وہ گڑھا کھود کر دوبارہ اس ''شیطان'' کی شکل دیکھتا۔

قبرستان سے باہر آ کر وہ رکشے کا انتظار کرنے لگے۔ ''پیارے بھائی۔ میں اب گھر جاؤں گا۔ آپ نے جو کچھ قبرستان میں دیکھا سنا، وہ سب امانت ہے ہماری۔ یہ راز، راز ہی رہے۔''

''یہاں کا حال تو راز رہے گا لیکن گھر کے لوگوں خصوصاً علی نثار کو کچھ تو بتانا ہوگا۔'' نثار ایوب نے پوچھا۔

''ہاں۔ بس اتنا کہ اس مردود کو زندہ دفن کر دیا ہے۔ اب آئندہ فکر کی کوئی بات نہیں۔'' پروفیسر مجاہد نے کہا۔ اس اثنا میں ایک رکشا آ کر ان کے نزدیک رکا۔ وہ بولے۔ ''میرے ساتھ آ جائیں، میں آپ کو اسپتال چھوڑ کر گھر نکل جاؤں گا۔ وہاں سب پریشان ہوں گے۔''

اور پھر جیسا کہ پروفیسر مجاہد نے کہا تھا کہ بس اب سکھ ہی سکھ ہے، تو ایسا ہی ہوا۔ اگلے سال علی نثار کے ہاں صائمہ نے جنم لیا اور اس کے دو سال بعد عابر نے دنیا میں آنکھ کھولی۔ عابر کی آمد سے پہلے ہی نثار ایوب اللہ کو پیارے ہو گئے۔ وہ اپنے پوتے کی شکل نہ دیکھ سکے۔ وہ بس بیٹھے بٹھائے چلے گئے تھے۔ رات کا کھانا کھا کر اپنے بیڈ پر آ کر بیٹھے۔ اپنی بیگم سے پانی مانگا۔ فریدہ پانی لے کر کمرے میں آئیں، اتنی دیر میں وہ نقل مکانی کر چکے تھے۔

اب ان کا پوتا عابر تین دن سے انہیں خواب میں دیکھ رہا تھا اور ان کی گود میں اپنے اس بھائی کو دیکھ رہا تھا جو انسان نہ تھا، غیر انسانی مخلوق تھا۔

علی نثار نے ہر وہ بات عابر کو بتا دی تھی جو ان کے علم میں تھی۔ نازنین ان واقعات کو دہرانا تو دور کی بات، سوچتے ہوئے بھی گھبراتی تھیں لیکن انہوں نے ہمت کر کے صائمہ کی موجودگی میں ان دل دہلا دینے والے واقعات کو دہرا دیا تھا۔

سارے واقعات سن کر عابر نے تو کوئی خاص ردِّ عمل ظاہر نہیں کیا تھا لیکن صائمہ ماں سے لپٹ گئی تھی۔ ''ہائے امی۔ وہ بچہ کون تھا؟''

''مجھے کیا پتا؟'' نازنین اس بچے کا تصور کر کے ہی تھرّا اٹھیں۔

''امی۔ کیا آپ نے اس کی شکل دیکھی تھی؟'' صائمہ نے پوچھا۔

''نہیں میں نے نہیں دیکھی۔ میں اس وقت بے ہوش تھی۔'' نازنین نے بتایا۔ ''اچھا ہی ہوا جو میں نے اس منحوس کی شکل نہیں دیکھی۔ ہاں تمہاری دادی نے اسے ضرور دیکھا تھا اور

PDF BY Manzoor

انہوں نے ہی اسے تمہارے دادا کے حوالے کیا تھا۔ بعد میں تمہاری دادی نے اس کی شکل وصورت کے بارے میں مجھے بتایا تھا۔''

''امی۔ کیسا تھا وہ؟'' اس مرتبہ عابر نے سوال کیا۔

''اب چھوڑ دو بیٹا۔ اپنے ابو سے پوچھ لینا۔ انہوں نے بھی اس منحوس کو دیکھا تھا۔'' نازنین نے اس کی شکل وصورت کو بیان کرنے سے احتراز کیا۔ اور اس سے قبل کہ بچے کوئی مزید سوال کر کے ان کو پریشان کرتے، وہ کمرے سے اُٹھ کر چلی گئیں۔

علی نثار، عابر کو مسلسل تین روز تک دکھائی دینے والے خواب سے پریشان تھے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ عابر کو یہ خواب کیوں نظر آیا جبکہ وہ ان واقعات سے لاعلم تھا۔ اس نے اپنے دادا کو بھی نہ دیکھا تھا۔

یہ خواب تین دن تک ایک خاص وقت اور ایک خاص انداز میں نظر آیا تھا۔ علی نثار سوچتے رہے کہ اس مسئلے پر کس سے بات کی جائے؟

سوچتے سوچتے اچانک ان کا دھیان پروفیسر مجاہد کی طرف گیا۔ وہی اس مسئلے پر صحیح روشنی ڈال سکتے تھے۔ ایک طویل عرصے سے ان کی پروفیسر مجاہد سے ملاقات نہ ہوئی تھی۔ والد کے انتقال کے بعد بس ایک آدھ بار ہی وہ گھر پر آئے تھے۔ علی نثار البتہ عید، بقرعید انہیں سلام کرنے چلے جاتے تھے۔ پھر وہ ریٹائرمنٹ کے بعد حیدرآباد اپنے بڑے بیٹے کے پاس شفٹ ہو گئے۔ حیدرآباد منتقل ہونے کے بعد علی نثار کا ان سے رابطہ نہ رہا۔

ایک شام وہ پروفیسر مجاہد کے پرانے گھر چلے گئے۔ انہیں معلوم تھا کہ وہاں پروفیسر کے چھوٹے بیٹے رہائش پذیر ہیں۔ ان سے ان کا حیدرآباد کا پتا حاصل کر کے وہ عابر کو اپنے ہمراہ لے کر ان سے مل آئیں گے۔

جب علی نثار، پروفیسر مجاہد کے چھوٹے بیٹے کے گھر پہنچے اور انہوں نے اپنے آنے کا مقصد بیان کیا تو بیٹے نے افسردگی کے ساتھ بتایا۔ ''ابا کا تو انتقال ہو گیا۔''

''ہیں۔ کب؟'' علی نثار کو یہ سن کر جھٹکا سا لگا۔

''آج آٹھ دن ہو گئے۔ جمعرات کی شام ان کا انتقال ہوا تھا۔''

اور یہ وہ دن تھا جس کی صبح عابر کو پہلی بار وہ خواب نظر آیا تھا۔ کیا پروفیسر مجاہد کی موت سے اس خواب کا کوئی تعلق تھا۔ یہ بات تو بعد کی تھی کہ اس خواب کا تعلق ان کی موت سے تھا یا نہیں۔ اصل مسئلہ یہ تھا کہ عابر کو یہ خواب نظر آیا کیوں؟

اس معنے پر اگر کوئی روشنی ڈال سکتا تھا تو وہ پروفیسر مجاہد ہی تھے۔ وہی نہ رہے تھے تو اب کس سے اس مسئلے پر بات کی جاتی؟

بس پھر یہ بات آئی گئی ہو گئی۔ عابر دو چار دن تو اس خواب سے متاثر رہا۔ جب تین دن کے بعد خوابوں کا یہ سلسلہ بند ہو گیا تو وہ بھی بھولتا گیا۔

ملکہ کو وہ البتہ بھول نہ پایا تھا۔ وہ یوں سلیقے سے اسے یاد آتی جیسے بارش ہو وقفے وقفے سے۔ لیکن جب اس کی بے وفائی کسی سنسناتی گولی کی طرح اس کے آر پار ہوتی تو پھر اسے کچھ یاد نہ رہتا۔

صائمہ نے ان دنوں عابر کا خاص خیال رکھا تھا۔ اس نے اپنے یا والدین کے حوالے سے کبھی کوئی بات نہیں کی تھی۔ وہ اسے مطعون کر کے اس کا باطن چھلنی نہیں کرنا چاہتی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ اس عمر میں ایسا ہو جاتا ہے۔ خوبصورت لڑکی کسی خوشبو کی طرح ہوتی ہے۔ آپ چاہیں یا نہ چاہیں، وہ آپ کے اندر اتر جاتی ہے۔

صائمہ چاہتی تھی کہ اس کا بھائی ملکہ کو بھلا دے۔ وہ اس کے اندر سے نکل جائے۔ اس لئے وہ جان بوجھ کر اس کا ذکر چھیڑتی رہتی تھی۔ کرید کرید کر اس کے بارے میں پوچھتی تھی۔ یادوں کے پھوڑے پر نشتر زنی کرتی کہ یادوں کا زہر اس کے اندر سے نکل جائے اور وہ ذہنی اور روحانی طور پر صحت مند ہو جائے۔

صائمہ باپ کے گھر آتی تو وہ زیادہ تر وقت عابر کے ساتھ گزارتی اور اپنے گھر ہوتی تو اسے بلا لیتی۔ صائمہ کے بچوں سے اسے عشق تھا اور صائمہ کے شوہر اسلم کو اس سے لگاؤ تھا۔

ایک دن صائمہ، عابر کو لے کر بڑے ڈپارٹمنٹل اسٹور گئی۔ اسے اپنے گھر کا سودا لینا تھا۔ نازنین نے بھی اسے ایک فہرست تھما دی تھی۔ عابر اس طرح کی شاپنگ سے گھبراتا تھا۔ لیکن صائمہ کے اصرار پر وہ اس کے ساتھ چلا گیا۔

اسٹور پر خاصا رش تھا۔ اچانک وہ ایک ٹرالی سے ٹکرایا۔ جھٹکا لگنے سے ٹرالی سے کچھ پیکٹ نیچے گرے۔

''سوری۔'' کہہ کر عابر نے پیکٹ فرش سے اٹھا کر ٹرالی میں رکھے اور جب اس نے ٹرالی والی پر نظر کی تو اسے بڑی پُرشوق نگاہوں سے اپنی طرف دیکھتے پایا۔

ان نگاہوں میں جانے کیا بات تھی کہ عابر نے خود کو اچانک گہرے بادلوں میں گھرا پایا۔ اس نے محسوس کیا جیسے اس کا وجود عدم ہو گیا ہو۔ یہ احساس بس چند لمحوں کا تھا۔ پھر سب کچھ ٹھیک ہو گیا۔

وہ دلکش لڑکی اسے دیکھ کر مسکرائی اور آگے بڑھ گئی۔

عابر نے اسے مڑ کر دیکھا۔ وہ جینز پہنے ہوئے تھی۔ جینز کے اوپر ہاف سلیوز کی سرخ شرٹ تھی۔ شرٹ جینز کے اندر نہ تھی، اوپر تھی اور لمبی تھی۔ موہنی صورت تھی لیکن اس کے چہرے پر سب سے پُرکشش اس کی آنکھیں تھیں۔ بڑی پتلیوں والی آنکھوں کا رنگ گہرا کالا تھا۔ یہ غیر معمولی آنکھیں تھیں جو بہت تیزی سے بندے کو اپنی گرفت میں لے لیتی تھیں۔

اتنے میں صائمہ اس کے قریب آ گئی۔ پھر وہ دونوں شاپنگ میں مصروف ہو گئے۔ وہ لڑکی اسٹور میں دو تین مرتبہ اسے دکھائی دی۔ وہ اسے دیکھ کر ہر بار ہلکا سا مسکرائی اور رش میں گم ہو گئی۔

صائمہ کی خریداری تقریباً ختم ہو چکی تھی۔ بس اسے بچوں کے لئے سکٹ اور ٹافیاں لینا تھیں اور عابر کو اپنے لئے شرٹ خریدنا تھی۔ صائمہ نے اس سے کہا کہ وہ گارمنٹس کی شاپ پر شرٹس نکلوائے، وہ سکٹ اور ٹافیاں لے کر وہاں آ رہی ہے۔

گارمنٹس کی دکان پر ابھی اس نے شرٹس نکلوا کر دیکھنا شروع کی تھیں کہ اسے اپنے پاس ایک مسحور کن دھیمی خوشبو کا احساس ہوا۔ بے اختیار اس نے اپنے بائیں جانب دیکھا تو اسے اپنے برابر کھڑے پایا۔ جانے کب وہ چپکے سے اس کے برابر آ کر کھڑی ہو گئی تھی۔

عابر تھوڑا سا پیچھے ہٹا تا کہ وہ نگاہ کے زاویے میں آ سکے۔ وہ بھی تھوڑا سا پیچھے ہٹی۔ اس نے کندھے پر پڑے بیگ کی چھوٹی زپ کھولی۔ اس میں سے ایک کارڈ نکالا، زپ بند

کی، بیگ کو کندھے پر درست کیا اور وزیٹنگ کارڈ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولی۔ ''یہ میرا کارڈ ہے۔ اگر آپ کا جی چاہے تو مجھ سے ملنے آجایئے گا۔''

''آپ کون ہیں؟'' عابر نے اس کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔

''میں ایک معمولی سی آرٹسٹ ہوں۔ چاہتی ہوں آپ کو پینٹ کروں۔'' لڑکی کارڈ اس کے ہاتھ میں دیتے ہوئے بولی۔

عابر نے کارڈ پر نظر ڈالی۔ کارڈ پر آرزو اور اس کے نیچے آرٹسٹ لکھا تھا۔ ڈیفنس کے کسی اپارٹمنٹ کا پتا درج تھا۔ یہ اپارٹمنٹ ہاکی اسٹیڈیم کے آس پاس تھا اور آخر میں موبائل نمبر تھا۔

''اچھا میں چلتی ہوں۔ دیکھئے میری درخواست کو رد مت کیجئے گا۔ آیئے گا ضرور، مجھے آپ کا انتظار رہے گا۔'' آرزو نے مسکراتے ہوئے عجب لہجے میں کہا۔

اس نے جانے یہ بات کس انداز میں کہی کہ اس کے ذہن پر نقش ہوتی چلی گئی۔ ابھی وہ اس کی بات کا کچھ جواب دینے کا سوچ رہا تھا کہ وہ جا چکی تھی۔ اس نے عابر کا جواب سننے کی بھی زحمت گوارا نہ کی تھی۔

عابر نے جاتی ہوئی آرزو کو اپنی نظروں کے حصار میں لینا چاہا لیکن وہ دائیں جانب مڑ کر نظروں سے اوجھل ہو چکی تھی۔ عابر نے ایک گہرا سانس لے کر کارڈ کو دیکھا اور پھر اسے بڑی احتیاط سے جیب میں رکھ لیا۔

چند لمحوں بعد ہی صائمہ وہاں پہنچ گئی۔ عابر نے شکر ادا کیا کہ صائمہ نے اس اچانک ''واردات'' کو اپنی آنکھوں سے نہ دیکھا تھا۔ اس نے جلدی سے صائمہ کو شرٹوں کی جانب متوجہ کر دیا اور آرزو کے بارے میں سوچنے لگا کہ یہ کیسی گھٹا تھی جو بن برسے ہی اسے شرابور کر گئی تھی۔

☆.....☆.....☆

پنجہ مارنا تو کوئی مشکل کام نہ تھا۔ بعض وقت انارہ کو مائی پنکھی پر شدید غصہ آتا۔ وہ انتقام کی آگ میں جلنے لگتی اور اس کا جی چاہتا کہ وہ پنجہ مار کر مائی پنکھی کی دونوں آنکھیں باہر نکال دے۔ اور وہ ایسا کرنے کی قدرت رکھتی تھی لیکن مسئلہ یہ تھا کہ پھر اس کے بعد کیا ہوگا۔ مائی پنکھی اسے اپنی قید سے آزاد تو نہیں کر دے گی۔ ابھی تو اتنا تھا کہ جب اس کا جی بہت گھٹنے لگتا تو وہ اسے لڑکی کے روپ میں لے آتی تھی۔ اس طرح اسے کچھ سکون مل جاتا تھا۔ پنجہ مارنے کی صورت میں ممکن تھا کہ وہ ہمیشہ کے لئے اسے بلی کا روپ دھارنے پر مجبور کر دیتی۔ پھر کیا ہوتا۔ وہ یونہی گھٹ کر مر جاتی۔

آسان اور سہل طریقہ یہی تھا کہ وہ کسی انتقامی کارروائی کے بارے میں نہ سوچے بلکہ اس کی خوشامد کر کے جلدی جلدی اپنے بارے میں سب کچھ جان لے اور اگر اس دوران کوئی ایسا راز ہاتھ لگ جائے کہ وہ بڑھیا کو مار کر اپنے اصل روپ میں آسکے تو پھر وہ یہاں سے نکل بھاگے۔ اس نے فیصلہ کیا کہ آئندہ کوئی ایسا اقدام نہ کرے گی جس سے وہ مشکل میں پھنس جائے۔

صبح وہ اس کی آواز سن کر باہر نکلی۔ اس نے باورچی خانے میں جھانکا۔ مائی پنکھی چولہے کے آگے بیٹھی تھی۔ مٹی کی ہنڈیا میں سیال ابلنے کو تھا۔

''انجو۔ جلدی کر۔'' مائی پنکھی نے کالے منہ کی سفید بلی کو دیکھتے ہی کہا۔

انجو تیزی سے باورچی خانے سے نکلی۔ اس نے چارپائی پر چھلانگ لگائی۔ وہاں سے باورچی خانے کی چھت پر چڑھی۔ اسے دیکھتے ہی چھت پر بیٹھے کوؤں میں کھلبلی مچ گئی۔ وہ چیختے ہوئے جھکائی دے کر فضا میں اُڑ گئے۔

انجو نے باورچی خانے کی چھت سے قبرستان والی دیوار کی منڈیر پر زقند بھری لیکن وہ منڈیر پر بیٹھے دو تین کوؤں میں سے کسی کو اپنی گرفت میں نہ لے سکی۔

تب انجو نے نیم کے درخت پر چھلانگ لگائی۔ یہاں کوئی کوا نہ تھا۔

وہ نیم کے پتوں میں چھپ کر بیٹھ گئی اور اس نے نظریں منڈیر پر جما دیں۔

میدان خالی دیکھ کر کوّے اِدھر اُدھر سے منڈیر پر اترنے لگے۔ انجو نے ایک کوّے کو اپنی نظروں کی گرفت میں لیا اور اس پر بجلی کی طرح گری۔ اب کوّے کا اس کی گرفت سے نکلنا محال تھا۔ وہ اس کے منہ میں دبا پھڑ پھڑا کر رہ گیا۔

انجو نے منڈیر سے براہ راست چارپائی پر چھلانگ لگائی اور کوّے کو منہ میں دبوچے مائی پنکھی کے سامنے آکر کھڑی ہوگئی۔ مائی پنکھی نے بڑے ماہرانہ انداز سے پھڑ پھڑاتے کوّے کو اپنے ہاتھ کی گرفت میں لیا اور اسے ہنڈیا میں جھونک کر ڈھکن ڈھک دیا اور اس پر وزنی اینٹ رکھ دی۔

عام طور سے انجو اپنا کام سرانجام دینے کے بعد باورچی خانے سے چلی جاتی تھی۔ وہ صحن میں چارپائی کے پائے کے ساتھ لگ کر لیٹ جاتی یا پھر کمرے میں گھس جاتی تھی۔ آج وہ پیڑھی کے پاس کھڑی ہو کر اس کی طرف منہ اٹھا کر دیکھنے لگی۔

مائی پنکھی نے چولہے کی آنچ تیز کرتے ہوئے اپنا چہرہ گھما کر اس کی آنکھوں میں دیکھا اور پھر بڑے پیار سے بولی۔ ''کیا ہوا میری انجو؟''

انجو جواب میں اس کی سوکھی ٹانگوں سے اپنا جسم رگڑنے لگی۔ مائی پنکھی نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی۔ ''کیا چاہتی ہے؟''

''اماں۔ میں اپنا تیسرا گھر دیکھنا چاہتی ہوں۔'' مائی پنکھی کے دماغ میں آواز آئی۔

''کوئی بات نہیں۔ دکھا دوں گی۔'' مائی پنکھی بغیر لب ہلائے بولی۔

''کب؟'' آواز آئی۔

''آج رات کو۔'' مائی پنکھی نے جواب دیا۔

''کیا یہ کام دوپہر میں نہیں ہو سکتا؟'' اس کی آواز آئی۔

''نہیں۔ ہم لوگوں کے لئے رات بنائی گئی ہے۔ ہماری قوتیں تاریکی میں بیدار ہوتی ہیں۔ سورج چھپتے ہی ہم آزاد ہو جاتے ہیں۔ تُو دن کو رات میں تبدیل ہونے تک انتظار کر لے۔ پھر میں وہ دکھا دوں گی جس کی تو خواہشمند ہے۔ ٹھیک انجو۔'' مائی پنکھی اس کی پیٹھ تھپتھپاتے ہوئے بولی۔

''ٹھیک اماں۔'' انجو نے میاؤں کی آواز نکالی اور باورچی خانے سے نکل گئی۔ وہ خوش تھی کہ آج کی رات اسے اپنا ایک نیا روپ دیکھنے کو ملے گا۔

رات کے چہرے پر نکھار آچکا تھا۔ وہ ایک نئے روپ میں ڈھل رہی تھی۔ قبرستان سے لوگوں کے بولنے اور کتوں کے بھونکنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ انسان سو چکے تھے اور شیطانوں کی آنکھیں کھل رہی تھیں۔

رات اپنے جوبن پر تھی۔ باہر گہری تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ مائی پنکھی کے صحن میں بھی گھپ اندھیرا تھا۔ مائی پنکھی نے صحن میں لگا مرکیل بلب بجھوا دیا تھا اور وہ خود پھسکڑا مار کر ساتویں گھر میں بیٹھ چکی تھی۔

''چل انجو۔ بیٹھ جا تیسرے گھر میں۔'' مائی پنکھی نے آواز لگائی۔

انارہ جو چارپائی پر بے چینی سے اس آواز کی منتظر تھی، فوراً اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس نے تیسرے گھر میں مائی پنکھی کے انداز میں نشست جمالی اور اس کی طرف دیکھنے لگی۔ سیاہ چہرے، سیاہ کپڑوں اور سیاہ رات میں اسے نظروں سے ڈھونڈ نکالنا آسان نہ تھا۔

مائی پنکھی نے چاندی کا تعویذ گلے سے اتار کر مٹھی میں لیا اور بولی۔ ''دیکھ تیرے سامنے کیا ہے؟''

انارہ نے آنکھیں کھول کر سامنے دیکھا۔ اسے مائی پنکھی کے دھندلے ہیولے کے سوا کچھ دکھائی نہ دیا۔

''اماں۔ کچھ نظر نہیں آ رہا، بس تو نظر آ رہی ہے، وہ بھی دھندلی سی۔'' انارہ نے بتایا۔

''انجو۔ کیا تو نے آنکھیں کھولی ہوئی ہیں؟''

''ہاں اماں۔'' انارہ بولی۔

''انجو۔ آنکھیں بند کر۔'' مائی پنکھی نے حکم دیا۔ ''کر لیں؟''

''ہاں اماں۔'' وہ بولی۔

''اب دیکھ تیرے سامنے کیا ہے؟'' مائی پنکھی نے پوچھا۔

''اماں۔ میرے سامنے ایک فلاحی ادارے کا سائن بورڈ ہے۔'' انارہ جلدی سے بولی۔

''چل اندر چل۔ ٹھیک ہے چلتی جا۔ اب دائیں طرف مڑ جا۔ سامنے جو دروازہ کھلا ہے، اس میں داخل ہو جا۔ یہ جو سامنے ایک بڈھی مائی بیٹھی ہے، اس کے پاس ایک نوزائیدہ بچی لیٹی ہے۔ نظر آئی؟'' مائی پنکھی کی آواز آئی۔

''ہاں اماں۔ نظر آئی۔ پیاری بچی ہے۔ اماں کیا یہ میں ہوں؟'' انارہ نے سوال کیا۔

''نہیں، یہ تو نہیں ہے۔'' مائی پنکھی اتنا کہہ کر چپ ہو گئی۔

''دیکھ اماں۔ خواہ مخواہ تجسس نہ پیدا کر۔ جلدی بتا۔'' انارہ بے چین ہوئی۔

''یہ تو نہیں، تیری بچی ہے۔'' مائی پنکھی نے انکشاف کیا۔

''اماں۔ پھر میں کہاں ہوں؟'' انارہ بولی۔

''یہ میں تجھے ابھی نہیں بتاؤں گی۔ البتہ یہ بتائے دیتی ہوں کہ تیرا شوہر جیل میں ہے۔'' مائی پنکھی نے کہا۔

''اماں۔ میرا شوہر جیل میں کیوں ہے۔ اس نے کیا جرم کیا ہے؟'' انارہ نے پوچھا۔

''وہ قاتل ہے۔'' مائی پنکھی نے بتایا۔

''کس کو قتل کیا ہے اس نے؟''

''یہ بھی ابھی نہیں بتاؤں گی۔'' مائی پنکھی ہنس کر بولی۔

''پھر کچھ بتائے گی بھی یا مجھے ایسے ہی ٹہلاتی رہے گی؟''

''اچھا چل۔ میں وقت کی دھارا کو پلٹتی ہوں۔ اب تو دیکھتی جا اور سمجھتی جا۔''

''ٹھیک ہے اماں۔'' انارہ مطمئن لہجے میں بولی۔

ایک متوسط طبقے کا درمیانہ گھر اس کے سامنے تھا۔ گھر میں چہل پہل تھی۔ شادی کی تیاریاں زور و شور سے جاری تھیں۔ گھر میں جہیز کا سامان بھرا ہوا تھا۔ دوسرے شہر سے آئے ہوئے مہمان بھی موجود تھے۔ جوڑوں کی پیکنگ جاری تھی۔

لڑکیاں ڈھولک لئے گا بجا رہی تھیں۔ ان لڑکیوں کے درمیان دلہن بھی موجود تھی۔ زرد کپڑوں میں بیٹھی دلہن کے چہرے پر ان کپڑوں کا عکس پڑ رہا تھا لیکن ہلدی چہرے پر ایک طمانیت کا احساس تھا۔ پیا گھر جانے کی خوشی تھی۔ وہ سر جھکائے بیٹھی تھی۔

زوہا کو اس کی سہیلیوں اور پڑوس کی لڑکیوں نے گھیرا ہوا تھا۔ زوہا کی آواز بہت اچھی تھی۔ اسے ڈھولک بجانا بھی خوب آتا تھا۔ وہ شادی بیاہ کی جان سمجھی جاتی تھی۔ شادی کسی کی ہوتی، کہیں ہوتی۔ رشتے داروں میں پڑوس میں یا سہیلیوں میں۔ جب تک زوہا نہ آ جاتی، گانوں میں جان ہی نہ پڑتی۔

اب خود اس کی شادی تھی۔ روزانہ گانوں کی محفل سج رہی تھی۔ روز ہی اس سے گانے کی فرمائش ہو رہی تھی لیکن زوہا گانا تو کجا، ڈھولک بجانے کو راضی نہ تھی۔

''میں نے بہت گا بجا لیا۔ جانے کتنی شادیاں نمٹا دیں، اب تم لوگ گاؤ۔'' زوہا نے فیصلہ کن انداز میں کہا تھا۔

آج گانے کی آخری محفل تھی۔ آدھی رات سے زیادہ گزر چکی تھی۔ کل زوہا کی رخصتی تھی۔ جب یہ تقریب اختتام کو پہنچنے لگی تو زوہا کی ایک بہت قریبی شادی شدہ سہیلی نے ڈھولک اس کے سامنے رکھی اور بولی۔ ''دیکھ زوہا۔ ہم نے جو گانا بجانا تھا، وہ گا بجا لیا، اب تجھے آخری گیت سنانا ہوگا۔ اگر تو نہیں گائے گی تو ہم صبح تک یہیں بیٹھے رہیں گے۔''

زوہا نے اپنی نظریں اٹھا کر اپنی پیاری سہیلی نادیہ کو دیکھا۔ نادیہ نے اپنے ہونٹ سکوڑ کر ''پیچ'' کیا اور ہاتھ جوڑ کر درخواست کی۔

تب زوہا کو اپنا فیصلہ بدلنا پڑا۔ اس نے ڈھولک کھینچ کر اپنی ٹانگ کے نیچے دبائی اور ایک بہت پرانا گیت شروع کیا۔ ''چھوڑ بابل کا گھر، موہے پی کے نگر، آج جانا پڑا۔''

جب یہ گیت ختم ہوا تو ہر لڑکی کی آنکھوں میں آنسو تھے جبکہ زوہا کی آنکھوں میں ایک آنسو نہ تھا۔

پھر جانے کیا ہوا کہ گانا ختم کرنے کے بعد زوہا ایک جھٹکے سے اٹھی اور اپنے کمرے میں جا کر بیڈ پر گری اور سسک سسک کر رونے لگی اور بہت دیر تک روتی رہی۔

زوہا کی قسمت میں شاید رونا لکھا جا چکا تھا۔ یہ زوہا کا دوسرا نکاح تھا۔ ایک نکاح اس سے پہلے ٹوٹ چکا تھا۔ لڑکے والے دولت مند لوگ تھے۔ انہیں اپنے اسٹیٹس کا بڑا خیال تھا۔ رشتہ کرتے وقت تو خوب آگے پیچھے گھومے۔ پھر جیسے ہی نکاح ہوا تو ان لوگوں نے کینچلی تبدیل کر لی۔ نت نئی فرمائشیں شروع کر دیں۔ شادی ہال کسی پوش علاقے میں بک

کروائیں۔ اعلیٰ افسران شرکت کریں گے۔ جہیز اچھا ہو، رشتے دار دیکھیں گے۔ زوہا کے والد ملازم پیشہ سیدھے سادے انسان تھے۔ وہ یہ سب کہاں سے کرتے۔ انہوں نے معذرت کر لی تو لڑکے نے طلاق دینے میں ذرا بھی دیر نہ لگائی۔

زوہا کے والد ذاکر حسین کو احساس ہوا کہ شادی ہمیشہ اپنے برابر والوں میں کرنی چاہئے۔ ویسے وہ اس رشتے پر راضی نہ تھے لیکن لڑکے والوں کے اصرار کی وجہ سے انہیں ہاں کہنا پڑی تھی اور جس بات کا ڈر تھا، وہ ہو کر رہی۔

اب جہاں رشتہ ہو رہا تھا، وہ ان جیسا ہی گھرانہ تھا۔ لڑکا بینک میں ملازم تھا۔ اسمارٹ تھا۔ زوہا کے والدین کو یہ گھرانہ پسند آیا اور رشتہ طے ہو گیا۔ زوہا، ذاکر کی اکلوتی بیٹی تھی۔ انہوں نے قرض لے کر اپنی بساط سے زیادہ جہیز اکٹھا کر دیا۔

لڑکے والے کہتے رہے ''ہمیں کچھ نہیں چاہئے۔ بس لڑکی چاہئے۔'' لیکن جہیز لینے سے انکار نہ کیا۔

اگرچہ زوہا، ذاکر کی سگی بیٹی نہ تھی لیکن انہوں نے اسے کبھی احساس نہ ہونے دیا کہ وہ سگی بیٹی نہیں ہے۔ اور یہ بات اس سے چھپائی بھی نہیں کہ اسے انہوں نے ایک فلاحی ادارے سے حاصل کیا تھا۔ اس کے والدین کا اتا پتا نہ تھا کیونکہ وہ انگوٹھا چوستی جھولے میں ڈالی گئی تھی۔ والدین نے اس کے ساتھ کوئی نشانی نہ چھوڑی تھی۔

زوہا بڑی صابر، سیدھی اور شریف لڑکی تھی۔ اس نے اپنے والدین کے سامنے کبھی کوئی مسئلہ نہیں کھڑا کیا تھا۔ وہ گریجویٹ تھی۔ بھرپور کالج لائف گزاری تھی لیکن کبھی کسی لڑکے کو اپنے پیچھے نہیں لگنے دیا تھا۔ گھر میں جو کھانے کو مل جاتا کھا لیتی، جو پہننے کو دے دیا جاتا، اسے ہنسی خوشی قبول کر لیتی۔ فرمائش کرنا اس نے سیکھا ہی نہ تھا۔ شاید اس کے لاشعور میں یہ بات تھی کہ یہ اُس کے اصل والدین نہیں ہیں۔ اگر یہ اُسے وہاں سے نہ لاتے تو پتا نہیں وہ اسی ادارے میں یا جانے کہاں رُل رہی ہوتی۔ ان لوگوں نے اسے محبت دی، عزت دی، تعلیم دی۔ ہر طرح سے اس کا خیال رکھا، بالکل سگی بیٹیوں کی طرح پرورش کی۔ اور آج اسے ایک اچھے لڑکے اور اچھے جہیز کے ساتھ رخصت کیا جا رہا تھا۔

کوئی باپ اپنی بیٹی کے مقدر سے واقف نہیں ہوتا۔ اگر اسے یہ معلوم ہو جائے کہ شادی کے بعد اس کی بیٹی پر کیا پہاڑ ٹوٹنے والے ہیں تو وہ ہرگز اس کی شادی نہ کرے۔

زوہا کو توقع نہ تھی کہ اس کا شوہر عاشر ایسا نکلے گا۔ وہ دیکھنے میں جتنا معصوم اور شریف نظر آ رہا تھا، اندر سے اتنا ہی ٹیڑھا تھا۔

گھونگھٹ اٹھاتے ہی عاشر نے جو تحفہ دیا، وہ ''لفظوں'' کا تھا۔ فرمایا۔ ''لڑکوں کو لائن مارنے والی لڑکیاں مجھے ہرگز پسند نہیں۔ اگر تم نے کبھی ایسی حرکت کی تو قتل ہو جاؤ گی میرے ہاتھوں۔''

ایک پڑھے لکھے، بینک ملازم اور چہرے سے معصوم نظر آنے والے شوہر کی پہلی بات سن کر زوہا سناٹے میں آ گئی۔ یہ کیا بات کی انہوں نے۔ وہ عاشر کی شکل دیکھتی رہ گئی۔ دولہا کے منہ سے نکلنے والا پہلا جملہ اس قدر بے ہودہ اور لچر۔ کہتے ہیں کہ چہرے شخصیت کے عکاس ہوتے ہیں لیکن یہاں تو چہرے پر ماسک چڑھا تھا جسے ایک جملے نے ہی اتار دیا۔

زوہا کو اندازہ لگانے میں دیر نہ لگی کہ اس کی زندگی آئندہ کس انداز میں گزرے گی۔ ساتھ ہی اس نے یہ بھی طے کر لیا تھا کہ جیسی گزرے گی، وہ گزارے گی، کبھی اپنے والدین پر اپنی زندگی کا حال نہ کھولے گی۔

PDF BY Manzoor

عاشر انتہائی شکی شخص تھا۔ عورت غصہ ور شوہر کو برداشت کر لیتی ہے، منحوس مرد کو سہہ لیتی ہے، تھپڑ مارنے والے خاوند کو درگزر کر جاتی ہے لیکن نہیں برداشت ہوتا تو شکی شوہر۔ شکی

بیوی بھی مرد کے لئے عذاب بنتی ہے لیکن شوہر کے پاس چوائس ہوتی ہے۔ ایسی بیوی سے چھٹکارا حاصل کرنا زیادہ مشکل نہیں ہوتا جبکہ عورت کے پاس کوئی چوائس نہیں ہوتی۔

شک ایک ایسا زہر ہے جو ازدواجی زندگی کو تہس نہس کر دیتا ہے۔ شکی مرد اس بات سے ناواقف ہوتے ہیں کہ عورت میں فریب دینے کی صلاحیت مرد سے زیادہ ہوتی ہے۔ آپ عورت کو سات تالوں میں بند کر دیں اور اگر اسے خراب ہونا ہے تو پھر دنیا کی کوئی طاقت اسے خراب ہونے سے نہیں روک سکتی۔ شکی شوہر کے ذہن میں اگر عورت کی فطرت کا یہ پہلو واضح ہو جائے تو پھر ہر جھگڑا مٹ جاتا ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ عورت کو آزاد چھوڑ دیا جائے۔ شوہر نگرانی رکھے، لیکن شک نہ کرے، اس وقت تک جب تک اس کے ہاتھ ٹھوس ثبوت نہ آ جائے۔

زوہا برقع نہیں پہنتی تھی۔ سسرال والوں کی طرف سے فرمائش آئی کہ بیٹی کو جہیز میں برقع دیں۔ ذاکر نے زوہا سے بات کی۔ زوہا نے خوشدلی سے کہا۔ ''کوئی بات نہیں ابو، میں برقع پہن لوں گی۔''

زوہا نے سسرال آ کر برقع پہننا شروع کر دیا۔ لیکن عاشر کو کسی طرح چین نہ تھا۔ عاشر کی ماں بہنیں پردہ نہیں کرتی تھیں۔ بس باہر نکلتے ہوئے چادر لے لیا کرتی تھیں جبکہ عاشر کے حکم پر زوہا کو برقع اوڑھنا پڑا۔ گھر میں خاندان کے لڑکوں کا آنا جانا تھا۔ عاشر کی بہنیں پڑوس میں بلا روک ٹوک جایا کرتی تھیں۔ زوہا کو پڑوس میں جانے کی اجازت نہ تھی۔ زوہا کو پاس پڑوس سے کوئی دلچسپی بھی نہ تھی۔ پڑوس سے کوئی لڑکی آ جاتی تو وہ اس سے اچھی طرح بات کر لیتی ورنہ اسے آئے گئے کی کوئی فکر نہ ہوتی۔

عاشر کا دو منزلہ مکان تھا۔ زوہا کی اوپر رہائش تھی۔ دو کمرے تھے۔ ایک میں زوہا، دوسرے میں اس کی جٹھانی رہائش پذیر تھی۔ کھانا مشترک تھا۔ بھرا پرا گھر تھا۔ دو بھائیوں کی بیویاں نیچے ساس سسر کے ساتھ رہتی تھیں۔ ایک دیور جو ابھی غیر شادی شدہ تھا، ساتھ رہتا تھا۔

زوہا شوہر کا مزاج سمجھتے ہوئے اپنے دیور یا جیٹھوں سے بات کرتے ہوئے خاصی محتاط رہتی تھی جبکہ بھائیوں کی بیویاں اور بھائی آزادانہ گفتگو کرتے تھے۔ یہ گفتگو کبھی بے تکلفانہ بھی ہو جاتی تھی لیکن ایسی گفتگو میں زوہا کبھی حصہ نہ لیتی تھی۔

ان تمام احتیاطوں کے باوجود عاشر صاحب کے دماغ نہ ملتے تھے۔ وہ کسی بھی وقت چراغ پا ہو جاتے اور زوہا سے سوال کرتے۔ ''صادق تمہیں گھور کر کیوں دیکھ رہا تھا؟''

صادق، عاشر کے چھوٹے بھائی کا نام تھا۔ سوال یہ تھا کہ اگر کوئی گھور کر دیکھ رہا ہے تو اس سے پوچھا جاتا۔ پوچھا زوہا سے جاتا تھا۔ زوہا اس کا کیا جواب دیتی۔ صبر کا گھونٹ پی کر رہ جاتی۔

دو چار گھر چھوڑ کر ایک لڑکا اپنی گیلری میں آ کر کھڑا ہو جاتا تو عاشر اسے ٹوکتا۔ ''یہ تمہیں دیکھنے کے لئے یہاں کھڑا ہوتا ہے، ضرور تم نے اسے لائن دی ہو گی۔''

اس بے چاری کو یہ تک معلوم نہ تھا کہ کس گھر سے، کون لڑکا گیلری میں کھڑا ہوتا ہے۔ وہ زیادہ تر اپنے کمرے میں رہتی۔ اگر کسی کام سے صحن میں آنا بھی پڑتا تو وہ اپنا کام کرتی اور اندر چلی جاتی۔

کوئی دکاندار خوش اخلاقی سے بات کر لیتا تو ارشاد ہوتا۔ ''یہ تمہیں دیکھ کر ہنس کیوں رہا تھا؟''

''اس نے تمہارے بات کرتے ہی پیسے کم کر دیئے۔ مجھے تو کم کرنے سے منع کر دیا تھا۔''

برقع میں زوہا کی صرف آنکھیں نظر آتی تھیں۔ چہرہ نظر آتا تو فریفتہ ہونے کا شبہ بھی کیا جا سکتا تھا۔ پیسے اگر کم کر دیئے تو اس لئے نہیں کہ زوہا نے کوئی بے تکلفانہ انداز اختیار کیا۔ پیسے اس نے اس لئے کم کر دیئے کہ زوہا نے اس کی گرفت کی اور دوسری دکان کا حوالہ دیا جہاں وہ کم پیسوں میں دستیاب تھی۔

دو سال کے بعد عاشر کے ہاں ایک بچی نے جنم لیا۔ یہ بچی بھی اس کی نظر میں ''مشکوک'' ٹھہری۔ اس دن زوہا بکھر گئی۔ اس نے عاشر کے سامنے ہاتھ جوڑے اور آنکھوں میں آنسو بھر کر کہا۔ ''اللہ کے واسطے مجھ پر ایسا الزام نہ لگائیں۔ آپ مجھے روزانہ مار لیا کریں۔ مار کا زخم بھر جائے گا لیکن یہ زبان کا وار میری روح تک زخمی کئے دے رہا ہے۔ مجھے اس سے بچائیں۔''

''رونے دھونے اور ہاتھ جوڑنے سے بہتر ہے کہ اس بچی کے باپ کا نام بتا دو۔'' عاشر نے انتہائی سفاکی سے کہا۔

''اس کے باپ کا نام عاشر ہے۔'' زوہا نے پُر یقین لہجے میں کہا۔

''جھوٹ بولتی ہے تو۔'' عاشر نے چیخ کر کہا۔

''میں جھوٹ بولتی ہوں تو پھر آپ سچ بتا دیں۔'' بالآخر زوہا کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔

''میں جانتا ہوں اس کا نام۔ لیکن میں تیری زبان سے کہلوا کر رہوں گا۔'' عاشر نے اندھیرے میں تیر چلایا۔

عاشر کے والد اس وقت گھر پر تھے۔ انہوں نے جو یہ تکرار سنی تو کمرے سے باہر آ گئے اور بولے۔ ''عاشر، یہ کیا بک رہے ہو تم۔ ایسی پاکباز بہو پر الزام لگاتے تمہیں شرم نہیں آتی؟''

''ابا۔ آپ نہ بولیں۔ یہ آپ کا معاملہ نہیں، میرا اور اس آوارہ عورت کا معاملہ ہے۔ آپ درمیان سے ہٹ جائیں۔ مجھے اس سے پوچھنے دیں۔ دیکھنا ابھی یہ اصل باپ کا نام بتائے گی۔'' عاشر نے اپنے باپ کو ایک طرف ہٹاتے ہوئے کہا۔

تب ماں آگے بڑھی۔ اس نے عاشر کو سختی سے ڈانٹا۔ ''باپ کے ساتھ بدتمیزی کرتے تمہیں غیرت نہیں آتی، بے غیرت کہیں جا کر ڈوب مرو۔''

اس سے پہلے کہ وہ ماں کے ساتھ کوئی بدسلوکی کرتا، اس کی جیب میں پڑا ہوا موبائل بج اٹھا۔ اس نے غصے سے موبائل جیب سے باہر نکالا اور آن کر کے بولا۔ ''ہیلو۔''

عاشر کو جواب میں جو سننے کو ملا، اس نے اس کے تن بدن میں آگ لگا دی۔

PDF BY Manzoor

آگ تو لگنا ہی تھی......!

یہ فون ایک لڑکی کا تھا۔ اس لڑکی کا جو گاہے گاہے عاشر کو زوہا کے بارے میں نت نئی خبریں دیتی رہتی تھی۔ وہ خود کو زوہا کی سہیلی بتاتی تھی۔ ایسی راز دار سہیلی جس سے زوہا کچھ نہیں چھپاتی تھی۔ جب اس کا جی چاہتا تھا، وہ عاشر سے بات کرتی اور یہ یقین دلانے کے لئے وہ سچی ہے، عاشر کو یہ بھی بتا دیا کرتی تھی کہ آج زوہا نے کس رنگ کے کپڑے پہن رکھے ہیں اور اس کے گھر کیا پکا تھا اور کس نے پکایا تھا۔ ایسی پکی رپورٹ کو نظر انداز کرنا آسان نہ تھا جبکہ عاشر کا مزاج بے پر کا کوا بنانے کا تھا۔ وہ انتہائی وہمی اور شکی مرد تھا۔

وہ لڑکی ''آگ'' لگانے کے بعد اپنا موبائل فون آف کر دیتی تھی۔ اگر عاشر بعد میں اس سے رابطہ کرنا چاہتا تو نہ ہوتا۔ وہ لڑکی بات کرنے کے بعد پہلے موبائل فون کا سوئچ آف کرتی، پھر سم تبدیل کر لیتی۔ نتیجہ یہ کہ عاشر کوشش کے باوجود اس سے رابطہ نہ کر پاتا۔

اس فون کے سلسلے کو ایک ڈیڑھ ماہ سے زائد نہیں ہوئے تھے۔ زوہا کو معلوم نہ تھا کہ کوئی لڑکی اس کی سہیلی بن کر اس کے بارے میں کیا ''زہر'' اُگل رہی ہے۔ اس لڑکی کا زوہا سے ہرگز کوئی تعلق نہ تھا۔ وہ پڑوس کی لڑکی تھی، جس کی عاشر کی بہن فرخندہ سے خاصی دوستی تھی۔ فرخندہ کی شادی کے بعد اس نے عاشر کی بھابیوں سے دوستی گانٹھ لی۔ دراصل وہ اس گھر میں عاشر کے چھوٹے بھائی صادق کے لئے آتی تھی۔ وہ ایک منتقم مزاج اور حاسد قسم کی لڑکی تھی۔ نام تھا اس کا ریحانہ۔

ریحانہ برابر والے فلیٹ میں رہتی تھی۔ وہ اپنے گھر کے بجائے زیادہ تر یہیں گھسی رہتی۔ فلم اور فیشن اس کے مرغوب موضوعات تھے۔ زوہا کسی اور مزاج کی تھی، اس لئے وہ اسے زیادہ منہ نہ لگاتی تھی۔ اور یہ بات ریحانہ کو اچھی نہ لگتی تھی۔ نتیجہ یہ کہ وہ اس کے خلاف بھابیوں کے دلوں میں نفرت کے بیج بوتی رہتی تھی۔ ریحانہ اس گھر کی ہر بات سے واقف تھی۔ وہ صادق پر جان دیتی تھی۔ اس سے شادی کرنا چاہتی تھی لیکن صادق کو اس طرح کی ''اچھال چھکا'' قسم کی لڑکیاں پسند نہ تھیں۔ وہ سنجیدہ مزاج لڑکا تھا۔ اس گھر میں اگر کوئی آئیڈیل شخصیت تھی تو وہ زوہا تھی۔ صادق اپنے بھائی کے مزاج سے واقف تھا۔ اس لئے زوہا سے دور رہتا تھا۔ بہت نپی تلی بات کرتا تھا۔

پھر ایک دن وہ ہوا جس کی ریحانہ کو کسی طور توقع نہ تھی۔ جب ریحانہ نے شادی کے لئے شدید اصرار کیا اور صادق کے ''نرخاؤ'' جواب پر اس نے فیصلہ کن انداز اختیار کیا تو بالآخر صادق کو نفی میں جواب دینا پڑا اور یہ جواب ریحانہ کو شدید خلجان میں مبتلا کر گیا۔ اس نے سوچ لیا کہ وہ صادق سے اس انکار کا انتقام لے کر رہے گی۔

اس نے ایک تیر سے دو شکار کرنے کی ٹھانی۔

صادق ''منکر'' اور زوہا ''متکبر'' کو کیوں نہ ایک ہی چھری سے ذبح کر دیا جائے۔ شاطر ریحانہ نے بڑی جامع منصوبہ بندی کی۔ زوہا کے ہاں کسی بھی وقت ''مہمان'' آنے کی توقع تھی۔ عاشر کے مزاج سے بھی وہ اچھی طرح واقف تھی۔ وہ گھر کی بھیدی تھی۔ اس نے لنکا ڈھانے کی ٹھان لی اور اس نے عاشر کے کان میں قطرہ قطرہ ''زہر'' ٹپکانا شروع کیا۔

یہ جلتی پر تیل ڈالنے والی بات تھی۔ پہلے عاشر کو زوہا کی طرف سے ہوشیار رہنے کو کہا گیا پھر جب زوہا کے ہاں ''مہمان'' کی آمد ہو گئی تو اس نوزائیدہ بچی کو ''مشکوک'' بنا دیا گیا۔ وہ خود کو زوہا کی راز دار سہیلی بتاتی تھی لہٰذا ساری باتیں زوہا کے حوالے سے کہی جاتی تھیں۔ مثلاً زوہا نے مجھے یہ بتایا ہے کہ کیونکہ میرا شوہر مجھ پر شک کرتا ہے لہٰذا میں نے بھی اس سے ایسا انتقام لیا ہے کہ زندگی بھر یاد کرے گا۔ یہ بچی اس کی نہیں ہے۔ یہ بچی اس گھر میں رہنے والے کسی فرد کی ہے۔ میں عاشر کو چائے میں نیند کی گولی دے کر اس کو بلا لیتی تھی۔ یہ مجھ پر خواہ مخواہ شک کرتا تھا۔ اب میں نے اس کا شک یقین میں بدل دیا ہے اور اس احمق کو کچھ معلوم نہیں۔ ایک شکی آدمی کو خود اس کی بیوی کے حوالے سے بتایا جائے تو پھر اس کا تلملانا حق بجانب تھا۔ جب عاشر اپنے مجرم کا نام پوچھتا تو وہ ہنس کر کہتی۔ ''بتا دوں گی، اتنی جلدی کیا ہے؟''

اب عاشر سے صبر نہیں ہو رہا تھا۔ لہٰذا اس نے شرم و لحاظ چھوڑ کر زوہا کو اپنے نشانے پر لے لیا۔ ریحانہ اس وقت گھر میں موجود تھی۔ بھابی اسے رپورٹ دیتی رہتی تھی۔ اس وقت وہ آپے سے باہر ہوا تو بھابی نے ریحانہ سے ایسے نازک وقت میں گھر سے جانے کا اشارہ کر دیا۔

ریحانہ خود اب یہاں نہیں ٹھہرنا چاہتی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ فیصلہ کن مرحلہ آ پہنچا ہے۔ حملہ آور حملے کے لئے تیار ہے۔ بس ''ریموٹ'' کا بٹن دبانا ہے۔ ''ریموٹ'' کی صورت موبائل فون اس کے ہاتھ میں تھا۔ وہ سیدھی اپنے گھر گئی۔ تیزی سے اس نے سم تبدیل کی اور واش روم میں جا کر اس نے عاشر کو فون کیا۔

عاشر نے اپنی جیب سے فون نکالا اور بولا۔ ''ہیلو۔''

''آپ کئی دنوں سے مجھ سے اپنی بچی کے اصل باپ کے بارے میں پوچھ رہے تھے۔ اگرچہ میری سہیلی زوہا نے مجھے اصل باپ کا نام بتا دیا تھا لیکن میں آپ کو اس کا نام بتا کر صدمہ نہیں پہنچانا چاہ رہی تھی۔ لیکن اب آپ بضد ہیں اور مجھے قسم بھی دے دی ہے لہٰذا مجبور ہو کر اس کا نام بتائے دیتی ہوں۔ آپ کی بچی کا اصل باپ ہے آپ کا چھوٹا بھائی صادق۔!''

اس اطلاع نے عاشر کے تن بدن میں آگ لگا دی۔ وہ آپے سے باہر ہو گیا۔ اس کی نسوں میں دوڑنے والا خون تیزاب بن گیا۔

وہ دوڑتا ہوا کچن میں گیا، وہاں سے اس نے نو انچ لمبے پھل کی تیز دھار چھری اُٹھائی اور تیزی سے زوہا پر وار کرتا چلا گیا۔

ہر وار پر کہتا۔ ''بتا، اس کا باپ کون ہے؟''

زوہا تڑپ کر جواب دیتی۔ ''آپ۔''

زوہا میں جب تک جان رہی، وہ ''آپ'' کہتی رہی اور وہ چنگھارتا رہا۔ ''میں نہیں، صادق بول۔''

گھر میں سب لوگ دَم بخود کھڑے تھے۔ کسی میں ہمت نہ تھی کہ اس جنونی کا ہاتھ پکڑ لے۔

جب شیطانی کھیل ختم ہو گیا تو وہ خون آلود چھری لے کر گھر سے نکل گیا۔ تھانے میں جا کر اقبال جرم کر لیا۔ اس نے تھانیدار سے کہا کہ اس بچی کو کسی فلاحی ادارے میں بھجوا دیا جائے، اسے گھر میں نہ رکھا جائے۔ میں اس گند کو گھر میں نہیں دیکھنا چاہتا اور صادق سے کہنا میرا انتظار کرے۔

جب انارہ، زوہا کے قتل کا منظر دیکھ رہی تھی تو حسب معمول اس کی حالت بگڑنے لگی۔ اس نے چھری کے یہ وار اپنے جسم پر محسوس کئے۔ زوہا کے جسم سے اُبلتا ہوا خون اس کے ہوش اُڑا گیا۔ وہ گھٹی گھٹی سانس کے ساتھ بولی۔ ''اماں بس کر۔ ہٹا اس منظر کو میرے سامنے سے۔''

''اچھا۔ پریشان نہ ہو۔'' مائی پنکھی نے اپنی مٹھی کھولی۔ جلدی جلدی کچھ پڑھا اور تیسرے گھر میں بیٹھی انارہ پر پھونک ماری۔

انارہ کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ وہ تیسرے گھر میں بیٹھی اپنے حواس درست کرنے لگی۔ لمبے اور گہرے سانس لے کر اس نے خود کو سنبھالا۔

اتنی دیر میں مائی پنکھی نے چاندی کا بھاری تعویذ گلے میں ڈالا اور ساتویں گھر سے نکلتے ہوئے بولی۔ ''چل انجو۔ آ جا۔''

مائی پنکھی اپنی کھڑی چارپائی پر جا کر لیٹ گئی۔ وہ جب بھی انارہ کی زندگی کی جھلک دکھاتی تو وہ خود بھی متاثر ہوتی تھی۔ وہ نڈھال سی ہو جاتی تھی۔

انارہ، مائی پنکھی کے پیروں میں چارپائی پر بیٹھ گئی اور اس کی سوکھی ٹانگیں اپنی گود میں رکھ کر دبانے لگی۔ یہ وہ عمل تھا جس سے مائی پنکھی کو بہت سکون ملتا تھا اور اس کا دل خوش ہو جاتا تھا۔

''ہاں انجو۔ دیکھ لیا تو نے۔ اپنا تیسرا گھر۔'' مائی پنکھی اپنی آنکھوں پر ہاتھ رکھے بولی۔

''اماں۔ اس حرافہ ریحانہ نے مجھ پر بڑا ظلم کیا۔'' انارہ نے بڑے تاسف سے کہا۔

''ہاں۔ لیکن بچی وہ بھی نہیں۔ اس نے جوش میں آ کر عاشر کی بھابی کے سامنے یہ راز کھول دیا۔ بھابی اتنے بڑے راز کو راز نہ رکھ سکی۔ اس نے صادق کو بتا دیا کہ یہ سب کیا دھرا ریحانہ کا ہے۔ اس نے شادی سے انکار کا انتقام لیا۔ صادق نے ریحانہ سے دوبارہ تعلقات استوار کئے اور پھر ایک دن وہ اسے سمندر پر لے گیا۔ اس کا گلا گھونٹا اور سمندر میں پھینک کر گھر آ گیا۔'' مائی پنکھی نے بتایا۔

''اماں۔ یہ بہت اچھا ہوا۔ یہ جان کر میرے کلیجے میں ٹھنڈک پڑ گئی۔'' انارہ خوش ہوتے ہوئے بولی۔

''چل اب تو آرام کر۔ اور مجھے اپنا کام کرنے دے۔'' مائی پنکھی چارپائی سے اٹھتے ہوئے بولی۔

''اماں۔ آدھی سے زیادہ رات گزر چکی ہے۔ اب تو کیا کام کرے گی۔ چل تو بھی سو جا۔'' انارہ نے ہنستے ہوئے کہا۔

''تجھے پتا ہے کہ میں رات کو نہیں سوتی۔ میں جانے کہاں ہوتی ہوں۔'' یہ کہہ کر مائی پنکھی ٹہلنے لگی۔

اور انارہ نے کمرے کی طرف رخ کیا۔

☆......☆......☆

جانے اس لڑکی میں کیا بات تھی کہ عابر کو وہ بھلائے نہ بھول رہی تھی۔ بس چھم سے اس کے سامنے آ کھڑی ہوتی۔ اس کی باتیں دماغ میں گونجنے لگتیں۔ ''دیکھئے، آیئے گا ضرور، مجھے آپ کا انتظار رہے گا۔''

آخر یہ کون تھی جو گھٹا بن کر امڈی تھی، گھنگھور گھٹا۔ گھٹا چھاتی ہے تو ہر سُو اندھیرا ہو جاتا ہے۔ اس کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔ وہ بھی تو اسی طرح آئی تھی، اسی طرح چھائی تھی۔ چند لمحے تو اسے اپنا ہوش بھی نہ رہا تھا۔ اس کی گلابی رنگت، دوسرے کو اپنے حصار میں لینے والی آنکھیں، بات کرنے کا من موہنا انداز، اس میں گہری دلچسپی، ملاقات کی آرزو۔ پیار بھرا انتظار!

عابر نہ تا کرتا، ایک شام اس کے اپارٹمنٹ کے دروازے پر جا پہنچا۔ دروازے پر کھڑے ہو کر جب اس نے نیم پلیٹ پر نظر ڈالی تو اسے احساس ہوا کہ شاید وہ غلط اپارٹمنٹ پر آ گیا ہے۔ نیم پلیٹ پر لکھا تھا۔ ''ڈاکٹر آرزو (ایم بی بی ایس)

عابر نے فوراً اپنی جیب میں پڑا اس کا دیا ہوا وزیٹنگ کارڈ نکالا۔ کارڈ پر درج تھا۔ آرزو۔ اور نام کے نیچے آرٹسٹ لکھا تھا۔ اس نے سوچا، ہو سکتا ہے اس فلور پر آرزو نام کی کوئی ڈاکٹر بھی رہتی ہو۔ لیکن اپارٹمنٹ کا نمبر وہی تھا جو کارڈ پر لکھا تھا۔

عابر دراصل آرزو کو بغیر بتائے اس سے ملاقات کے لئے آ گیا تھا۔ وہ اسے سرپرائز دینا چاہتا تھا لیکن اب وہ خود ''متحیر'' رہ گیا تھا۔

مسئلے کا ایک حل تو یہ تھا کہ وہ کال بیل کا بٹن دبا کر دروازہ کھلنے کا انتظار کرے۔ دوسرے وہ آرزو کو اس کے موبائل پر کال کرے اور اس سے اس پہیلی کا جواب مانگے۔ ایک خیال اسے یہ بھی آیا کہ وہ بغیر بتائے اس کے دروازے تک پہنچ تو گیا ہے، ممکن ہے وہ اس وقت گھر پر موجود نہ ہو۔

اس نے بجائے کال بیل کا بٹن دبانے کے اپنے موبائل فون کا بٹن دبانا زیادہ بہتر سمجھا۔ اپارٹمنٹ سے جانے کون نکلے اور اس سے جانے کیا سوال جواب کرنے پڑیں۔

ابھی موبائل کی گھنٹی پوری طرح بھی نہ بجی تھی کہ اِدھر سے فون ریسیو کر لیا گیا۔ آرزو کی دلکش آواز سنائی دی۔ ''ہیلو۔''

''آرزو صاحبہ۔ میں عابر بول رہا ہوں۔''

''کون عابر۔ معاف کیجئے گا۔ میں آپ کو پہچانی نہیں۔'' وہ پہچانتی کیسے؟ وہ اس کے نام سے کب واقف تھی۔

''میں وہ ہوں جسے آپ نے ایک سپر اسٹور میں اپنا کارڈ دیا اور ملاقات کی خواہش ظاہر کی تھی۔''

''تھینکس گاڈ۔'' انتہائی سرشاری کے انداز میں کہا گیا۔ ''آپ کا فون تو آیا۔''

''آرزو صاحبہ۔ فون ہی نہیں، میں خود بھی آ پہنچا ہوں۔'' عابر نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''اوہ گاڈ۔ آپ تو مجھے خوشی سے دیوانہ کر دیں گے۔ کہاں ہیں آپ؟''

''آپ کے دروازے پر۔'' عابر خوشدلی سے بولا۔

''اوہ گاڈ! آپ تو نیم پلیٹ پڑھ کر پریشان ہو گئے ہوں گے۔'' آرزو نے مسئلے کو سمجھنے میں دیر نہ کی۔

''جی واقعی۔ ورنہ میں فون تھوڑے ہی کرتا۔ کال بیل بجا کر آپ کو زبردست سرپرائز دیتا۔'' اس کا لہجہ خوشگوار تھا۔

''اب بھی آپ کی آمد کسی سرپرائز سے کم نہیں۔ میں کھولتی ہوں دروازہ۔ پلیز ویٹ۔'' آرزو نے بڑے پیار سے کہا۔

دروازہ کھولنے میں آرزو نے پانچ منٹ لگائے۔ اتنی دیر میں شاید اس نے گھر سمیٹا یا پھر خود کو ٹچ اَپ کرنے میں لگائے یا پھر اس نے لباس تبدیل کیا۔ دروازہ کھول کر وہ والہانہ انداز میں عابر کی طرف بڑھی۔ وہ جینز میں تھی۔ بال کھلے ہوئے تھے لیکن سادگی سے انہیں ایک کلپ میں سمیٹا گیا تھا۔ چہرے پر کوئی میک اَپ نہ تھا، اگر تھا تو محض لپ گلوس کی صورت میں تھا۔

وہ اپنی مسحور کن آنکھوں میں ستارے سجائے بے اختیار اس کی طرف بڑھی۔ عابر دروازے سے چار قدم پیچھے کھڑا تھا۔ وہ اسے دیکھ کر مسکرایا لیکن اپنی جگہ ساکت کھڑا رہا۔ آرزو اس کے گلے لگنا چاہتی تھی۔ عابر اس بات کو سمجھ نہ پایا۔

PDF BY Manzoor

رسپونس نہ ملا تو آرزو نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا۔ عابر نے اس کا ریشمیں ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ آرزو نے بہت نرم انداز میں اس کے ہاتھ پر دباؤ ڈالا اور ہلکا سا جھٹکا دے کر بولی۔ ''بڑی خوش نصیب ہوں میں۔ آپ آئے۔''

آرزو کا چہرہ گلنار ہو گیا تھا۔ خوشی اس سے سمٹائے نہیں سمٹ رہی تھی۔ ''آیئے پلیز۔ اندر آیئے۔'' وہ دروازے کے سامنے سے ایک طرف ہوتے ہوئے بولی۔

اپارٹمنٹ میں داخل ہوتے ہی سامنے دیوار تھی۔ سیدھے ہاتھ کو ایک دروازہ تھا جو بند تھا۔ آرزو اپارٹمنٹ کا دروازہ بند کر کے پلٹی۔ عابر کا خیال تھا کہ دائیں جانب ڈرائنگ روم ہے۔ وہ اسے لے کر اندر جائے گی لیکن وہ بائیں جانب مڑی اور مسکراتے ہوئے بولی۔ ''آیئے۔''

وہ ڈرائنگ روم نہ تھا۔ بعد میں عابر کو معلوم ہوا، وہ واش روم تھا۔ راہداری میں تھوڑا آگے چلنے کے بعد بائیں جانب ایک دروازہ نظر آیا۔ عابر نے سوچا یہ ڈرائنگ روم ہوگا لیکن وہ بھی ڈرائنگ روم نہ تھا، بیڈ روم تھا۔

آرزو آگے جا کر دائیں جانب مڑی، تب عابر کو ایک وسیع لاؤنج نظر آیا۔ بائیں جانب ایک ڈائننگ ٹیبل تھی، اس کے سامنے کچن تھا اور کچن کے ساتھ ایک بیڈ روم۔ لاؤنج کے آخر میں ایک بڑا صوفہ پڑا تھا۔ سامنے شیشے کی دو میزیں تھیں اور کونے میں ایک بیڈ روم تھا جس کا دروازہ کھلا تھا۔

''یہ ہے میرا غریب خانہ۔'' آرزو نے عابر کو ایک صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے سادگی سے کہا۔

یہ چار بیڈ کا انتہائی کشادہ اپارٹمنٹ تھا۔ آرزو کی طرح اس کا گھر بھی سادگی کا نمونہ تھا۔ عابر جہاں بیٹھا تھا، وہاں سے پورا اپارٹمنٹ اس کی نظر میں تھا۔ اس اپارٹمنٹ کا ہر دروازہ بند تھا، سوائے اس دروازے کے جو عابر کے سامنے تھا۔ چند لمحوں بعد آرزو نے اسے بھی بند کر دیا اور سامنے والے صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولی۔ ''کیسا لگا آپ کو میرا گھر؟''

''بہت اچھا۔ بہت پیارا۔'' عابر نے سراہتے ہوئے کہا۔

''تھینکس آپ کو میرا گھر ڈھونڈنے میں دقت تو نہیں ہوئی؟'' آرزو نے پوچھا۔

''نہیں۔ اس علاقے کے ایک پراپرٹی ڈیلر نے مجھے اس بلڈنگ کا پتا سمجھا دیا تھا۔ میں بآسانی یہاں تک پہنچ گیا لیکن دروازے پر لگی نیم پلیٹ نے مجھے چکرا دیا۔ کارڈ پر آرٹسٹ لکھا ہے۔ نیم پلیٹ پر ڈاکٹر۔ آپ آخر ہیں کیا؟''

''مجھے خود نہیں معلوم کہ میں کیا ہوں۔'' آرزو نے فلسفہ بگھارا۔

''تو پھر آرزو کے آگے نامعلوم لکھوایئے اور شاعری فرمایئے۔'' عابر نے ہنس کر کہا۔

''آپ ہنستے ہوئے بہت اچھے لگتے ہیں۔'' آرزو اسے اپنی گہری آنکھوں کے حصار میں لیتے ہوئے بولی۔ ''میں اصل میں ڈاکٹر ہوں۔ ایک سرکاری اسپتال میں ملازمت کرتی ہوں اور پینٹنگ میرا شوق ہے۔ اپنی پسند کے چہرے پینٹ کرتی ہوں۔''

''کبھی آپ نے اپنی تصویروں کی نمائش بھی کی؟'' عابر نے پوچھا اور یہاں سے وہاں تک دیوار پر نظر دوڑائی۔ اسے ایک بھی پینٹنگ آویزاں نظر نہ آئی۔

''چھی۔'' اس نے ایک خاص انداز سے ناک سکوڑ کر کہا۔ ''مجھے نمائش سے کوئی دلچسپی نہیں۔''

''پھر بھی آپ کو اپنا کام لوگوں کے سامنے لانا چاہئے۔'' عابر بولا۔

''ارے چھوڑیں عابر صاحب۔ میں جانتی ہوں یہاں کے لوگوں کو۔ پینٹنگز چھوڑ کر مجھے دیکھنے لگ جائیں گے۔ میں تماشا بننے کے لئے تیار نہیں۔'' آرزو نے عجیب تاویل دی۔

''تو کیا ہوا۔'' عابر مسکرا کر بولا۔ ''آپ بھی تو شاہکار ہیں۔''

''شکریہ عابر صاحب!'' آرزو نے اسے ترچھی نظروں سے دیکھا۔ ''آپ باتیں بھی زبردست کرتے ہیں۔''

''مجھے اتنا اہم بنانے کا بہت شکریہ۔'' عابر بولا۔

''اچھا۔ یہ بتائیں کیا پئیں گے؟'' آرزو نے اٹھتے ہوئے کہا۔

''کچھ نہیں۔'' عابر نے جلدی سے کہا۔ ''ارے۔ آپ بیٹھ جائیں۔''

''نہیں۔ کچھ تو بتائیں؟'' آرزو نے اصرار کیا۔ ''چائے میں بہت اچھی بناتی ہوں، چلیں چائے پیتے ہیں۔'' یہ کہہ کر وہ کچن میں داخل ہو گئی۔

کچن میں چائے بناتے دیکھ کر عابر کو احساس ہوا کہ شاید وہ اتنے بڑے اپارٹمنٹ میں اکیلی رہتی ہے۔ اگر اس گھر میں کوئی اس کے علاوہ ہوتا تو نظر تو آیا ہوتا۔ یا پھر اتنے تنہا پسند لوگ تھے کہ اپنے کمروں میں بند تھے۔ گھر میں کون آیا، کون گیا، انہیں اس سے دلچسپی نہ تھی۔

آرزو نے چائے بہت تیزی سے بنائی۔ پانچ سات منٹ میں وہ چائے کے ساتھ فریج سے کباب نکال کر بھی تل لائی۔ ٹرے میز پر رکھ کر اس نے ایک کباب پلیٹ میں نکالا اور اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولی۔ ''میں نے سوچا آپ تکلف کریں گے، اس لئے خود ہی نکال کر دے دوں۔ چکھ کر دیکھ لیجئے۔ شاید آپ کو پسند آئے۔''

''یہ کباب آپ نے بنائے ہیں؟'' عابر نے پلیٹ اپنے سامنے رکھی، چھری سے کاٹ کر ٹکڑا کانٹے سے اُٹھایا اور منہ چلا کر بولا۔ ''بہت عمدہ۔''

''تھینکس۔'' آرزو مسکرائی۔

''ایک بات بتایئے۔'' اس نے آرزو کو متوجہ کیا۔

''جی۔ پوچھئے۔'' آرزو نے عابر کی آنکھوں میں دیکھا جیسے سوال کا اندازہ لگانا چاہتی ہو۔

''کیا آپ اکیلی رہتی ہیں؟'' عابر نے اپنے خیال کی تصدیق چاہی۔

''یہ آپ نے کیسے اندازہ لگایا؟'' آرزو تھوڑا سا حیران ہوئی۔

''مجھے ابھی تک کوئی آتا جاتا نظر نہیں آیا۔'' عابر نے کہا۔

''یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ میرے گھر والے اپنے کمروں میں آرام کر رہے ہوں۔'' آرزو نے سوال کیا۔

''ہاں۔ ایسا ممکن ہے۔'' عابر نے اعتراف کیا۔

''لیکن ایسا ہے نہیں۔ میں اس گھر میں واقعی اکیلی رہتی ہوں۔''

''آپ کو ڈر نہیں لگتا؟'' عابر بولا۔

''نہیں۔'' آرزو نے بڑے یقین سے کہا۔ ''ڈر کس بات کا؟''

''لیکن میں اتنے بڑے گھر میں اکیلا نہیں سو سکتا۔'' عابر نے صاف گوئی سے کہا۔

آرزو نے کہنا چاہا کہ مرد ہو کر بھی ڈرتے ہیں لیکن کہا نہیں۔ وہ سادگی سے اتنا بولی۔ ''حیرت ہے۔''

چائے کے دوران آرزو کا موبائل دو تین بار بجا۔ ایک نمبر اس نے دیکھ کر کاٹا، دوسری کال پر ''اچھا ٹھیک ہے'' کہہ کر موبائل بند کر دیا۔ تیسرے فون پر وہ ''ہیلو، ہیلو'' کہتی صوفے سے اٹھ گئی جیسے اُدھر سے آواز صاف نہ آ رہی ہو۔ وہ سامنے والے کمرے میں چلی گئی اور دروازہ اندر سے بند کر لیا۔

پانچ منٹ بعد وہ واپس آئی، موبائل فون شیشے کی میز پر پٹخا اور خود کلامی کے انداز میں بولی۔ ''اسپتال کی نوکری عذاب ہے۔ ہر وقت ایمرجنسی نافذ رہتی ہے۔ اسپتال سے ایمرجنسی کال ہے، مجھے جانا ہوگا۔''

''جائیں۔ فوراً جائیں۔'' عابر اٹھتا ہوا بولا۔

''بیٹھیں پلیز۔ اب ایسی بھی ایمرجنسی نہیں۔ گاڑی آئے گی تب جاؤں گی۔'' آرزو نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ ''آپ پہلی بار آئے۔ میں آپ کو ٹائم نہ دے سکی۔ سوری عابر۔ آپ مجھے اپنا سیل نمبر دینا پسند کریں گے؟''

''ڈاکٹر آرزو۔ ابھی جو میں نے آپ کو کال کی تھی، اُسے سیو کر لیں۔'' عابر نے خندہ پیشانی سے کہا۔

آرزو نے اس کے نمبر کو سیو کر لیا اور مسکراتے ہوئے بولی۔ ''آپ آئے مجھے خوشی ملی۔ آئندہ آئیں تو مجھے فون پر چیک ضرور کر لیں۔ میں گھر پر مشکل سے ہی ہوتی ہوں۔''

''ٹھیک ہے۔'' عابر یہ کہہ کر اٹھنے لگا۔ ''آپ جانے کی تیاری کیجئے، میں چلتا ہوں، پھر ملیں گے۔''

آرزو اسے چھوڑنے دروازے تک آئی۔ اس سے آئندہ آنے کا وعدہ لیا اور کھٹ سے دروازہ بند کر لیا۔

عابر سیڑھیاں اتر کر بلڈنگ سے باہر آیا تو ایک ڈارک شیشوں والی گاڑی جس پر سرکاری نمبر پلیٹ لگی تھی، دروازے سے تھوڑا آگے کھڑی تھی۔ عابر اس گاڑی پر ایک سرسری سی نظر ڈال کر سڑک پر آ گیا۔

ابھی وہ آگے بڑھا ہی تھا کہ سڑک کے کنارے اسے ''بابا دنیا'' نظر آ گیا۔ اس سے قبل بابا اسے متوجہ کرتا، عابر خود اس کی طرف بڑھ گیا۔ اس بابا سے عابر کو کچھ عقیدت سی ہو گئی تھی۔ ڈاکٹر شوکت کے گھر سے نکل کر جب عابر بے نشاں منزل کی طرف گامزن تھا تو اسی بابا دنیا نے اسے منزل عطا کی تھی۔ اگر وہ نازنین کی بیماری کا ذکر نہ کرتا تو وہ ہرگز گھر کا رخ نہ کرتا اور اب جانے کہاں بھٹک رہا ہوتا۔

نازنین کو جب معلوم ہوا کہ ایک فقیر نے اسے گھر کی راہ دکھائی تھی تو انہوں نے کہا تھا کہ بیٹا وہ آئندہ ملے تو اسے گھر لے آنا۔ یہی سوچ کر وہ اس کی طرف بڑھا تھا۔

وہ فقیر اسے دیکھ کر اُٹھ کھڑا ہوا اور اس کے آگے ہاتھ پھیلا کر بولا۔ ''دے اللہ کے نام پر۔''

عابر نے جیب سے پچاس روپے کا نوٹ نکال کر اس کے ہاتھ پر رکھ دیا اور بولا۔ ''بابا۔ آپ کا نام کیا ہے؟''

''فقیروں کا کوئی نام نہیں ہوتا۔ نام بس اللہ کا ہے۔ وہی اوّل، وہی آخر۔''

''بابا۔ آپ میرے ساتھ گھر چلیں۔ میری ماں آپ سے ملنا چاہتی ہیں۔'' عابر نے التجا آمیز لہجے میں کہا۔

''اس سے اس کا بیٹا ملا دیا۔ اور کیا چاہتی ہے وہ؟'' بابا دنیا نے سوال کیا۔

''آپ کو دیکھنا چاہتی ہیں۔'' عابر نے بتایا۔

''ہم کسی کے گھر نہیں جاتے۔'' بابا دنیا نے دوٹوک لہجے میں کہا۔

''بابا! چلیں نا۔ میں آپ کو رکشا میں بٹھا کر لے جاؤں گا اور واپسی میں آپ جہاں کہیں گے، چھوڑ دوں گا۔'' عابر نے اصرار کیا۔

''نہیں۔ تو جا۔ دیکھ تجھے دنیا ڈھونڈ رہی ہے۔'' بابا دنیا نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ وہ ان آنکھوں کی تاب نہ لا سکا۔ اس نے اپنی آنکھیں جھکا لیں۔ اور جب اس نے پلکیں اٹھائیں تو اسے بابا دنیا دس قدم دور نظر آیا۔ وہ اپنی دُھن میں مگن تیزی سے چلا جا رہا تھا۔

عابر کو اس کے جانے کا بڑا افسوس ہوا۔ اوّل تو اسے امید نہ تھی کہ بابا سے آئندہ کبھی ملاقات ہوگی۔ اسے اچانک اپنے سامنے دیکھ کر عابر یکدم خوش ہو گیا تھا لیکن بابا دنیا نے اس کے گھر جانے سے صاف انکار کر کے اسے افسردہ کر دیا تھا۔

اگر بابا دنیا اس کے ساتھ چلا جاتا تو نازنین اس کو دیکھ کر کتنی خوش ہوتی۔ یہ وہ بابا تھا جس نے اس پر احسانِ عظیم کیا تھا۔ لیکن وہ اس کو گردانتے کو تیار نہ تھا۔

عابر، بابا دنیا کے بارے میں سوچتا ہوا مارکیٹ تک پہنچا۔ اس اثنا میں اسے کوئی ٹیکسی یا رکشا نظر نہ آیا۔ ابھی وہ مین روڈ کی طرف مڑ ہی رہا تھا کہ پیچھے سے گاڑی کے ہارن کی آواز آئی۔ عابر نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ اتنے میں ایک کالی گاڑی اس کے برابر سے گزر گئی۔

یہ وہی گاڑی تھی جو آرزو کی بلڈنگ کے پاس کھڑی تھی۔ اندھے شیشوں کی وجہ سے عابر یہ نہ دیکھ سکا کہ اس کی پچھلی سیٹ پر آرزو براجمان تھی۔

☆......☆......☆

تیرہویں کا چاند اپنی تیز روشنی صحرا پر بکھیر رہا تھا۔ چاند کی تیرہ ہونے کی وجہ سے چاند مکمل نہ تھا۔ ہلکا سا کٹا ہوا تھا لیکن اس کی روشنی چودھویں کے چاند سے زیادہ تیز تھی۔ لق و دق صحرا پر برستی چاندنی اس کے ذرّے ذرّے کو منور کر رہی تھی۔ جنگل میں منگل کا سماں ہوتا ہے لیکن یہاں صحرا میں ''اتوار'' کا سماں تھا۔

ایک طرف پچاس ساٹھ دیگیں چڑھی تھیں جن میں نت نئے کھانے پکائے جا رہے تھے۔ تھوڑے فاصلے پر مونڈھے قطاروں میں رکھے تھے۔ مونڈھوں کے درمیان ایک چوڑا راستہ تھا جس پر موٹا سرخ قالین بچھا ہوا تھا اور یہ قالین اس اسٹیج تک چلا گیا تھا جو ایک ریت کے ٹیلے پر بنایا گیا تھا۔ اسٹیج پر بھی سرخ قالین بچھا تھا۔ چھ سات سیڑھیاں تھیں جنہیں عبور کر کے اسٹیج پر پہنچا جا سکتا تھا۔ اسٹیج پر پشتوں والے دو مونڈھے موجود تھے جن کی پشت پر مخملی غلاف چڑھا ہوا تھا اور ان پر چرمی موٹی گدیاں رکھی تھیں۔

لوگوں کی آمد شروع ہو چکی تھی۔ ہر مہمان اپنی پسند کی نشست پر بیٹھتا جا رہا تھا۔ مہمانوں میں مرد اور عورتیں دونوں تھے۔ عورتوں کی تعداد زیادہ تھی۔

شیطان نما انسانوں کی یہ سالانہ تقریب تھی۔ ایک بڑے شیطان کے ہاتھوں یہاں اعزازات دیئے جانے تھے۔ اس تقریب میں ان انسانوں کو جو شیطان کے چیلے تھے اور اب شیطانوں کا روپ دھار چکے تھے، انعامات ملنے تھے۔ خصوصی انتظام کے تحت انہیں گھروں سے لایا اور پھر واپس چھوڑا جاتا تھا۔ یہ تقریب دراصل ایک خواب کی کیفیت میں منعقد ہوتی تھی۔ جب بندہ سو کر اٹھتا تو اپنے سرہانے رکھے ایوارڈ کو دیکھ کر اس کی آنکھوں میں ایک فلم سی چل جاتی اور جسے ایوارڈ نہ ملتا، اس کے سرہانے تقریب کا ''پرساد'' موجود ہوتا۔ یہ ایک کوئلے جیسا چھوٹا ٹکڑا ہوتا۔ اسے دانتوں سے کاٹ کر کھایا جاتا تھا۔

کھلے آسمان تلے ہونے والی یہ سالانہ تقریب شروع ہونے والی تھی۔ سارے مہمان آ چکے تھے۔ اب ایک مونڈھا بھی خالی نہ تھا۔ ہر مہمان کو ان کی نشستوں پر ایک بڑی پلیٹ میں کھانا مہیا کیا جا چکا تھا۔ لوگ اپنی اپنی پلیٹیں خالی کر کے مونڈھوں کے ساتھ رکھ چکے تھے۔ اب مٹی کے پیالوں میں مشروب پیا جا رہا تھا۔ یہ خون نما تلخ مشروب مہمان مزے سے چسکیاں لے کر پی رہے تھے۔

اتنے میں ایک دیو نما شخص اسٹیج پر نمودار ہوا۔ اس کے ہاتھ پاؤں اور جسم دھوئیں کی سی کیفیت لئے ہوئے تھے جبکہ چہرہ ٹھوس مگر مکروہ تھا۔ اسٹیج پر اس کے نمودار ہوتے ہی ایک ہلچل سی مچ گئی۔ سارے مہمان اپنے ہاتھوں میں مٹی کے پیالے لئے ہوئے احتراماً کھڑے ہو گئے۔ پھر جب وہ دیو نما شخص ہلتا جلتا ایک بڑے مونڈھے پر بیٹھ گیا تو اس کے بیٹھتے ہی اور سب لوگ بھی اپنی نشستوں پر براجمان ہو گئے۔

لوگوں کے بیٹھتے ہی ایک شخص سرخ لباس پہنے، اسٹیج پر پہلوانوں کی طرح چلتا آیا اور اسٹیج کے درمیان کھڑا ہو گیا۔ اس سخت چہرے والے شخص نے حاضرین پر نظر ڈالی اور چیخ کر بولا۔ ''مائی پنکھی حاضر ہو۔''

اگلی قطار میں مونڈھے پر بیٹھی مائی پنکھی اپنا نام سن کر سرخ لباس سنبھالتی تیزی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ سیڑھیاں چڑھ کر اسٹیج پر پہنچی تو اسے دیکھ کر بڑے مونڈھے پر بیٹھا شیطان اپنی جگہ کھڑا ہو گیا۔

مائی پنکھی اس کے سامنے جھکنے لگی تو اس نے اشارے سے روکا اور بولا۔ ''آج تو ہمیں تیرے سامنے جھکنا چاہئے، تو پہلی انسان ہے جس نے یہ اعزاز حاصل کیا ہے۔''

''تیری بڑی مہربانی بگّا۔'' مائی پنکھی بولی۔

''آ بیٹھ جا۔'' بگّا نے اپنے برابر رکھے خالی مونڈھے کی طرف اشارہ کیا۔

مائی پنکھی کے لئے یہ ایک اور اعزاز تھا کہ اسے بگّا کے برابر بیٹھنے کی جگہ مل رہی تھی۔ مائی پنکھی کے مونڈھا سنبھالنے کے بعد بگّا بھی اپنے مونڈھے پر براجمان ہو گیا۔

اتنے میں ایک کالی چمکتی ہوئی عورت تھال میں ایک جگمگاتا تاج لے کر آئی۔ اس کے پیچھے دو عورتیں اور تھیں۔ وہ دونوں مائی پنکھی کے پیچھے آ کر کھڑی ہو گئیں جبکہ تاج لانے

PDF BY Manzoor

والی عورت بگا کے سامنے آ کر رک گئی۔

چند لمحوں بعد سخت چہرے والا شخص پھر نمودار ہوا۔ اس نے اسٹیج کے درمیان کھڑے ہو کر مائی پنکھی کے کارناموں پر روشنی ڈالنا شروع کی۔ بتایا گیا کہ مائی پنکھی کو یہ اعزاز کس وجہ سے عطا کیا گیا ہے۔ مختلف شیطانی قوتیں حاصل کرنے کے لئے مائی پنکھی نے جو جتن کئے، آج اس کے صلے میں اسے ''رانی'' کا خطاب دیا اور تاج پوشی کی جا رہی تھی۔

''سپاس نامہ'' پڑھ کر وہ سخت چہرے والا شخص پہلوانوں کی طرح چلتا واپس چلا گیا۔ تب وہ چمکتی ہوئی کالی عورت بگا کی جانب بڑھی۔ اس نے جھک کر تاج پیش کیا۔

بگا نے جگمگاتا تاج مائی پنکھی کے سر پر رکھا اور بولا۔ ''پنکھی، آج سے تو رانی ہوئی۔''

سر پر تاج سجاتے ہی حاضرین نے کھڑے ہو کر تالیاں بجائیں۔ پیچھے کھڑی عورتوں نے فوراً تاج سنبھال لیا۔ اور مائی پنکھی کے سر پر اچھی طرح جما دیا۔

تب رانی پنکھی کھڑی ہوئی۔ اسے اٹھتے دیکھ کر بگا بھی کھڑا ہو گیا۔ دونوں ساتھ چلتے ہوئے اسٹیج کے درمیان میں آ کر کھڑے ہو گئے۔

بگا نے ہاتھ اٹھا کر ہوا میں لہرایا تو حاضرین نے یکلخت تالیاں بجانا بند کر دیں اور اپنی اپنی نشستوں پر بیٹھ گئے۔

پھر بگا، رانی پنکھی کو لے کر سیڑھیوں سے اترا اور بائیں جانب آگے بڑھا۔ تھوڑے فاصلے پر ایک رتھ کھڑا ہوا نظر آیا۔ اس رتھ میں آٹھ سفید گھوڑے جتے ہوئے تھے۔ بگا نے رانی پنکھی کو سہارا دے کر رتھ میں بٹھایا اور اس سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''پنکھی، اب تو رانی ہو گئی، اب تو مجھے اپنا راجہ کب بنائے گی؟''

''دیکھ بگا، مجھے ابھی اور آگے جانا ہے۔ تیری رانی بن کر اپنی راہ کھوٹی نہیں کرنا چاہتی۔'' رانی پنکھی نے فیصلہ کن انداز میں کہا اور یہ جواب بگا کا دل چیر گیا۔

''پنکھی، پھر دیکھ لے؟'' بگا کے لہجے میں دھمکی تھی۔

''اب کیا دیکھنا۔'' رانی پنکھی نے بے اعتنائی سے جواب دیا۔ اب اسے پنکھ لگ چکے تھے۔

☆.....☆.....☆

ایک شام آرزو کا فون آیا۔ عابر اپنے موبائل کی اسکرین پر اس کا نام دیکھ کر خوش ہو گیا۔ اس نے بٹن دبا کر مسکراتے ہوئے کہا۔ ''ہیلو۔''

''عابر۔ کیسے ہیں آپ؟'' آرزو کی کھنکتی آواز سنائی دی۔

''میں بالکل بھلا چنگا ہوں۔'' عابر نے بے تکلفی سے کہا۔

''سوری سر۔ اس دن اسپتال کی ایمرجنسی کال نے بدمزگی پیدا کر دی۔ میں آپ کا صحیح معنی میں استقبال نہ کر پائی۔''

''اب کیا مجھے ہار پھول پہنانے تھے۔'' عابر ہنسا۔ ''آپ نے چائے پلا دی، یہ بہت ہے۔ میں پھر کسی دن آ جاؤں گا۔''

''یہ فون میں نے آپ کو بلانے کے لئے ہی کیا ہے۔'' آرزو پُرشوق لہجے میں بولی۔ ''میرا کل اسپتال سے آف ہے۔ آپ کل شام کو آ جائیں، میں آپ کو جلدی جانے نہ دوں گی۔ رات کا کھانا کھلا کر بھیجوں گی۔ پھر کل آ رہے ہیں نا آپ؟''

''جی۔ میں ضرور آؤں گا لیکن کھانے کا تکلف مت کیجئے گا۔ اوکے۔'' عابر نے اقرار چاہا۔

''میں کھانا بہت اچھا بناتی ہوں۔ آج میں آپ کے لئے اسپیشل کیک بناؤں گی۔ ٹھیک ہے پھر کل ملاقات ہوتی ہے۔'' آرزو نے اصرار کیا۔ ''شام کو آپ کا انتظار کروں گی۔''

اور پھر جواب سنے بغیر آرزو نے فون آف کر دیا۔ عابر نے مسکرا کر اپنے موبائل پر نظر ڈالی اور اسے جیب میں رکھ لیا۔

دوسرے دن جب عابر، آرزو کے گھر پہنچا تو اُسے کالے ٹراؤزر اور زردی مائل قمیض میں پایا۔ آج اس نے ہلکا سا میک اَپ کر رکھا تھا۔ وہ اسے پُرشوق نگاہوں سے دیکھتی لاؤنج میں لے آئی اور اسی صوفے پر بٹھایا جہاں وہ پہلے دن بیٹھا تھا۔

''آج میں نے اسپتال فون کر کے کہہ دیا ہے کہ کیسی بھی ایمرجنسی ہو، میں نہیں آؤں گی، کسی اور ڈاکٹر کو کال کر لیجئے گا۔ آپ جانتے ہیں میرے سینئر ڈاکٹر اکمل نے مجھ سے کیا پوچھا؟'' آرزو اس کے ساتھ ہی صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولی۔

''نہیں۔ میں نہیں جانتا۔'' عابر بولا۔

''وہ پوچھنے لگے۔ بھئی ڈاکٹر آرزو۔ آج کیا کوئی خاص بات ہے؟'' میں نے انہیں فوراً بتا دیا کہ جی خاص بات ہے۔ آج میرے یہاں بہت ہی خاص بندہ آ رہا ہے۔ وی وی آئی پی۔'' آرزو نے ہنس کر بتایا۔

''اس قدر اہم بنانے کا شکریہ۔'' عابر نے اسے ممنون انداز میں دیکھا۔

''اچھا پہلے ایک کپ چائے پیتے ہیں، کیک کھاتے ہیں اور پھر بناتے ہیں آپ کی ڈھیروں تصویریں۔'' آرزو چٹکی بجاتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی۔

''تصویریں!'' عابر چونکا۔

''بھئی اب وہ زمانہ تو ہے نہیں کہ ماڈل کو اپنے سامنے بٹھا کر پینٹنگ بنائی جائے۔ اب گھنٹوں بیٹھنے کی کسی کے پاس فرصت ہے اور نہ آرٹسٹ کے پاس وقت۔ میں ڈیجیٹل کیمرے سے آپ کی تصویریں اتار لوں گی۔ ان میں سے ایک سلیکٹ کر کے جب بھی وقت ملے گا، کام کرتی رہوں گی۔'' آرزو نے وضاحت کی۔

اس دن آرزو نے رات تک بے شمار تصویریں اتاریں۔ وہ عابر کی کچھ ''بولڈ'' تصویریں بھی اتارنا چاہتی تھی لیکن عابر نے بہت سختی سے انکار کر دیا۔ ''نہیں آرزو صاحبہ، میں رنبیر کپور نہیں ہوں۔ وہ اداکار ہے۔ میں اداکار نہیں ہوں۔ میں کسی صورت بے لباس ہونے کے لئے راضی نہیں۔''

''اِٹس اوکے۔ ریلیکس۔ جذباتی ہونے کی ضرورت نہیں۔'' آرزو نے مسکرا کر کہا اور کیمرہ بند کر کے رکھ دیا۔

رات کو وہ دونوں بڑی خاموشی سے کھانا کھا رہے تھے۔ عابر کو یہ خاموشی بڑی کھل رہی تھی۔ آرزو یکدم بولتے بولتے چپ ہو گئی تھی۔ عابر بولنا چاہتا تھا لیکن اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا بولے۔ وہ اس کی ذاتی زندگی کے بارے میں جاننا چاہتا تھا۔ وہ خوبصورت تھی، ڈاکٹر تھی۔ پھر بھی تنہا تھی۔ اس نے دنیا بھر کی باتیں کی تھیں لیکن اپنی ذاتی زندگی کے بارے میں ایک حرف بھی نہیں بولی تھی۔ اگر اس نے کوئی ذاتی سوال کیا بھی تھا تو وہ بڑی خوبصورتی سے طرح دے گئی تھی۔

پھر یکدم اس نے خاموشی توڑی اور بولی۔ ''عابر۔ میں آپ کو کب سے ڈھونڈ رہی تھی۔''

آرزو کا یہ جملہ سن کر عابر کا دھیان فوراً بابا دنیا کی طرف گیا۔ آواز آئی۔ ''تجھے دنیا ڈھونڈ رہی ہے۔'' عابر مسکرایا اور بولا۔ ''کیا آپ دنیا ہیں؟''

''کیا مطلب؟'' آرزو الجھ کر بولی۔

''اس بات کا مطلب تو مجھے بھی نہیں معلوم۔'' عابر معصومیت سے بولا۔ وہ بابا دنیا کا اس کے سامنے تذکرہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔

''میں آپ جیسا چہرہ جانے کب سے ڈھونڈ رہی تھی۔'' آرزو نے اپنی بات کی وضاحت کی۔ ''بڑا نادر چہرہ ہے آپ کا، بہت زبردست پینٹنگ بنے گی۔ اچھا چھوڑیں اس بات کو۔ میں آپ کو اپنے بارے میں ایک پُراسرار بات بتاتی ہوں۔''

''یہ ہوئی نا بات۔ فوراً بتائیے۔'' عابر سنبھل کر بیٹھ گیا۔ آرزو نے جب اپنی ذات کے حوالے سے پُراسرار راز کھولا تو عابر حیرت زدہ رہ گیا۔

PDF BY Manzoor

''ایسا کیسے ہوسکتا ہے؟'' وہ غیر یقینی انداز میں بولا۔

''یہ سچ ہے عابر...... میری پیٹھ پر سانپ کا نشان ہے اور یہ پیدائشی ہے۔'' آرزو نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''میں نے یہ بات کسی کو بتائی نہیں...... آپ پہلے مرد ہیں جس کے سامنے میں نے یہ راز کھولا ہے، کہیں آپ مجھ سے ڈرنے تو نہیں لگیں گے؟''

''ہاں...... ڈرنا تو چاہئے۔'' عابر نے مسکراتے ہوئے ازراہِ مذاق کہا۔

''چھی......'' اس نے مخصوص انداز میں ناک سکوڑی۔ ''میں کوئی ناگن ہوں؟''

''پھر پشت پر سانپ کا نشان کیوں؟'' عابر بولا۔ ''اس مسئلے پر آپ نے کسی بزرگ وغیرہ سے بات نہیں کی؟''

''میرے والدین نے کی ہو تو میں نہیں جانتی لیکن میں نے نہیں کی۔'' آرزو نے سنجیدگی سے کہا۔ ''کیا آپ کسی بزرگ کو جانتے ہیں؟''

''نہیں...... میں کسی بزرگ کو نہیں جانتا۔'' عابر بولا۔ ''ویسے یہ نشان ہے کتنا بڑا......؟''

''کوئی ایک فٹ بڑا ہوگا، صاف اور واضح ہے۔'' آرزو نے اسے اپنی جادو بھری آنکھوں کے حصار میں لیا۔ اس کی آنکھوں میں ایک خاص قسم کی چمک تھی۔

''اچھا...... پھر میری پینٹنگ پر کام کب سے شروع کر رہی ہیں؟'' عابر نے یکدم موضوع بدلا۔

''بس فرصت ملتے ہی کام شروع ہو جائے گا، آپ کو جلدی تو نہیں؟'' وہ بولی۔

''نہیں...... آپ کام اپنے حساب، اپنے انداز سے کیجئے۔'' عابر اٹھتے ہوئے بولا۔ ''اب میں چلوں، خاصا وقت ہو گیا ہے۔''

''اچھا۔'' اس کے لہجے میں ایک بے نام سی اداسی تھی۔ ''پھر کب آیئے گا؟'' وہ اس کے ساتھ دروازے کی طرف بڑھی۔

''جب آپ کال کریں گی۔'' عابر نے خوشدلی سے کہا۔

''اچھا......'' اس نے اچھا کو خاصا کھینچ کر کہا۔ ''آپ کوئی کال بوائے ہیں کیا؟''

''خوب معنی پہنائے میری بات کے......! آپ بولڈ ہونے کے ساتھ شریر بھی ہیں۔'' عابر نے رخصت ہوتے ہوئے کہا۔

آرزو نے ''تھینکس'' کہا اور اسے جاتے ہوئے ایک خاص انداز سے دیکھنے لگی۔ جانے ان نظروں میں کیا تھا۔

☆......☆......☆

مائی پنکھی جو اب رانی پنکھی بن چکی تھی، سرخ ریشمی لباس میں اپنی کھرّی چارپائی پر بڑی تمکنت سے بیٹھی تھی۔ اس کے سر پر تاج موجود تھا جو گزشتہ رات کی کہانی سنا رہا تھا۔

رانی پنکھی کو صحرا میں منعقدہ تقریب کا ایک ایک لمحہ یاد تھا۔ یہ اعزاز واقعی بڑا تھا جو کسی انسان کو اس کے ''شیطانی کارناموں'' پر عطا کیا گیا تھا۔ اس کی شان میں وہاں جو کچھ کہا گیا، اسے یاد کر کے وہ جھوم رہی تھی۔

لیکن وقتِ رخصت جو بدمزگی ہوئی، اسے یاد کر کے رانی پنکھی فکرمند ہو گئی۔ کالی دنیا میں بگّا کی جو حیثیت تھی، وہ اس سے اچھی طرح واقف تھی اور اس بات کا بھی اسے اچھی طرح احساس تھا کہ بگّا اسے محبت کی نگاہ سے دیکھتا ہے، وہ اسے دل میں بسائے ہوئے تھا لیکن وہ یہ نہیں جانتی تھی کہ وقتِ رخصت وہ ایسی بات کہہ دے گا اور اس کے جواب میں اس کے منہ سے بھی ایسی بات نکل جائے گی جو اس کو ناراض کر جائے گی لیکن اب جو ہونا تھا، وہ ہو چکا تھا۔

رات گزر چکی تھی، صبح کا اجالا پھیل چکا تھا۔ نیم کے درخت پر کوؤں کی ''کائیں کائیں'' جاری تھی۔

رانی پنکھی کے آواز دینے پر جب کالے منہ کی سفید بلی اندر کمرے سے نکل کر دروازے پر آئی تو سامنے بیٹھی رانی پنکھی کو دیکھ کر حیرت زدہ رہ گئی۔ سرخ لباس اور سر پر تاج۔ مائی پنکھی کی تو جُون ہی بدلی ہوئی تھی۔

رانی پنکھی نے انجو کی آنکھوں میں حیرت دیکھی تو پیار سے بولی۔ ''آ جا میری انجو......!'' انجو نے دو تین زقندیں بھریں اور اس کے پاؤں میں لوٹنے لگی۔ رانی پنکھی نے اسے اپنے ہاتھوں میں اٹھا لیا اور پیار کرتے ہوئے بولی۔ ''انجو...... میں رانی بن گئی ہوں، میں رات کو یہاں نہیں تھی، میں نے تجھ سے کہا تھا نا کہ میں رات کو جانے کہاں ہوتی ہوں، سالانہ جلسے میں مجھے تاج پہنایا گیا، انجو تو وہاں ہوتی تو سنتی کہ میری شان میں وہاں کیا کیا کہا گیا، میں تجھے سب سناؤں گی، ایک ایک بات بتاؤں گی، چل پہلے میرے ناشتے کا انتظام کر، میں بھی ذرا یہ تاج سنبھال کر اندر رکھ دوں اور کپڑے بدل لوں۔''

رانی پنکھی نے انجو کو چارپائی پر چھوڑا اور خود بڑی تمکنت سے چلتی اندر کمرے میں چلی گئی۔

انجو اس کے باہر آنے کا انتظار کرنے لگی۔

تھوڑی دیر کے بعد جب رانی پنکھی باہر آئی تو وہ گھریلو لباس میں تھی۔ اپنے روایتی لباس کالے لہنگے اور کالی کُرتی میں......! وہ تیز تیز چلتی باورچی خانے میں پہنچی۔

چولہے میں آگ جلا کر اس نے ہنڈیا میں ''مال مسالا'' ڈالا اور اسے اُبلنے کے لیے رکھ دیا۔

دس منٹ کے بعد جب ہنڈیا میں ابال آ گیا تو رانی پنکھی نے انجو کو اشارہ کیا۔ اشارہ ملتے ہی وہ ایکشن میں آ گئی۔

پھڑ پھڑاتے کوّے کو رانی پنکھی نے ہنڈیا میں ڈالا اور ''یخنی'' تیار ہونے کا انتظار کرنے لگی۔

سیال تیار ہونے پر اس نے اُبلتے سیال میں ہاتھ ڈال کر کوّے کو نکالا اور اسے لیے باورچی خانے سے باہر آ گئی۔ انجو کمرے میں جا چکی تھی۔

وہ بیچ صحن میں کھڑی ہوئی، اس نے ایک نظر اوپر دیکھا اور کچھ پڑھ کر کوّا آسمان کی طرف اُچھال دیا۔ ''لے بگّا!''

لیکن جواب میں وہ ہوا، جو کبھی نہ ہوا تھا۔

☆......☆......☆

اس دن جب عابر، آرزو کے گھر پہنچا تو اس کا انداز ہی بدلا ہوا تھا۔ اس نے عابر کو فون کر کے بلایا تھا۔ کہا تھا۔ ''میں اسپتال سے نکل رہی ہوں، کیا آپ ابھی میرے گھر آ سکتے ہیں؟''

''ہاں آ سکتا ہوں۔'' عابر نے اپنی کلائی کی گھڑی پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔ ''اس وقت ساڑھے چھ بجے ہیں، میں ساڑھے سات، آٹھ کے درمیان پہنچ جاؤں گا، ٹھیک ہے۔''

''سوسوئٹ!'' آرزو یکدم خوش ہو گئی۔ ''بے شک آپ آٹھ بجے کے بعد آ جائیں، آرام سے...... لیکن اتنا یاد رکھیے گا کہ کھانا میرے ساتھ کھائیں گے، او کے۔ میں انتظار کروں گی۔''

اور پھر عابر کا جواب سنے بغیر فون بند کر دیا۔ یہ اس کی عجب عادت تھی۔

عابر آٹھ بجے کے بعد ہی یہاں پہنچا تھا۔ آرزو نے دروازہ کھولا تو اس کے بائیں ہاتھ میں نازک سا گلاس تھا جو آدھا بھرا ہوا تھا۔ عابر نے غور سے اس ادھ بھرے گلاس کی طرف دیکھا لیکن وہ اندازہ نہ کر پایا کہ اس میں پانی ہے، کولڈ ڈرنک ہے یا کچھ اور......!

آرزو نے عابر کے اندر آنے کے بعد دروازہ لاک کیا اور مسکرا کر بولی۔ ''کیسے ہیں؟''

''مجھے کیا پتا؟'' عابر اس کے ساتھ چلتا ہوا بولا۔

''کیا مطلب......؟'' آرزو نے رُک کر پوچھا۔

''مطلب یہ کہ میں کیسا ہوں، اس کے بارے میں آپ ہی کچھ بتا سکتی ہیں، مجھے کیا معلوم کہ میں کیسا ہوں۔'' عابر ہنسا۔

''یو آر سو سویٹ!'' آرزو نے اسے ترچھی نظروں سے دیکھا۔

اور جب وہ دونوں لاؤنج میں آ گئے تو آرزو اسے صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کرنے کے بجائے کھلے دروازے کی طرف بڑھی۔ ''آیئے...... اندر آ جائیں۔''

آج پہلی بار اس نے آرزو کا بیڈ روم دیکھا۔ کمرے میں گھستے ہی دو کرسیاں پڑی تھیں، کرسیوں کے ساتھ کارنر ٹیبل، جس پر لینڈ لائن ٹیلیفون رکھا تھا اور ساتھ ایک ڈائری تھی۔ عابر کو ٹیلیفون دیکھ کر حیرت ہوئی۔ آرزو نے اس لینڈ لائن کا کبھی ذکر نہیں کیا تھا اور نہ ہی اسے نمبر دینے کی کوشش کی تھی۔

آگے بیڈ تھا جس پر گہرے نیلے رنگ کی چادر بچھی تھی۔ بیڈ کے اس طرف ڈریسنگ ٹیبل تھی جو ہر طرح کے سامان سے خالی تھی۔ ڈریسنگ کے برابر واش روم کا دروازہ اور بیڈ کے سامنے ٹیلی ویژن تھا مع ڈی وی ڈی پلیئر...... آرزو نے عابر کو کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود بیڈ پر بیٹھ گئی۔ آج اس نے ڈھیلا ڈھالا گلابی گاؤن نما لباس پہن رکھا تھا۔ آرزو نے گلاس سے ایک ہلکا سا گھونٹ بھرا۔ عابر کو مسکراتی نظروں سے دیکھا اور بولی۔ ''آج میں بہت اداس تھی، میرا جی چاہ رہا تھا میرے پاس کوئی ہو...... اپنا جیسا...... بس پھر میں

PDF BY Manzoor

نے آپ کے نام پر انگلی رکھ دی..... آپ آ گئے..... آپ کا بڑا کرم۔'' یہ کہتے ہوئے وہ گلوگیر سی ہوگئی۔

''مان دینے کا شکریہ۔'' عابر نے اس کی آنکھوں میں دیکھا جہاں اداسی بال کھول رہی تھی۔ ''آرزو صاحبہ کیا ہوا آپ کو.....؟''

''کچھ نہیں!'' اس نے مسکرانے کی کوشش کی۔ ''بس یوں ہی کبھی ڈپریشن میں آ جاتی ہوں۔''

''میری سمجھ میں ابھی تک یہ بات نہیں آئی کہ آپ ڈاکٹر ہیں، خوبصورت ہیں پھر بھی اکیلی ہیں، آخر ایسا کیوں؟'' عابر نے سوال اُٹھایا۔

''کس نے کہا میں اکیلی ہوں..... آپ ہیں نا میرے پاس!'' آرزو نے ٹالنا چاہا۔

''یہ ایک وقتی ساتھ ہے۔'' عابر نے سنجیدگی سے کہا۔ ''آپ نے شادی کیوں نہیں کی ابھی تک، یہ بتانا پسند کریں گی؟''

''کس نے کہا آپ سے میں نے شادی نہیں کی..... بابا، میں شادی شدہ ہوں، ایک بچی کی ماں ہوں۔'' آرزو نے دونوں ہاتھ میں تھامے گلاس سے پھر ایک گھونٹ بھرا۔

عابر اُس کے اِس انکشاف پر حیران رہ گیا۔ وہ کہیں سے شادی شدہ نظر نہ آتی تھی کجا ایک بچی کی اماں.....!

''کہاں ہے وہ بچی.....؟'' عابر نے پوچھا۔

''عابر صاحب، معاف کیجئے گا یہ مرد بڑے کمینے ہوتے ہیں۔'' آرزو یکدم انتہائی تلخ ہوگئی۔ ''وہ جاتے ہوئے بچی کو ساتھ لے گیا، سنا ہے وہ ملک ہی چھوڑ گیا، میری بچی ایک سال کی تھی جب مجھے طلاق ہوئی اور میری بچی مجھ سے چھنی.....! ایک طویل عرصہ ہوگیا مجھے اپنی بچی کو دیکھے ہوئے، اب تو وہ جوان ہو رہی ہوگی۔''

''جوان.....!'' عابر کو یہ بات ہضم نہ ہوئی۔

''جی عابر صاحب، اس وقت وہ بارہ تیرہ سال کی تو ہوگی، میری شادی پندرہ سال کی عمر میں ہوگئی تھی۔'' آرزو نے گلاس منہ سے لگایا۔

''اوہ..... اچھا!'' عابر بولا۔ ''اس شخص نے آپ کو طلاق کیوں دی؟''

''وہ ایک لالچی شخص تھا، اسے دولت کی ہوس تھی، میرے والدین جب اس کی ہوس پوری نہیں کر سکے تو اس نے مجھے ٹھوکر ماردی تب میں نے خود کو سنبھالا، تعلیم حاصل کی، ڈاکٹر بنی، آج میرے پاس دولت ہے، میں ساٹھ ہزار روپے اس گھر کا کرایہ ادا کرتی ہوں، اتنے بڑے گھر میں مجھے تنہا رہنا پسند ہے، میں خوش ہوں..... میں اب کبھی شادی نہیں کروں گی، مجھے شادی سے نفرت ہے۔'' آرزو نے عابر کی آنکھوں میں دیکھا پھر یکلخت اس نے اپنا موڈ بدلا، چہرے پر مسکراہٹ بکھیری۔ پھر اپنے مخصوص انداز میں ناک سکوڑی۔ ''چھی..... آپ نے یہ کیا موضوع چھیڑ دیا؟''

''سوری آرزو صاحبہ۔'' عابر کی نظریں اس گلاس پر تھیں جو آرزو نے دونوں ہاتھ میں تھام رکھا تھا۔

''سوری..... عابر صاحب۔ میں آپ کو کولڈ ڈرنک دینا بھول گئی۔'' اس نے اپنے گلاس کو خاص انداز سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''میں ابھی لاتی ہوں۔''

''بیٹھ جایئے۔'' عابر بولا۔ ''یہ بتایئے اس گلاس میں کیا ہے؟''

''ڈرنک ہے لیکن کولڈ نہیں!'' آرزو نے اسے گہری نظروں سے دیکھا پھر ہنسی اور ہنستی چلی گئی۔

''آپ ڈاکٹر ہو کر زہر پی رہی ہیں؟'' عابر نے سنجیدگی سے کہا۔

''جب تنہائی کاٹے نہ کٹے تو آدمی کیا کرے؟'' آرزو پھر سے آزردہ ہوگئی۔

''لیکن آپ تو کہتی ہیں کہ آپ کو تنہا رہنا پسند ہے؟'' عابر نے جرح کی۔

''ہاں پسند ہے۔'' آرزو کی آنکھوں میں گلابی ڈورے تیرنے لگے تھے۔ اس کی آنکھیں پہلے ہی کیا کم قیامت خیز تھیں کہ ان گلابی ڈوروں نے انہیں مزید قیامت خیز بنا دیا تھا۔ ان بند ہوتی آنکھوں کو اس نے ہلکا سا کھول کر کہا۔ ''اب میں کسی مرد کے ساتھ نہیں رہ سکتی..... لیکن تنہائی تو کاٹتی ہے، پتا نہیں آپ میری بات سمجھیں گے کہ نہیں؟''

''آپ کے گھر کے لوگ کہاں ہیں۔ ان کے ساتھ رہیں نا!'' عابر نے کہا۔

''سب مر کھپ گئے..... کوئی نہیں ہے میرا۔'' آرزو ہذیانی سی ہوگئی۔ ''پلیز چھوڑیں اس موضوع کو، کوئی اور بات کریں، میں آپ کے سامنے ہاتھ جوڑتی ہوں۔'' گلاس ہاتھ میں ہونے کی وجہ سے وہ پورے ہاتھ تو نہ جوڑ سکی البتہ اس نے اپنی انگلیاں جوڑ دیں۔

عابر نے خلافِ معمول کوئی جواب نہ دیا۔ وہ اسے یک ٹک دیکھتا رہا۔

وہ اٹھتے ہوئے بولی۔ ''میں آپ کے لیے کولڈ ڈرنک لاتی ہوں۔''

چند منٹوں کے بعد وہ آئی تو اس کے ہاتھ میں ایک گلاس تھا۔ عابر کو گلاس ہاتھ میں لیتے ہوئے ٹھنڈک کا احساس ہوا۔ کولڈ ڈرنک سفید تھی۔ ایک لمحے کو عابر کے دل میں شبہ گزرا کہ کہیں یہ کمبخت اس کے لیے کولڈ ڈرنک کے بجائے ''ڈرنک'' تو نہیں لے آئی۔ عابر نے اس گلاس کو اپنی آنکھوں کے سامنے کرتے ہوئے سوچا۔

''شبہ نہ کریں، سو فیصد کولڈ ڈرنک ہے۔'' آرزو اس کی چوری پکڑتے ہوئے مسکرا کر بولی۔ ''میں کسی کو فریب نہیں دیتی۔''

''چلیے..... میں یقین کر لیتا ہوں۔'' عابر نے یہ کہتے ہوئے ہلکا سا گھونٹ لیا۔ وہ واقعی کولڈ ڈرنک تھی۔ اس نے مطمئن ہو کر لگاتار دو گھونٹ لیے۔

آرزو نے ٹی وی آن کیا، ڈی وی ڈی منتخب کر کے پلیئر میں لگائی۔ وہ اس کی طرف سے پیٹھ موڑے قالین پر بیٹھی ڈی وی ڈی لگانے میں مصروف تھی۔ اس کی پیٹھ دیکھ کر عابر کو اس سانپ کا خیال آیا جو بقول آرزو اس کی پیٹھ پر موجود تھا۔ اچانک اس کے اندر ایک شدید خواہش جاگی لیکن مسئلہ یہ تھا کہ وہ سانپ کو کیونکر دیکھے۔ آرزو سے کسی طرح کی فرمائش کرنا انتہائی معیوب بات تھی۔

ایک انگلش رومانوی فلم لگا کر آرزو اس کے برابر والی کرسی پر آ بیٹھی اور بولی۔ ''یہ بڑی زبردست فلم ہے، میں اسے دس بارہ مرتبہ دیکھ چکی ہوں۔''

''اچھا۔'' عابر نے ٹی وی اسکرین پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔

فلم شروع ہوئی تو عابر کو یہ اندازہ لگاتے دیر نہ لگی کہ فلم کس قسم کی ہے۔ جذباتی مناظر کی بھرمار نے عابر کو بے چین کر دیا۔ وہ ایک جھٹکے سے کرسی سے اٹھا اور لاؤنج میں آ کر ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔

آرزو کو یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ عابر بیڈ روم سے اٹھ کر کیوں گیا ہے۔ اس نے دروازے پر کھڑے ہو کر عابر کو دیکھا جو صوفے پر بیٹھا پورے اطمینان سے کولڈ ڈرنک کے گھونٹ لے رہا تھا۔

آرزو نے ڈی وی ڈی پلیئر آف کر دیا اور بیڈ پر بیٹھتے ہوئے اندر سے آواز لگائی۔

''عابر اندر آ جائیں..... میں نے ڈی وی ڈی پلیئر آف کر دیا ہے۔''

عابر اس کی آواز سن کر بیڈ روم میں آ گیا اور کرسی پر بیٹھتا ہوا بولا۔ ''ایسی فلمیں دیکھ کر میرے سر میں درد ہو جاتا ہے۔''

آرزو نے کوئی جواب نہ دیا۔ چند لمحوں بعد اس کے موبائل کی گھنٹی بجنے لگی۔ اس نے ٹی وی کے اوپر رکھے ہوئے موبائل کو اٹھایا، اسکرین پر نام دیکھ کر وہ بیڈ روم سے باہر نکل گئی

PDF BY Manzoor

اور بات کرتی ہوئی کچن میں چلی گئی۔ اتنی دور کہ عابر تک اس کی آواز نہیں پہنچ سکتی تھی۔

پھر اس نے موبائل آف کر کے لاؤنج کی میز پر رکھا اور اندر آ گئی۔ ’’سوری عابر...... آپ بور تو نہیں ہوئے؟‘‘

’’نہیں۔‘‘ عابر نے گلاس خالی کر کے کارنر ٹیبل پر رکھا۔

’’اچھا یہ بتایئے آپ کھانا کس وقت کھانا پسند کریں گے؟‘‘ آرزو نے ٹیبل سے خالی گلاس اٹھاتے ہوئے کہا۔

’’جب آپ کا دل چاہے۔‘‘ عابر بولا۔

آرزو نے وال کلاک پر نظر ڈالی۔ ’’چلئے پھر آدھا گھنٹے کے بعد کھاتے ہیں، آپ اجازت دیں تو ایک چکر کچن کا لگا لوں؟ ویسے کھانا تیار ہے۔‘‘

’’آپ ایک نہیں، دو چکر لگائیں۔‘‘ عابر نے ہنس کر کہا۔

وہ گنگناتی ہوئی بیڈ روم سے نکل گئی۔ کچن سے اس کے گانے اور دیگچیوں سے ڈھکن اٹھانے اور رکھنے کی آوازیں آتی رہیں۔ عابر سوچنے لگا کہ یہ کس قسم کی لڑکی ہے پھر اسے فوراً ہی خیال آیا کہ لڑکی کہاں عورت ہے، ایک بچی کی ماں......! یہ اور بات کہ اسے عورت کہنے کو جی نہ چاہتا تھا۔ وہ کس ٹائپ کی لڑکی ہے، یہ بات وہ سمجھ نہیں پا رہا تھا لیکن اسے یہ احساس ضرور تھا کہ کہیں کوئی گڑبڑ ہے۔

کچھ دیر کے بعد وہ گنگناتی ہوئی بیڈ روم میں آ گئی۔ اسے مسکراتی آنکھوں سے دیکھا اور واش روم کے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے بولی۔ ’’ایک منٹ میں آئی۔‘‘

پھر واش روم کا دروازہ کھولنے سے پہلے گردن موڑ کر بولی۔ ’’عابر صاحب...... آپ نے میری پیٹھ پر بنے سانپ کو دیکھنے کی کبھی فرمائش نہیں کی، حیرت ہے؟‘‘

اور پھر عابر کا جواب سنے بغیر واش روم میں داخل ہوئی اور کھٹاک سے دروازہ بند کر لیا۔ تھوڑی دیر کے بعد جب وہ واش روم سے باہر آئی تو اس نے لباس تبدیل کر لیا تھا۔

اب وہ ٹراؤزر اور لمبی قمیض میں تھی۔ وہ اندر سے بالوں میں برش کرتی نکلی تھی، پھر وہ بیڈ اور ڈریسنگ ٹیبل کے درمیان کھڑی ہو کر برش کرتے ہوئے بولی۔ ’’عابر صاحب! میں سوچ رہی ہوں کہ اسپتال کی نوکری چھوڑ دوں۔‘‘

’’کیوں......؟‘‘ عابر نے پوچھا۔ اسے اس کے اس خیال پر حیرت ہوئی۔

اور جب اس کی نظر ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے پر گئی تو یہ حیرت دوچند ہو گئی۔ آرزو کا چہرہ عابر کی طرف تھا اور پیٹھ آئینے کی جانب۔ وہ بڑے اطمینان سے اپنے بالوں میں برش پھیر رہی تھی۔ عابر کو آئینے میں جو نظر آ رہا تھا، اس کے بارے میں وہ یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ ایسا اس نے دانستہ کیا تھا یا بھول سے۔

لیکن اس کی یہ بھول بڑی ’’چشم کشا‘‘ تھی۔ کھلی قمیض سے اس کی پیٹھ صاف نظر آ رہی تھی۔ اس کی پشت پر سانپ کا کوئی نشان نہ تھا، جلد صاف تھی۔ اس کا مطلب ہے کہ آرزو نے جو کچھ کہا، وہ جھوٹ کہا تھا۔ لیکن کیوں......؟

بالوں میں برش پھیرتے پھیرتے وہ رک گئی۔ عابر کی آنکھوں میں حیرت دیکھ کر اس کی چھٹی حس جاگی۔ اس نے گردن موڑ کر آئینے میں دیکھا تو اس کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ ’’او مائی گاڈ......!‘‘

اس نے برش بیڈ پر اُچھالا اور کسی چھلاوہ کی طرح چھلانگ مار کر واش روم میں گھس گئی۔

اور جب باہر آئی تو شرمندہ شرمندہ سی تھی۔ قمیض کی کھلی ہوئی زپ بند ہو چکی تھی۔

عابر نے اسے مزید شرمندہ کرنا مناسب نہ سمجھا۔ جو بات چل رہی تھی، وہ اس نے دُہرائی۔ ’’آپ اسپتال کی نوکری کیوں چھوڑنا چاہتی ہیں؟‘‘

’’ہاں!‘‘ آرزو کو جیسے سہارا ملا۔ وہ اس کو ممنون نظروں سے دیکھتی ہوئی بولی۔ ’’اسپتال کی نوکری میں بک بک بہت ہے، میں چاہ رہی ہوں کہ اپنا کلینک کھول لوں، اس طرح مجھے اپنے مشاغل کے لیے وقت بھی مل جائے گا اور وقت بے وقت اسپتال جانے سے میری جان چُھوٹ جائے گی۔‘‘

’’خیال تو برا نہیں۔ لیکن کلینک جمتے جمتے ہی جمے گا، میرا مطلب ہے وقت لگے گا۔‘‘ عابر بولا۔

’’کوئی پروا نہیں۔‘‘ آرزو نے یہ کہہ کر گھڑی پر نظر ڈالی۔ ’’آیئے لاؤنج میں چلیں، میں کچن میں کام بھی کرتی رہوں گی اور باتیں بھی۔‘‘

’’اوکے۔‘‘ عابر اس کے ساتھ بیڈ روم سے باہر نکل آیا اور صوفے پر اس طرح بیٹھا کہ وہ سامنے نظر آتی رہے۔

آرزو نے فریج کا دروازہ کھول کر کچھ چیزیں نکالیں اور مصروفِ عمل ہو گئی۔

دس پندرہ منٹ بعد اس نے میز پر کھانا لگانا شروع کر دیا۔ اس نے اچھا خاصا تکلف کر لیا تھا۔ کھانا اچھا تھا، عابر نے پوری دلچسپی اور رغبت سے کھایا۔ کھانے کے دوران وہ عابر سے اِدھر اُدھر کی بات کرتی رہی پھر اچانک اس نے ایک سوال کیا اور یہ پہلا ذاتی سوال تھا جو اس نے اب تک کی ملاقاتوں میں کیا تھا۔ اس نے پوچھا۔ ’’عابر۔ کیا آپ شادی شدہ ہیں؟‘‘

عابر نے اس اچانک سوال پر آرزو کو آنکھیں اٹھا کر دیکھا اور بولا۔ ’’جی، میں شادی شدہ تھا۔‘‘

’’واقعی......!‘‘ آرزو کو شاید اس جواب کی امید نہ تھی۔ ’’کیا آپ کی شادی بھی چودہ پندرہ سال کی عمر میں ہو گئی تھی؟‘‘ یہ کہہ کر وہ ہنسی۔

’’نہیں......اس حادثے کو زیادہ عرصہ نہیں گزرا۔‘‘ عابر نے سنجیدگی سے کہا۔

’’چلیں دفع کریں۔‘‘ آرزو نے برتن سمیٹتے ہوئے کہا۔ ’’مجھ سے غلطی ہو گئی، میں نے غلط وقت پر، غلط موضوع چھیڑ دیا، اچھا یہ بتائیں چائے پئیں گے یا کافی......؟‘‘

’’چائے۔‘‘ وہ مسکرا کر بولا۔

چائے بنانے میں آرزو نے خاصی دیر لگائی۔ اس اثنا میں اس نے کچن سے اپنے بیڈ روم کے کئی چکر لگائے۔ موبائل اس کے ہاتھ میں تھا۔ وہ بار بار موبائل فون کی اسکرین کو دیکھ رہی تھی۔

اچانک اسکرین روشن ہوئی لیکن گھنٹی نہیں بجی۔ فون سائلنٹ پر تھا۔ آرزو نے موبائل آن کر کے کان سے لگایا۔ ’’ہیلو‘‘ کہا۔ جواب میں ادھر سے کچھ سنا اور بولی۔ ’’ٹھیک ہے۔‘‘

پھر وہ تیز تیز قدموں سے کچن میں گئی اور ایک کپ چائے لے آئی۔ عابر نے ایک کپ دیکھ کر پوچھا۔ ’’اور آپ......؟‘‘

’’میں چائے نہیں پیوں گی۔‘‘ آرزو نے کچھ اس انداز سے کہا کہ عابر نے پھر کوئی سوال کرنا مناسب نہ سمجھا۔

چائے پیتے ہوئے عابر کی نظر لاؤنج کی وال کلاک پر گئی تو وہ چونکا۔ بارہ سے اوپر کا عمل تھا، اسے گھر پہنچتے پہنچتے ایک گھنٹہ لگ سکتا تھا۔ خاصی دیر ہو گئی تھی۔ وہ جلدی جلدی چائے کے گھونٹ بھرنے لگا۔

عابر کو جلدی جلدی چائے پیتے دیکھ کر آرزو نے کہا۔ ’’آرام سے...... گھر پہنچنے کی بہت جلدی ہے کیا......؟ میں آپ کو ساڑھے بارہ بجے سے پہلے نہ جانے دوں گی۔‘‘

پندرہ منٹ کا مسئلہ تھا۔ عابر نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔ ’’چلیں ٹھیک ہے۔‘‘

’’عابر صاحب۔ آپ کتنے اچھے ہیں۔‘‘ آرزو نے مسکراتے ہوئے کہا اور پھر موبائل اٹھا کر بیڈ روم میں چلی گئی۔ عابر کو یہ تو محسوس ہو رہا تھا کہ وہ بے چین ہے لیکن اس کی سرگرمی کی وجہ سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔

وہ پانچ سات منٹ کے بعد بیڈ روم سے نکلی اور پھر مسکراتی ہوئی کچن میں چلی گئی اور سنک میں پڑے برتن دھونے میں مصروف ہو گئی۔

ٹھیک ساڑھے بارہ بجے گھر کی گھنٹی بجی۔

’’او گاڈ، اس وقت کون آ گیا؟‘‘ آرزو نے کچن سے آواز لگائی۔ ’’عابر صاحب ذرا دیکھئے گا، دروازے پر کون ہے، میرا خیال ہے چوکیدار ہوگا۔‘‘

عابر یہ سوچ کر دروازے کی طرف بڑھ گیا کہ آرزو برتن دھونے میں مصروف ہے اس لیے اس نے اسے دروازے پر بھیج دیا ہے۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ آرزو کو یہ بات اچھی طرح معلوم ہے کہ دروازے پر کون ہے اسی لیے اس نے قصداً اسے دروازہ کھولنے بھیجا ہے۔

دروازہ کھولتے ہی عابر کے ہوش اڑ گئے۔ دو ہٹے کٹے بندے تیزی سے اندر آئے اور انہوں نے دائیں بائیں ہو کر بڑی پھرتی سے اسے اپنی مضبوط گرفت میں لے لیا۔

جب عابر نے نظر اٹھائی تو اپنے سامنے ایک اور شخص کو ہاتھ میں ریوالور لیے کھڑا پایا۔

’’تم عابر ہو؟‘‘ ریوالور والے شخص نے سوال کیا۔

عابر کو بڑی حیرت ہوئی کہ آنے والے اس کے نام سے بھی واقف تھے۔ ’’چھوڑیں مجھے...... کون ہیں آپ لوگ......؟‘‘ عابر نے کسمسا کر کہا۔

’’شاہ جی...... وقت ضائع نہ کریں، اس کی شکل دیکھیں، یہ عابر کے سوا کوئی اور نہیں ہو سکتا۔‘‘ اسے مضبوطی سے گرفت میں لیے بائیں جانب والے بندے نے کہا۔

’’چلو پھر......!‘‘ ریوالور والا شخص بولا۔ پھر وہ عابر سے مخاطب ہوا۔ ’’تمہیں ہمارے ساتھ چلنا ہے، فیصلہ کر لو زندہ چلو گے یا مردہ......؟‘‘

’’آپ کو ضرور کوئی غلط فہمی ہوئی ہے، اندر چل کر آرزو صاحبہ سے بات کر لیں۔‘‘ عابر نے انہیں سمجھانے کی کوشش کی۔

لیکن انہوں نے ذرہ بھر بھی سمجھنے کی کوشش نہیں کی۔ لمبے چوڑے بندوں نے اس کی بغلوں میں ہاتھ ڈال کر اوپر اٹھایا اور تیزی سے سیڑھیاں اترنے لگے، پیچھے ریوالور بردار شخص تھا۔

ان تینوں کے ہٹتے ہی ایک چوتھا آدمی نمودار ہوا، اس کے ہاتھ میں ایک خوبصورت بریف کیس تھا۔ وہ کھلے دروازے سے اندر آیا اور جیسے ہی وہ راہداری سے دائیں جانب مڑا، اسے آرزو نظر آ گئی، اس کے ہاتھ میں آدھا بھرا نازک سا گلاس تھا۔

وہ اس شخص کو دیکھ کر مسکراتی ہوئی آگے بڑھی اور بولی۔ ’’سب ٹھیک ہو گیا...... کسی نے دیکھا تو نہیں؟‘‘

’’نہیں۔ کسی نے نہیں دیکھا۔‘‘ اس نے بریف کیس میز پر رکھا۔ ’’سنیتا......! یہ بریف کیس سنبھالو، اس میں تیس لاکھ موجود ہیں، میں چلتا ہوں، دروازہ بند کر لو۔‘‘

’’سر جی...... کوئی چائے شائے......؟‘‘ آرزو نے بریف کیس پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔

’’او...... نہیں بابا......! پھر کبھی سہی۔‘‘ یہ کہہ کر وہ شخص واپس پلٹا۔

اور جب تک آرزو دروازے تک آئی، وہ شخص سیڑھیاں اُتر چکا تھا۔

چند لمحے وہ کھلے دروازے سے خالی سیڑھیاں تکتی رہی۔ پھر اس نے دروازہ بند کیا اور لاؤنج میں آ کر اس صوفے پر بیٹھ گئی جہاں کچھ دیر پہلے عابر بیٹھا تھا۔

’’مجھے معاف کر دینا عابر......!‘‘ اس نے اداس لہجے میں خود کلامی کی اور گلاس منہ سے لگا کر غٹاغٹ پیتی چلی گئی۔

☆......☆......☆

اس کا اُچھالا ہوا کوا ٹھک کر کے اس کے منہ پر پڑا اور پھر منہ سے پھسل کر صحن کے فرش پر گرا۔ یہ رانی پنکھی کی توقع کے خلاف ہوا تھا۔ ایسا وہ سوچ بھی نہ سکتی تھی کہ بگا اس کی ’’بھینٹ‘‘ کو اس کے منہ پر مار دے گا۔ اس کا مطلب ہے کہ بگا اس سے سخت ناراض ہو گیا ہے؟

اس نے کوّے کو پونچھ سے پکڑ کر اُٹھایا اور یہ سوچ کر دوبارہ آسمان کی طرف اُچھال دیا، ہو سکتا ہے ایسا کسی غلطی کی وجہ سے ہو گیا ہو۔ لیکن ایسا نہ تھا۔ کوّے کی واپسی کسی غلطی کا شاخسانہ نہ تھی۔ یہی وجہ تھی کہ آسمان کی طرف اُچھالا جانے والا کوا آسمان پر تھوکے جانے والے ’تھوک‘ کی طرح اس کے منہ پر گرا۔ اب کسی قسم کے شبہے کی کوئی گنجائش نہ رہی تھی۔

رانی پنکھی نے زمین پر پڑے کوّے کو پھر اٹھایا اور اسے لے کر باورچی خانے میں آ گئی۔ اس نے کوّے کو چولہے میں جھونک دیا اور چولہے کی آگ تیز کر دی۔ کوا آگ پر ’’چڑ چڑ‘‘ کر کے جلنے لگا۔ مائی پنکھی نے پیڑھی پر بیٹھ کر زمین پر رکھی ہنڈیا اٹھائی اور منہ سے لگا لی۔

کوّے کی ’’یخنی‘‘ پیتے ہی وہ سارا غم بھول گئی، اس کی آنکھوں میں دُھند اُترنے لگی اور دل پر ایک سرشاری سی چھانے لگی۔

رانی پنکھی باورچی خانے سے نکل کر صحن میں بچھی چارپائی پر لیٹ گئی۔ اس نے اپنا ایک ہاتھ آنکھوں پر رکھا اور پھر بھول گئی کہ وہ کہاں ہے، اسے اپنی سدھ بدھ نہ رہی۔

☆......☆......☆

جب اس کی آنکھ کھلی تو اس نے خود کو ایک گداز بستر پر پایا۔ یہ ایک آراستہ کمرا تھا۔ اس نے لیٹے لیٹے کمرے کا جائزہ لیا اور سوچا کہ وہ کہاں ہے؟

یہ اس کے گھر کا کمرا نہ تھا، یہ آرزو کا بھی بیڈ روم نہ تھا، یہ کوئی اور ہی خوبصورتی سے سجا کمرا تھا، پھر اسے جلد ہی سب یاد آ گیا کہ وہ رات کو کہاں تھا، اگرچہ کمرے کی تمام روشنیاں بجھی ہوئی تھیں لیکن پردوں کے پیچھے سے جھلکتا اُجالا اس بات کا غماز تھا کہ صبح ہو چکی ہے۔

اگر وہ اپنے گھر کے کمرے میں ہوتا تو یقین کر لیتا کہ رات گئی، بات گئی۔ لیکن یہاں تو معاملہ ہی کچھ اور تھا...... بات ابھی شروع ہوئی تھی۔

عابر کو آرزو کے گھر سے اُٹھایا گیا تھا۔ نیچے ایک اونچی سی گاڑی کی پچھلی سیٹ پر اسے دھکیلا گیا، وہ دونوں بندے اس کے دائیں بائیں بیٹھ گئے، ریوالور بردار اگلی سیٹ پر براجمان ہوا اور اس نے ہاتھ پیچھے کر کے ریوالور عابر کی پیشانی سے لگا دیا۔

ڈرائیور کی سیٹ خالی تھی، دو منٹ کے بعد ہی ایک شخص نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی اور اپنے برابر بیٹھے ہوئے شخص سے بولا۔ ’’شاہ جی......! چلیں؟‘‘

’’ہاں۔‘‘ شاہ جی نے جواب دیا اور پھر پیچھے مڑ کر بائیں جانب بیٹھے شخص کو حکم دیا۔ ’’اسے سگریٹ پلاؤ۔‘‘

اس سے پہلے کہ عابر کہتا ’’میں سگریٹ نہیں پیتا‘‘ دائیں جانب بیٹھے شخص نے اس کے منہ پر رومال رکھ دیا۔ چند لمحوں کے بعد عابر کو اپنا ہوش نہ رہا۔

آنکھ کھلی تو اس نے خود کو ایک آراستہ بیڈ روم میں پایا۔ اس کا ذہن بوجھل تھا، لگتا تھا جیسے کسی گہری نیند سے جاگا ہو۔ وہ بیڈ پر اُٹھ کر بیٹھا تو اس کے پاؤں نے دبیز قالین کو چھوا، اس نے جھک کر دیکھا تو اُسے پاس ہی چپل نظر آئے۔

ابھی وہ چپل پہن کر واش روم جانے کے لیے اُٹھ ہی رہا تھا کہ دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی اور ایک تیز خوشبو کا جھونکا آیا۔ وہ چاند چہرہ اور ستارہ آنکھوں والی دلکش عورت تھی۔ سیاہ لباس اور ملٹی کلر دوپٹے میں اس کا حسن مزید نکھر آیا تھا۔

’’آپ جاگ گئے؟‘‘ اس نے عابر کو بیڈ پر بیٹھا دیکھا تو اس کے قریب چلی آئی۔

عابر کو آرزو کے گھر سے اُٹھایا گیا تھا۔ نیچے ایک اونچی سی گاڑی کی پچھلی سیٹ پر اسے دھکیلا گیا، وہ دونوں بندے اس کے دائیں بائیں بیٹھ گئے، ریوالور بردار اگلی سیٹ پر براجمان ہوا اور اس نے ہاتھ پیچھے کر کے ریوالور عابر کی پیشانی سے لگا دیا۔

ڈرائیور کی سیٹ خالی تھی، دو منٹ کے بعد ہی ایک شخص نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی اور اپنے برابر بیٹھے ہوئے شخص سے بولا۔ ’’شاہ جی......! چلیں؟‘‘

’’ہاں۔‘‘ شاہ جی نے جواب دیا اور پھر پیچھے مڑ کر بائیں جانب بیٹھے شخص کو حکم دیا۔ ’’اسے سگریٹ پلاؤ۔‘‘

اس سے پہلے کہ عابر کہتا ’’میں سگریٹ نہیں پیتا‘‘ دائیں جانب بیٹھے شخص نے اس کے منہ پر رومال رکھ دیا۔ چند لمحوں کے بعد عابر کو اپنا ہوش نہ رہا۔

آنکھ کھلی تو اس نے خود کو ایک آراستہ بیڈ روم میں پایا۔ اس کا ذہن بوجھل تھا، لگتا تھا جیسے کسی گہری نیند سے جاگا ہو۔ وہ بیڈ پر اُٹھ کر بیٹھا تو اس کے پاؤں نے دبیز قالین کو چھوا، اس نے جھک کر دیکھا تو اُسے پاس ہی چپل نظر آئے۔

ابھی وہ چپل پہن کر واش روم جانے کے لیے اُٹھ ہی رہا تھا کہ دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی اور ایک تیز خوشبو کا جھونکا آیا۔ وہ چاند چہرہ اور ستارہ آنکھوں والی دلکش عورت تھی۔ سیاہ لباس اور ملٹی کلر دوپٹے میں اس کا حسن مزید نکھر آیا تھا۔

’’آپ جاگ گئے؟‘‘ اس نے عابر کو بیڈ پر بیٹھا دیکھا تو اس کے قریب چلی آئی۔

’’میں کہاں ہوں؟‘‘ عابر نے خوشبو بھری عورت کو ایک نظر دیکھا۔

’’آپ ایک خوبصورت بیڈ روم میں ہیں۔‘‘ یہ کہہ کر وہ ہنسی اور پھر اس نے کھڑکی سے پردے ہٹائے۔ یکدم روشنی اندر آئی۔ اس روشنی سے جہاں کمرا منور ہوا، اس دلکش عورت کے رنگ بھی روشن ہو گئے۔

وہ ایک خاص انداز میں چلتی ہوئی اس کی جانب آئی۔ ساتھ وہ بول بھی رہی تھی۔ ’’آپ شاور وغیرہ لے لیں، اتنی دیر میں میں ناشتہ بھجواتی ہوں، ناشتے میں کوئی خاص چیز پسند ہو تو بلا تکلف بتائیں، کچھ لوگ پراٹھا پسند کرتے ہیں، یہاں ہر وہ چیز مل جائے گی جس کی آپ فرمائش کریں گے۔‘‘ وہ اس کے قریب بیڈ پر بیٹھ گئی اور ہونٹ دبا کر دھیرے سے مسکرائی۔ ’’کیا آپ میرا نام جاننا چاہیں گے؟‘‘

’’جی، ضرور......‘‘ عابر نے خوشدلی سے کہا۔

’’میرا نام سوہنی ہے، سوہنی افتخار...... لیکن میں مہینوال کی سوہنی کی طرح کچ گھڑی نہیں ہوں...... مجھے آپ خوش مزاج پائیں گے...... میں اب چلتی ہوں، میرے باہر نکلتے ہی دروازہ لاک ہو جائے گا اور دروازے پر کھڑی گارڈ الرٹ ہو جائے گی، میرا خیال ہے کہ آپ نے میری بات سمجھ لی ہوگی، میرا نمبر ٹرپل سکس ہے، مجھے آپ ہر مشکل میں یاد

PDF BY Manzoor

کر سکتے ہیں۔''

دروازے کے قریب پہنچ کر اس نے پلٹ کر عابر کو دیکھا اور باہر نکل گئی۔ اس کے باہر نکلتے ہی دروازہ کھٹاک سے بند ہو گیا۔ سوہنی کی خوشبو اب بھی کمرے میں موجود تھی۔ وہ جو بھی پرفیوم استعمال کرتی تھی، اس کی خوشبو بہر حال خوشگوار تھی۔

سوہنی کے نمبر بتانے پر اسے اپنا موبائل فون یاد آیا۔ اس نے اپنی جیبوں میں موبائل فون تلاش کیا لیکن وہ کہیں نہیں ملا۔ البتہ سائیڈ ٹیبل پر ایک سرخ رنگ کا خوبصورت ٹیلیفون سیٹ ضرور موجود تھا، شاید اسی کے ذریعے سوہنی سے رابطہ کیا جا سکتا تھا۔

وہ واش روم سے نہا کر نکلا تو ٹیلیفون کی گھنٹی بج رہی تھی۔

☆.....☆.....☆

یہ خطرے کی گھنٹی تھی۔

انجو کئی بار باہر کا چکر لگا چکی تھی لیکن ہر بار رانی پنکھی کو سوتا پایا تھا، ایسا کبھی نہ ہوا تھا۔ وہ کوّے کی ''یخنی'' پی کر دوپہر ڈھلنے کے بعد بیدار ہو جاتی تھی لیکن اس وقت تو رات ہو رہی تھی۔

صحن میں اندھیرا پھیلا ہوا تھا اور رانی پنکھی آنکھوں پر ہاتھ رکھے بے سُدھ پڑی تھی، اس نے کروٹ تک نہیں لی تھی۔ انجو فکر مند ہو گئی تھی، کہیں ''بڑھیا'' چل تو نہیں بسی۔ تب اس نے چارپائی پر چھلانگ لگائی اور آنکھوں پر رکھے ہاتھ سے اپنا جسم رگڑنے لگی۔ جسم کے دباؤ سے رانی پنکھی کا ہاتھ اس کے چہرے سے ہٹ گیا لیکن وہ اب بھی بیدار نہ ہوئی۔

تب وہ رانی پنکھی کے پیروں کی طرف پلٹی اور زور زور سے اس کے پاؤں سے اپنا جسم رگڑنے لگی، پھر بھی کوئی اثر نہ ہوا تو اس نے رانی پنکھی کے پاؤں کے تلوؤں سے اپنا منہ لگایا۔ گیلی زبان لگتے ہی رانی پنکھی کی آنکھ کھل گئی، وہ فوراً اٹھ کر بیٹھ گئی۔

اس نے صحن میں اندھیرا اور انجو کو بے قرار دیکھا تو ساری صورتحال اس کی سمجھ میں آ گئی۔ وہ انجو کو کمرے میں لے گئی۔ کچھ دیر کے بعد جب وہ دونوں باہر آئیں تو انجو اس کے ساتھ انسانی روپ میں تھی۔ رانی پنکھی نے چارپائی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ''او انجو.....! تو نے مجھے اٹھایا کیوں نہیں؟''

''اماں! پتا نہیں تو کیا بیچ کر سوئی تھی، میں نے کوشش تو کئی بار کی، پر تو ٹس سے مس نہیں ہوئی۔'' انجو نے اس کے ساتھ بیٹھتے ہوئے کہا، پھر اچانک جیسے اسے کچھ یاد آیا۔ وہ پُرشوق لہجے میں بولی۔ ''اماں.....! کیا تو مجھے میرا چوتھا گھر دکھائے گی؟''

''ہاں دکھاؤں گی..... میں چاہتی ہوں تو جلدی جلدی اپنے سارے گھر دیکھ لے۔'' رانی پنکھی کے انداز میں الجھن تھی۔

''ٹھیک ہے اماں!'' انارہ اٹھتے ہوئے بولی۔ ''میں کوئلہ لے آؤں؟''

''ہاں لے آ۔'' رانی پنکھی بھی اُٹھ گئی۔

پھر اس نے انارہ سے کوئلہ لے کر سات گھر بنائے اور خود ساتویں گھر میں بیٹھ کر اس نے آواز لگائی۔ ''چل انجو۔ آ جا..... چوتھے گھر میں بیٹھ جا۔''

انارہ اس کی آواز سنتے ہی چوتھے گھر میں بیٹھ گئی اور بولی۔ ''اماں۔ بیٹھ گئی۔''

رانی پنکھی نے گلے سے چاندی کا بھاری تعویذ اتار کر مٹھی میں لیا اور کہنا چاہا۔ ''ہاں انجو! دیکھ سامنے کیا ہے؟''

لیکن رانی پنکھی کے گلے سے آواز نہ نکلی۔ اس نے گھبرا کر مٹھی کھولی اور تعویذ زمین پر پھینک دیا۔

انارہ جو اس کے حکم کی منتظر تھی، پریشان ہو کر بولی۔ ''اماں.....! کیا ہوا؟''

PDF BY Manzoor

وہ انارہ کو کیا بتاتی کہ کیا ہوا ہے۔ ایسا تو کبھی نہ ہوا تھا۔ آج یہ دوسرا واقعہ تھا جو غیر متوقع طور پر وقوع پذیر ہوا تھا۔ صبح بگا نے کو قبول نہ کیا اور اس وقت چاندی کا تعویذ یکلخت اتنا ٹھنڈا ہو گیا تھا کہ اگر رانی پنکھی اسے زمین پر نہ پھینک دیتی تو یقیناً اس کا ہاتھ جل جاتا۔

''اماں۔ کیا ہوا؟ بول نا!'' انارہ جواب نہ پا کر پریشان ہو گئی۔

''اری بتاتی ہوں...... ذرا مجھے بات سمجھ تو لینے دے!'' رانی پنکھی نے زمین پر پڑے تعویذ کو اس کی ڈوری سے پکڑ کر اٹھایا، اسے اپنی آنکھوں کے سامنے کیا، اس پر کچھ پڑھ کر پھونکا اور پھر تیزی سے اسے گھمایا اور پھر اسے زمین پر ڈال کر چھوا۔ وہ اب اتنا ٹھنڈا نہ رہا تھا کہ ہاتھ جلتا لیکن اسے مٹھی میں بند کرنا اب بھی ممکن نہ تھا۔

رانی پنکھی کو یقین ہو گیا تھا کہ یہ ''کارروائی'' بھی بگا کی طرف سے کی گئی ہے۔ اس کی ناراضی بڑھتی جا رہی تھی۔

''اماں۔ تو نے تعویذ زمین پر کیوں پھینک دیا؟'' انارہ نے اپنا سوال نئے انداز سے دہرایا۔

''انجو۔ یہ تعویذ اچانک اتنا ٹھنڈا ہو گیا تھا کہ اگر زمین پر نہ پھینکتی تو میرا ہاتھ جل جاتا۔'' رانی پنکھی نے بتایا۔

''اماں۔ کیا بات کر رہی ہے؟'' انارہ نے طنزیہ انداز میں ہنستے ہوئے کہا۔ ''گرم چیز سے ہاتھ جلتے ہوئے ضرور سنا ہے لیکن تو ٹھنڈے تعویذ سے جل رہی ہے؟''

''ہم شیطان پرستوں کو آگ بالکل نہیں جلاتی، تو دیکھتی نہیں کہ میں اُبلتے پانی میں ہاتھ ڈال دیتی ہوں، اگر جلتی آگ پر بھی ہاتھ رکھ دوں تو میرا کچھ نہ بگڑے گا۔'' رانی پنکھی نے انکشاف کیا۔ ''اسی لئے اس نے تعویذ کو انگارہ نہیں بنایا، برف بنا دیا۔''

''اماں۔ کس نے ایسا کیا؟'' انارہ نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا۔

''بگا کے علاوہ یہ کام کون کر سکتا ہے، انجو! وہ مجھ سے ناراض ہو گیا ہے۔'' رانی پنکھی نے فکرمند لہجے میں کہا۔

''اماں اس میں پریشان ہونے کی کیا بات ہے، تو اسے منا لے۔'' انارہ نے مشورہ دیا۔

''تو نہیں جانتی کہ وہ کیا چاہتا ہے؟'' رانی پنکھی نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

''مجھے تو بس اتنا ہی پتا ہے کہ وہ تیرا مجنوں ہے۔'' انارہ یہ کہہ کر ہنسی۔

''اور اب یہ جنون اتنا بڑھ گیا ہے کہ وہ بدلہ لینے پر اُتر آیا ہے۔'' رانی پنکھی نے بتایا۔

''تو تُو اس کی بات مان کیوں نہیں لیتی؟'' انارہ بولی۔

''اس کی بات ماننے کا مطلب ہے کہ جیتے جی مر جاؤں، وہ مجھے اپنی رانی بنانا چاہتا ہے۔'' رانی پنکھی نے انارہ کے سامنے کسی سہیلی کی طرح راز اُگل دیا۔

''یہ کوئی پاپ تو نہیں۔'' انارہ بولی۔ ''ویسے بھی وہ کالی دنیا کا بااثر شخص ہے، اسی نے تجھے رانی کا خطاب دلوایا، اسی نے تیرے سر پر تاج سجایا۔ پھر تو کیوں بھاگ رہی ہے؟''

''ہاں۔ انجو! تیری یہ بات ٹھیک ہے کہ اس کے مجھ پر ان گنت احسانات ہیں، وہ بچپن سے میرے ساتھ ہے، اس اَگنی پتھ پر ایک طرح سے اس نے مجھے اُنگلی پکڑ کر چلنا سکھایا ہے، ایک انسان شیطان عورت کو یہ اعزاز اسی کی بدولت ملا ہے، یہ سب اپنی جگہ درست ہے لیکن میرا مسئلہ یہ ہے کہ اگر میں اس کی رانی بن گئی تو یہ اَگنی پتھ یہیں تمام ہو جائے گا، بگا کو رانیوں کی کمی نہیں لیکن میری پرواز رک جائے گی، میرے پَر کٹ جائیں گے۔ بگا میری منزل نہیں، مجھے بڑے شیطان تک پہنچنا ہے۔'' رانی پنکھی نے بہت صاف لفظوں میں اسے سمجھایا۔

''اگر اسے رانیوں کی کمی نہیں ہے تو پھر وہ تیرے انتظار میں کیوں ہے؟'' انارہ نے سوال اٹھایا۔

''جیسا میں نے تجھے بتایا، وہ بچپن سے میرے ساتھ ہے، میں اس کی چاہت ہوں، پھر میرا انسان ہونا اس کے لیے باعثِ کشش ہے، وہ بے چارہ بھی کیا کرے، میری جوانی طوفان اٹھا دینے والی تھی، انجو تجھ میں میری تھوڑی بہت جھلک ہے۔'' رانی پنکھی یہ کہہ کر ہنسی۔

''اماں میں جانتی ہوں، تیری آنکھوں میں اب بھی بڑی کشش ہے۔ پر اماں اب تو بڑھیا ہو گئی، بگا ابھی تک تیرا کیوں دیوانہ ہے؟'' انارہ نے پوچھا۔

''انجو...... یہ شریر اس دنیا تک ہے، دنیا چھوڑتے ہی من پسند روپ مل جاتا ہے، بگا یہی تو چاہتا ہے کہ میں اس دنیا کو چھوڑ دوں، جیتے جی مر جاؤں، دنیا چھوڑتے ہی ترقی رُک جائے گی...... بگا میری منزل نہیں اسی لئے اس کی رانی بننے سے انکاری ہوں۔''

''اماں تیرے اس جھگڑے میں مجھے نہ نقصان پہنچ جائے۔'' انارہ فکرمند ہو کر بولی۔

''نہیں تجھے کچھ نہیں ہوگا۔ میں بگا کو سنبھال لوں گی، تو پریشان نہ ہو۔'' رانی پنکھی نے تعویذ کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''دیکھتی ہوں گرم ہوا کہ نہیں۔''

رانی پنکھی نے احتیاط سے چاندی کے تعویذ کو چھوا تو وہ اسے ٹھنڈا نہ لگا۔ اس نے تعویذ اٹھا کر مٹھی میں لے لیا اور پھسکڑا مار کر بیٹھتی ہوئی بولی۔ ''چل انجو۔ تیار ہو جا۔''

''اماں......! میں تیار ہوں۔'' انارہ فوراً بولی۔

''اچھا پھر سامنے دیکھ۔ بول کیا نظر آ رہا ہے؟'' رانی پنکھی نے پوچھا۔

''اماں! میرے سامنے ایک بس ہے جو مسافروں سے بھری ہوئی ہے اور سترہ اٹھارہ سال کی لڑکی بس سے اتر رہی ہے، اچھی پیاری لڑکی ہے، اس نے نیلے رنگ کی چادر اوڑھ رکھی ہے۔'' انارہ نے بتایا۔

''اس لڑکی کا نام روشنا ہے اور یہ ٹُو ہے۔'' رانی پنکھی نے بتایا۔

''اماں۔ یہ بس سے اُتر کر کہاں جا رہی ہے؟'' انارہ نے پوچھا۔

''اس کی قسمت پھوٹنے والی ہے۔'' رانی پنکھی نے جواب دیا۔

''اماں...... پھر تو اسے روک نا......! اسے برباد ہونے سے بچا۔'' انارہ نے پریشان ہو کر کہا۔

''اسے میں کیا، کوئی بھی گڑھے میں گرنے سے نہیں بچا سکتا۔ گیا وقت ہاتھ آتا نہیں، اب تو چپ چاپ دیکھتی جا اور سنتی جا۔''

انارہ نے دیکھا کہ روشنا بس سے اُتر کر ٹھیلے والوں کی طرف بڑھی۔ بس میں اس کے ماں، باپ موجود تھے، وہ ان کے ساتھ اپنے گاؤں جا رہی تھی، وہاں اس کے چچا کی بیٹی کی شادی تھی، چچازاد بہن کے ساتھ رئیسہ اس کی سہیلی بھی تھی۔ دونوں کا بچپن ساتھ گزرا تھا اس لئے وہ خوشی خوشی شادی میں شرکت کے لیے جا رہی تھی۔ یہ ایک غریب گھرانہ تھا جو گھریلو ملازماؤں کے طور پر کام کر کے زندگی کاٹتا تھا۔

روشنا کو بس سے بن کباب کا ٹھیلا نظر آیا تو اس نے اپنی ماں سے کہا۔ ''اماں! مجھے بھوک لگ رہی، میں ٹھیلے سے بند کباب لے آؤں، کیا تیرے لئے لاؤں؟''

''میرے لئے ہی نہیں، اپنے ابا کے لیے بھی لا۔'' روشنا کی ماں نے اپنی قمیص سے چھوٹا سا پرس نکال کر اسے پیسے دیتے ہوئے تاکید کی۔ ''روشنا پھرتی آ...... گاڑی مُڑنے والی ہے۔''

''اچھا اماں۔'' روشنا پیسے لیتے ہی کھڑی ہو گئی۔ بس سے اتر کر اس نے ٹھیلے کی طرف نظر کی۔

ٹھیلے والا بن کو چھری سے کاٹ رہا تھا، ایک مسافر اس کے سامنے کھڑا تھا۔ اس وقت دوپہر کا وقت تھا، سخت گرمی تھی۔ روشنا تیزی سے ٹھیلے کی طرف بڑھی۔

بس سے اترتے ہی روشنا پر دو بدقماش بندوں کی نظر پڑی۔ دونوں نے ایک دوسرے کو مسکرا کر دیکھا۔ اس مکروہ مسکراہٹ کے ساتھ ہی وہ دونوں ''ایکشن'' میں آ گئے۔ ان کے کندھوں پر رومال پڑے ہوئے تھے اور سر پر ٹوپیاں تھیں۔ شلوار قمیص میں ملبوس ان مکروہ چہروں نے کندھوں سے رومال اتار کر اپنے ہاتھ میں لے لئے اور روشنا کے دائیں بائیں کھڑے ہو گئے۔ کچھ اس طرح جیسے وہ اس کے ساتھ ہوں۔

روشنا کا آرڈر سن کر بند کباب والا اپنے کام میں مصروف ہوا۔ ان دونوں نے اپنے رومال ہوا میں لہرائے۔ کچھ اس انداز سے جیسے رومال جھاڑ رہے ہوں۔

اچانک روشنا کو اپنے چہرے پر ہوا محسوس ہوئی اور پھر چند سیکنڈ کے بعد وہ اپنے حواسوں میں نہ رہی۔ اسے گرتے دیکھ کر ان دونوں بدقماشوں نے اسے سنبھالا۔ اتنی دیر میں ایک ہائی روف گاڑی ان کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔

دروازہ کھول کر دونوں نے روشنا کو گاڑی میں ڈالا اور گاڑی ''جیٹ'' کی رفتار سے وہاں سے روانہ ہو گئی۔ اتنی دیر میں ٹھیلے والا کچھ سمجھتا، وہ گاڑی نظروں سے اوجھل ہو چکی تھی۔ یہ مشکل سے دو تین منٹ کا ''آپریشن'' تھا۔

روشنا کی ماں بس میں بیٹھی اپنی بیٹی پر نظر رکھے ہوئے تھی۔ اس نے روشنا کو ٹھیلے کی طرف بڑھتے، ٹھیلے کے سامنے رکتے دیکھا۔ اتنی دیر میں ایک گاڑی روشنا کے اور اس کے بیچ آ گئی، اسی وقت ڈرائیور نے بس کا ہارن بجا کر مسافروں کو الرٹ کیا۔ روشنا کی ماں نے ڈرائیور کو دیکھا اور سوچا کہ وہ اپنی بیٹی کے بارے میں بتائے کہ وہ بس سے باہر ہے پھر یہ سوچ کر رہ گئی کہ ابھی تو اس نے پہلا ہارن دیا ہے اور اس وقت کئی مسافر باہر ہیں، اتنی دیر میں تو روشنا ''بند کباب'' لے کر آ جائے گی۔

جب اس نے پلٹ کر ٹھیلے والے کی طرف دیکھا تو ہائی روف گاڑی وہاں سے جا چکی تھی اور روشنا ٹھیلے پر موجود نہ تھی۔ اس کا مطلب ہے کہ وہ بس کی طرف چل پڑی ہے۔ اس نے اطمینان کا سانس لیا۔ اسے اندازہ نہیں تھا کہ اس کا اطمینان لٹ چکا ہے۔

اطمینان کا سانس ان دونوں بدقماشوں نے بھی لیا تھا۔ وہ بہت خوش تھے۔ انہیں امید نہیں تھی کہ اتنی آسانی سے ان کے جال میں ''مچھلی'' پھنس جائے گی اور مچھلی بھی سنہری......!

روشنا کو انہوں نے ''فور کے'' کی چورنگی کے نزدیک ایک گوٹھ کے پختہ مکان میں پہنچایا، اسے انہوں نے اُدھیڑ عمر ملازمہ جنت بی بی کے حوالے کیا۔ اسے ہدایت کی کہ روشنا کے ہوش میں آنے کے بعد اس کا خاص خیال رکھے، اگر کوئی مسئلہ ہو تو وہ انہیں موبائل فون پر آگاہ کر دے اور یہ کہ وہ رات تک واپس آئیں گے۔

جنت بی بی جس کا نام اصل میں ''دوزخ بی بی'' ہونا چاہئے تھا، نے انہیں اطمینان دلایا کہ وہ پورے اطمینان سے جائیں، وہ لڑکی کے ہوش میں آنے کے بعد اسے سنبھال لے گی۔

ان کے جانے کے بعد جنت بی بی نے اندر سے تالا لگایا جبکہ وہ لوگ گھر کے باہر بھی تالا ڈال گئے تھے اور انہوں نے ہائی روف کے بجائے ایک اور چھوٹی گاڑی لے لی تھی۔ وہ ہائی روف کو دروازے کے نزدیک گلی میں کھڑی کر گئے تھے۔

جنت بی بی نے بیڈ پر لیٹی روشنا کے ہاتھ پاؤں سیدھے کئے اور اس کی چادر کھینچ کر ایک طرف ڈالی، اس نے لڑکی کے وجود کا جائزہ لیا۔ وہ گوری چٹی، اچھے نقوش والی لڑکی تھی، اس کا منہ زور سراپا اس کی کم عمری کی دلیل تھا، اپنے لباس سے کسی چھوٹے گھرانے کی محسوس ہو رہی تھی۔

جنت بی بی کو اندازہ تھا کہ وہ کتنی دیر میں ہوش میں آئے گی اس لیے اس نے پنکھا مزید تیز کیا اور کمرے کا دروازہ بند کر کے اسے مقفل کر دیا اور اپنے کمرے میں آ کر بیڈ پر لیٹ گئی۔ اس وقت کوئی کام نہ تھا، کھانا وہ کھا چکی تھی، بس اب آرام ہی کرنا تھا۔

وہ کچھ دیر اس نئی ''مچھلی'' کے بارے میں سوچتی رہی۔ پتا نہیں یہ کون ہے؟ اسے کہاں سے اُٹھایا گیا ہے، یہ سب اس کے ہوش میں آنے کے بعد ہی پتا چلے گا۔ سوچتے سوچتے اس کی آنکھ لگ گئی اور وہ گہری نیند میں چلی گئی۔

آنکھ اس وقت کھلی جب زور زور سے دروازہ پیٹے جانے کی آواز اس کے کانوں میں پڑی۔ حواسوں میں آئی تو اسے احساس ہوا کہ برابر والے کمرے کا دروازہ پیٹا جا رہا ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ لڑکی کو ہوش آ گیا۔ وہ فوراً اٹھی، اس نے صحن میں موجود دھوپ کا جائزہ لیا۔ دھوپ ڈھل رہی تھی۔ اس کا مطلب ہے کہ وہ خاصی دیر سوئی ہے۔

تالا کھول کر وہ غصیلے انداز سے کمرے میں داخل ہوئی اور پلٹ کر تالا لگا دیا اور چابی قمیص کے گریبان میں ڈال کر بولی۔ ''کیا ہو گیا تجھے...... کیوں شور مچا رہی ہے؟'' اس کا لہجہ انتہائی سخت تھا۔

روشنا کو ایک عورت کو کمرے میں آتے دیکھ کر کچھ اطمینان ہوا تھا۔ یہ عورت اس کی ماں کی عمر کی تھی لیکن اس کے چہرے پر ''ممتا'' کی بجائے کرختگی تھی۔ اپنے لب و لہجے اور انداز سے وہ ایک ''چنڈال'' عورت نظر آتی تھی۔

''مجھے یہاں کون لایا؟'' روشنا نے پوچھا۔

''کیا تو نہیں جانتی کہ تجھے یہاں کون لایا؟'' جنت بی بی نے اُلٹا اس سے سوال کیا۔

''نہیں، مجھے نہیں معلوم۔'' روشنا کی آنکھیں آنسوؤں سے بھرنے لگیں۔ ''مجھے بس اتنا یاد ہے کہ بس کے اڈّے پر جب ٹھیلے والے سے بند کباب لے رہی تھی تو دو بندے میرے آجو باجو آ کر کھڑے ہوئے اور انہوں نے اپنے رومال ہوا میں لہرائے بس پھر میرے سر میں دھواں سا بھر گیا اور مجھے اپنی سُدھ نہ رہی۔''

جنت بی بی اس سے کرید کرید کر سوالات کرتی رہی۔ اسے جلد ہی سب پتا چل گیا کہ یہ لڑکی کس کے ساتھ کہاں جا رہی تھی اور کس بس اسٹینڈ سے اسے اغوا کیا گیا۔

اپنی روداد سناتے ہوئے روشنا زار زار روئے جا رہی تھی۔ جنت بی بی نے بوتل سے پانی نکال کر گلاس اس کی طرف بڑھایا۔ ''لے پانی پی لے۔''

روشنا نے بمشکل دو تین گھونٹ پانی پیا اور گلاس اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولی۔ ''اماں تو مجھے جانے دے۔ دیکھ میرے ماں باپ مجھے ڈھونڈتے ہوں گے۔''

''مجھ سے ایسی کوئی بات نہ کر جسے میں پورا نہ کر سکوں۔'' اس کے آنسو دیکھ کر جنت بی بی کا لہجہ کچھ نرم ہوا۔ ''اب تو اپنے گھر والوں کو بھول جا، یہاں تو ایک دو رات کی مہمان ہے، یہ لوگ تجھے کہاں لے جائیں گے، مجھے نہیں پتا...... تجھے بھوک لگی ہوگی، چل کچھ کھا لے۔''

''نہیں...... اماں۔ میں کچھ نہیں کھاؤں گی۔''

''چل ٹھیک ہے۔ پھر میں چلتی ہوں۔ جب تجھے بھوک لگے تو آواز دے لینا۔'' یہ کہہ کر جنت بی بی دروازے کی طرف بڑھی، قمیص سے چابی نکال کر تالا کھولا۔

''اماں اتنا تو بتا دے میں اس وقت کہاں ہوں، کراچی میں یا کہیں اور......؟'' روشنا نے التجا بھرے لہجے میں کہا۔

''مجھے نہیں معلوم۔'' جنت بی بی نے یکدم اپنا لہجہ بدل کر کہا اور دروازہ کھول کر باہر نکل گئی۔

اس نے دروازے کو تالا لگایا اور کچن کی طرف بڑھ گئی۔

روشنا وقفے وقفے سے دروازہ پیٹتی رہی، روتی رہی، فریاد کرتی رہی۔ جب اس نے زیادہ پریشان کیا تو جنت بی بی نے انتہائی سخت لہجے میں کہا۔ ''میں تجھے روٹی کے سوا کچھ نہیں دے سکتی، روٹی چاہئے تو بول، اگر تو نے زیادہ پریشان کیا تو تیرے منہ پر تیزاب پھینک دوں گی۔''

روشنا یہ سن کر سہم گئی۔ اس نے پھر دروازہ نہ بجایا بس بیڈ پر بیٹھ کر زار زار روتی رہی، یہاں تک کہ رو رو کر ہلکان ہو گئی۔ اس پر نیم غشی سی طاری ہو گئی۔

پھر جب اس کی آنکھ کھلی تو کوئی ''ریچھ'' اسے دبوچے ہوئے تھا۔ صبح تک یہ وحشیانہ کھیل جاری رہا۔ دو راتیں مزید اسی عذاب میں گزریں۔

چوتھی رات کو اسے گاڑی میں ڈال کر لے جایا گیا۔ اسے نشہ آور انجکشن لگایا گیا تھا۔ روشنا کو کچھ ہوش نہ تھا کہ وہ کہاں ہے۔ اسے جہاں بٹھایا جاتا، بیٹھ جاتی، جہاں لٹایا جاتا، لیٹ جاتی۔ وہ ایک معمول بن گئی تھی۔

پھر جب اس کے حواس بحال ہوئے تو خود کو ایک کمرے میں پایا۔ جن گھروں میں وہ کام کرتی تھی، اس کمرے کو اس نے ویسا ہی پایا۔ اس نے اٹھنے کی کوشش کی تو وہ اٹھ نہ سکی، اس پر شدید نقاہت طاری تھی، اسے بھوک لگ رہی تھی۔ جانے وہ کب سے بھوکی تھی۔ اسے یہ بھی یاد نہ تھا کہ اس نے کب کھانا کھایا تھا۔

ابھی وہ کھانے کے بارے میں سوچ ہی رہی تھی کہ دروازہ کھلا۔ ایک عورت کھانے کی ٹرے لے کر اندر داخل ہوئی۔ اس نے ٹرے بیڈ پر رکھی اور بغیر کچھ کہے واپس چلی گئی۔

روشنا کھانے پر ٹوٹ پڑی۔ اس نے کھانا سیر ہو کر کھایا، دو گلاس ٹھنڈا پانی پیا اور بیڈ پر آرام سے لیٹ گئی۔ تھوڑی دیر بعد اس پر غنودگی طاری ہو گئی اور وہ گہری نیند سو گئی۔

PDF BY Manzoor

ان دونوں نے روشنا کے دام کھرے کر کے ایک ایجنٹ کے حوالے کر دیا تھا۔ یہ ایک بڑا اسمگلر تھا جو بیرون ملک عورتوں کو اسمگل کرنے کے دھندے میں ملوّث تھا۔ روشنا کو وہ کسی عرب ملک میں بھیجنا چاہتا تھا لیکن اس کے لیے کچھ وقت درکار تھا۔ پاسپورٹ، ویزا اور جعلی شوہر کا انتظام کرنا تھا۔ اس اثنا میں اس اسمگلر نے ایک سیاسی شخصیت کو جو وزیر تھا اور اس کے کام میں معاون تھا، کو روشنا کو بطور ''تحفہ'' دینے کی ٹھانی۔

اس وقت روشنا اس بااثر سیاسی شخصیت کی ایک خفیہ رہائش گاہ پر موجود تھی۔ آج یہاں پہلا دن تھا۔ وہ کھانا کھا کر گہری نیند سوئی ہوئی تھی اور اسے سوئے ہوئے خاصی دیر ہو چکی تھی۔ وہ عورت پھر کمرے میں داخل ہوئی اس نے روشنا کو اٹھایا اور اسے نہانے کے لیے واش روم بھیج دیا۔

روشنا نہا دھو کر نکلی تو اس نے ایک اور عورت کو اپنا منتظر پایا۔ اس عورت نے اپنے ساتھ لائے ہوئے جوڑوں میں سے ایک منتخب کر کے روشنا کو پہنایا اور ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے بٹھا کر اس کے بال خشک کر کے سنوارے، اس کا میک اپ کیا اور جب وہ بیوٹیشن اپنے کام سے مطمئن ہو گئی تو اپنا بیگ بند کر کے وہاں سے چلی گئی۔

کچھ دیر بعد وہی عورت اندر داخل ہوئی جس نے اسے کھانا دیا تھا، اس عورت نے روشنا کو بغور دیکھا۔ میک اپ کے بعد روشنا میں زمین آسمان کا فرق پڑ گیا تھا، وہ مزید دلکش اور حسین ہو گئی تھی۔

اس عورت نے اس کا ہاتھ پکڑا اور بولی۔ ''آؤ میرے ساتھ۔''

روشنا اس کے ساتھ کسی معمول کی طرح چل دی۔ وہ کمرے سے نکل کر لاؤنج میں آئی۔ لاؤنج سے سیڑھیاں اوپر جا رہی تھیں۔ وہ روشنا کو لے کر اوپر پہنچی۔ وہاں دو دروازے تھے، وہ عورت اسے پہلے دروازے سے لے کر اندر داخل ہوئی۔

روشنا جب اس کمرے میں داخل ہوئی تو چند لمحوں کے لیے چکرا کر رہ گئی۔

☆.....☆.....☆

گھنٹی کی آواز سن کر اس نے سرخ ٹیلیفون سیٹ کی طرف دیکھا اور پھر بیڈ پر بیٹھ کر ریسیور اٹھا لیا اور بولا۔ ''ہیلو!''

''میرا خیال ہے کہ آپ نے شاور لے لیا ہوگا، میں ناشتہ بھجوا رہی ہوں۔'' سوہنی نے بڑے نپے تلے انداز میں بات کی اور ریسیور رکھ دیا۔

پانچ منٹ کے بعد دروازے پر دستک ہوئی اور ایک قد آور لڑکی ہاتھ میں ٹرے لئے اندر داخل ہوئی۔ پہلی نظر میں وہ ایئر ہوسٹس لگی۔ اس نے جو لباس پہن رکھا تھا، وہ کسی ایئر لائن کے یونیفارم سے مشابہ تھا۔ اس ''باوردی'' لڑکی نے مسکرا کر ٹرے میز پر رکھی۔

عابر کو محسوس ہوا جیسے یہ کسی بڑے ہوٹل کا کمرا ہے۔ اس نے لڑکی سے پوچھا۔ ''یہ کیا جگہ ہے؟''

لڑکی جوٹرے رکھ کر سیدھی ہو رہی تھی، دوبارہ جھکی، گلے میں پڑا ہوا اپنا شناختی کارڈ پلٹ کر اس نے عابر کے سامنے کیا۔ کارڈ پر انگریزی میں لکھا تھا ''براہِ کرم ہم سے سوال مت کیجیے۔''

''اوکے!'' عابر نے خوش شکل لڑکی کی طرف دیکھ کر اثبات میں گردن ہلائی اور ناشتے کی طرف متوجہ ہو گیا۔

ناشتے سے فارغ ہوئے ابھی دو منٹ بھی نہیں گزرے تھے کہ چائے آ گئی۔ لڑکی نے ناشتے کے برتن سمیٹے اور نظریں جھکائے مسکراتی کمرے سے چلی گئی۔

چائے پی کر عابر بیڈ پر دراز ہو گیا۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ اسے آرزو کے گھر سے اغوا کیا گیا تھا، اغوا کرنے والے نہ صرف اس کے نام سے واقف تھے بلکہ اس کی شکل سے بھی آشنا تھے جبکہ عابر نے انہیں کبھی نہیں دیکھا تھا۔

وہ سوچ رہا تھا کہ آرزو اسے اچانک غائب پا کر پریشان ہو گئی ہوگی۔ آرزو کے بارے میں عابر کا پہلا تاثر ایک اچھی لڑکی کا تھا پھر یہ امیج دھیرے دھیرے ٹوٹتا گیا۔ جوں جوں اس سے ملاقاتیں ہوتی گئیں، اس کے چہرے سے نقاب اترتا گیا، وہ اندر سے کچھ کی کچھ نکل آئی۔ پتا نہیں وہ عابر سے کیا چاہتی تھی.....؟ عابر کچھ سمجھ سکا، کچھ نہ سمجھ سکا۔ اتنا اسے ضرور اندازہ ہو گیا کہ وہ ایک الجھی ہوئی لڑکی ہے۔ ایک پیچیدہ کردار.....!

ابھی آرزو کی ''گتھی'' نہیں سلجھی تھی کہ ایک نیا کھیل شروع ہو گیا۔

اسے اغوا کیا گیا تھا۔ یہ بات تو روز روشن کی طرح عیاں تھی لیکن اغوا کرنے والے کون تھے، ان کا مقصد کیا تھا، یہ ابھی راز تھا۔ کیا اسے تاوان کے لیے اغوا کیا گیا تھا؟ ایسی کوئی بات ابھی تک سامنے نہیں آئی تھی پھر اغوا کرنے والوں کو یہ ضرور معلوم ہوگا کہ اس کے عوض علی نثار کتنی رقم دے سکتے ہیں۔ ایک ملازم پیشہ شخص اپنے بے روزگار بیٹے کا بھلا کیا تاوان دے سکتا ہے۔ یہ اندازہ لگانا کوئی مشکل کام تو نہیں تھا۔

پھر اس کے ساتھ جو سلوک روا رکھا گیا تھا، وہ قیدیوں جیسا نہ تھا۔ اسے یہاں بطور خاص مہمان رکھا گیا تھا۔ آخر یہ لوگ اس سے کیا چاہتے تھے؟ اب اس مسئلے پر سوہنی ہی کچھ روشنی ڈال سکتی تھی لیکن وہ بھی کسی سوال کا صحیح جواب دینے سے گریزاں تھی۔

ابھی وہ انہی خیالات میں غلطاں و پیچاں تھا کہ دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی اور چند لمحوں بعد دروازہ کھلا۔ سوہنی کسی خوشبو کے جھونکے کی طرح مسکراتی ہوئی عابر کی طرف بڑھی۔

عابر اٹھ کر بیٹھ گیا۔ سوہنی چاہتی تو سامنے پڑے ہوئے صوفے پر بیٹھ سکتی تھی لیکن اس نے ایسا نہ کیا۔ وہ بے تکلفی سے بیڈ پر اس کے سامنے براجمان ہو گئی اور بڑے محبت آمیز لہجے میں بات شروع کی۔ ''آپ نے ویٹریس سے پوچھا تھا کہ یہ کیا جگہ ہے، یہی سوال آپ نے مجھ سے بھی کیا تھا کہ میں کہاں ہوں..... میں آپ کو بتاتی ہوں کہ یہ کیا جگہ ہے اور آپ کہاں ہیں، اس وقت آپ جس کمرے میں مقیم ہیں، یہ ہمارے ریسٹ ہاؤس کا وی آئی پی روم ہے، یہ ریسٹ ہاؤس ایک بڑے فارم ہاؤس کا حصہ ہے، فارم ہاؤس کے ایک جانب ڈاکٹر اعتبار کا ریسرچ انسٹیٹیوٹ ہے، ڈاکٹر اعتبار ہمہ وقت تحقیق میں مصروف رہتے ہیں، انہیں نت نئی ریسرچ کا شوق ہے، ہمارے پاس ایک چھوٹا سا زو بھی ہے، اسٹاف کے لیے ایک بڑی سی کینٹین ہے، یہاں کا سارا اسٹاف یونیفارم پہننے کا پابند ہے۔'' یہ کہہ کر وہ چند لمحوں کے لیے رکی۔

''سوہنی صاحبہ! مجھے کیوں پابند کیا گیا ہے، یہ بتانا پسند کریں گی؟'' عابر نے فوراً سوال کیا۔

''یہ بات آپ کو ڈاکٹر اعتبار بتائیں گے۔'' سوہنی بولی۔

''کیا مجھے ڈاکٹر اعتبار کے ایما پر اغوا کیا گیا ہے؟'' عابر نے پوچھا۔

''ہوتا تو یوں ہے کہ بندے کو اغوا کر کے تاوان وصول کیا جاتا ہے لیکن ہم نے آپ کے عوض تاوان لینے کے بجائے تاوان دیا ہے۔'' سوہنی نے انکشاف کیا۔

''تاوان دیا ہے؟'' عابر یہ سن کر حیرت زدہ رہ گیا۔ ''کسے دیا گیا ہے تاوان.....!''

''سنیتا کو۔'' سوہنی نے بتایا۔

''یہ سنیتا کون ہے، میں نہیں جانتا۔'' عابر بولا۔

''آپ اسے بہت اچھی طرح جانتے ہیں۔'' یہ کہہ کر اس نے اپنا موبائل آن کیا اور چند لمحوں بعد موبائل کا رخ عابر کی جانب کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ دیکھیں!''

اسکرین پر جو تصویر نظر آئی، اسے دیکھ کر عابر کو سکتہ سا ہو گیا۔ وہ پریشان ہو کر بولا۔ ''یہ تو آرزو ہے، ڈاکٹر آرزو..... ایک پینٹر۔''

PDF BY Manzoor

''پینٹر......!'' سونی تمسخرانہ انداز میں بولی۔ ''کتنی تصویریں پینٹ کیں اس نے آپ کی؟''

''ایک بھی نہیں۔ لیکن وہ پینٹ کرنا چاہ رہی تھی، اسے وقت نہیں مل رہا تھا، اسپتال کی نوکری سے وہ پریشان تھی، وہ ملازمت چھوڑ کر کلینک کھولنے کی خواہش مند تھی۔'' عابر نے بتایا۔

''وہ ڈاکٹر تھی کب جو کلینک کھولتی...... وہ ڈاکٹر ہے نا پینٹر......! اس کا اصل نام آرزو نہیں سنیتا ہے، وہ انتہائی شاطر لڑکی ہے۔''

''حیرت ہے۔'' عابر بولا۔ ''اس نے مجھے بتایا کہ وہ مطلقہ اور ایک جوان بیٹی کی ماں ہے، کیا یہ بھی غلط ہے؟'' عابر نے پوچھا۔

''ہیں......! اس نے خود کو شادی شدہ اور ایک بچی کی ماں بتایا؟'' سونی نے زوردار قہقہہ لگایا۔ ''پھر وہ واقعی بڑی فنکارہ ہے۔''

''اس کا مطلب ہے کہ بچی اور شادی سے متعلق اس نے جھوٹ بولا؟'' عابر نے کہا۔

''جی بالکل۔ وہ جھوٹ بڑے اعتماد سے بولتی ہے۔''

''وہ ڈاکٹر ہے نا پینٹر ہے۔ پھر اس کا گزارہ کس طرح ہوتا ہے، وہ ساٹھ ہزار روپے اپارٹمنٹ کا کرایہ دیتی ہے، اسے ڈرنک کی بھی عادت ہے۔''

''میں نے آپ سے کہا نا کہ ہم نے اسے آپ کا تاوان دیا ہے، پورے تیس لاکھ۔'' سونی نے مسکرا کر کہا۔ ''وہ بہت اُونچے ہاتھ مارنے کی عادی ہے، وہ اپنے خوبصورت ہونے کا پورا پورا فائدہ اُٹھاتی ہے، اس کا آنا جانا اعلیٰ سطح پر ہے، وہ دونوں ہاتھوں سے دولت سمیٹ رہی ہے، اسے اخراجات کی کیا پروا۔''

''میں ایک بار اس سے ضرور ملنے جاؤں گا، اس جھوٹی کو آئینہ دکھاؤں گا۔'' عابر کے لہجے میں غصہ تھا۔

''اب آپ اس سے کبھی نہیں مل سکیں گے، ایک ہفتے کے اندر وہ اپارٹمنٹ چھوڑ دے گی، موبائل کی سم بھی تبدیل ہو جائے گی، اب آپ اسے بھول جائیں۔''

''میرا اس سے کوئی جذباتی لگاؤ نہیں۔ بس اس کے فریب دینے پر غصہ ہے۔'' عابر نے کہا۔

''یہ دنیا ہے۔'' سونی نے فلسفہ بگھارا۔

''جو مجھے ڈھونڈ رہی ہے۔'' عابر کو اچانک ''بابا دنیا'' کا خیال آیا۔

''کیا مطلب......؟'' سونی بولی۔ ''میں سمجھی نہیں۔''

''آپ سمجھ بھی نہیں سکتیں۔'' عابر مسکرایا۔ ''ایک بات بتائیں جو لوگ مجھے اغوا کرنے آئے تھے، وہ میرے نام اور چہرے سے کیسے واقف تھے؟''

''بتا دیتی ہوں بلکہ دکھا دیتی ہوں۔'' سونی نے اپنا موبائل آن کرتے ہوئے کہا۔

سونی کے موبائل میں عابر کی وہ تمام تصویریں موجود تھیں جو آرزو نے اپنے ڈیجیٹل کیمرے سے اُتاری تھیں۔ اس کے علاوہ کچھ ویڈیو کلپس بھی تھے جن میں عابر اور آرزو کو لاؤنج میں بیٹھے دکھایا گیا تھا۔ عابر کو اپنے سوال کا جواب مل گیا تھا، اب اسے مزید کچھ پوچھنے کی ضرورت نہ رہی تھی۔

سونی نے اپنا قیمتی موبائل آف کیا، اسے بیڈ پر ڈالا اور مسکرا کر بولی۔ ''عابر صاحب! کوئی اور سوال......؟''

''اس کا مطلب ہے کہ آرزو آپ کی ایجنٹ تھی اور اس نے مجھے ٹریپ کیا تھا؟''

''وہ ہماری اب بھی ایجنٹ ہے، اس نے آپ کو ٹریپ اپنے لئے کیا تھا۔ وہ آپ پر فریفتہ ہو گئی تھی لیکن آپ کے رویے کی وجہ سے وہ کوئی فائدہ نہ اٹھا سکی، اس اثنا میں جب ہم نے آپ کو 'اوکے' کر دیا تو اس نے آپ کے دام کھرے کر لئے عابر صاحب، یہی دنیا ہے، یہاں جس کو موقع ملتا ہے، دوسرے کو بیچ کر فائدہ اٹھا لیتا ہے۔''

''چلیں آرزو یا سنیتا جو بھی اس کا نام تھا، اس نے اپنے دام کھرے کر لئے لیکن اب سوال یہ ہے کہ خریدنے والوں نے مجھے اتنے مہنگے دام کیوں خریدا ہے؟'' عابر نے پوچھا۔

''عابر صاحب۔ آپ سے یہ کس نے کہا کہ آپ کو مہنگے دام خریدا گیا ہے، آپ نہیں جانتے کہ آپ ہمارے لئے کتنے قیمتی ہیں۔'' وہ ہنسی۔

''آخر ایسا کیا ہے مجھ میں...... کچھ مجھے بھی تو پتا چلے۔''

''آپ کو ڈاکٹر اعتبار نے سلیکٹ کیا ہے۔ آپ کے بارے میں وہی کچھ بتا سکیں گے لیکن میں اتنا جانتی ہوں کہ وہ ہیرا شناس ہیں۔'' سونی نے بڑے یقین سے کہا۔

''آپ کو بھی شاید انہوں نے ہی سلیکٹ کیا ہوگا؟'' عابر مسکرایا۔

''ہاں۔ انتخاب تو میں انہی کا ہوں لیکن میں خود کو ہیرا ماننے کے لیے تیار نہیں۔''

''ہیرے کو اپنے بارے میں کب معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہیرا ہے...... ہیرے کی قدر تو جوہری ہی جانتا ہے۔'' عابر نے ہنس کر کہا۔

''ہاں۔ یہ بات تو آپ نے ٹھیک کہی۔''

''آپ ڈاکٹر اعتبار کی کون ہیں۔ میرا مطلب ہے کہ آپ یہاں کس عہدے پر فائز ہیں؟'' عابر نے سوال کیا۔

''میں ڈاکٹر اعتبار کی پرسنل سیکرٹری ہوں۔ ان کے پرسنل معاملات دیکھتی ہوں، یوں سمجھیں بڑی حد تک ان کی پرسنل ہوں، میں ان کی آدھی بیوی ہوں۔'' سونی نے یہ بات اتنے اطمینان سے کہی کہ وہ اس کی شکل دیکھتا رہ گیا۔

''میں سمجھا نہیں۔'' بالآخر اس نے پوچھا۔

''ارے بابا۔ میرا ان سے رشتہ بھی ہے، میں ان کی سالی ہوں۔'' سونی نے وضاحت کی۔

''یوں بولیں نا!'' عابر نے ہنستے ہوئے کہا۔

اتنے میں دروازے پر دستک ہوئی۔ عابر نے چونک کر سونی کو دیکھا۔

☆......☆......☆

اس کمرے میں چاروں طرف آئینے لگے ہوئے تھے، حتیٰ کہ چھت بھی آئینوں سے مزین تھی۔ کمرے کے درمیان میں ایک خوبصورت بیڈ بچھا تھا۔

ساتھ آنے والی عورت نے روشنا کو بیڈ پر بٹھا دیا اور بولی۔ ''تم یہاں بیٹھو، میں تھوڑی دیر میں آتی ہوں۔''

روشنا کی سمجھ میں نہ آیا کہ اسے سجا سنوار کر اس کمرے میں کیوں لایا گیا ہے۔ وہ جدھر بھی نظر گھماتی، ہر طرف وہ ہی وہ نظر آتی۔ چھت پر لگی لائٹس کی وجہ سے کمرا روشن تھا۔

وہ کچھ دیر تو تکیوں سے ٹیک لگائے آرام سے بیٹھی رہی پھر اُٹھ گئی۔ اس نے ٹھہر ٹھہر کر کمرے کے چاروں طرف چکر لگایا۔ آئینوں میں خود کو دیکھتی رہی۔

روشنا نے خود کو اس انداز سے کبھی نہ دیکھا تھا۔ اس کے گھر میں ایک چھوٹا سا آئینہ تھا جس میں شکل بھی اچھی طرح نظر نہ آتی تھی۔ اب جو اس نے سر سے پاؤں تک خود پر نظر ڈالی تو اس کی سج دھج اور چمکیلے چہرے نے اس پر سحر سا کر دیا۔

وہ اپنے کپڑوں، بالوں کے اسٹائل اور چہرے کے میک اپ کو مسحور کن انداز میں دیکھ رہی تھی۔ وہ حسین تو تھی لیکن میک اپ اور کپڑوں نے اس کے حسن میں چار چاند لگا دیے تھے۔ کمرے میں اس وقت وہ اکیلی تھی۔ اس نے اپنا دوپٹہ بیڈ پر پھینک دیا اور اپنے حسن کے چاندوں کو گھوم گھوم کر دیکھنے لگی۔

وہ نہیں جانتی تھی کہ ان آئینوں کے پیچھے ریوالونگ چیئر پر بیٹھا ایک مقتدر شخص اس کو بڑی دلچسپی سے دیکھ رہا ہے۔ روشنا اس کو نہیں دیکھ سکتی تھی کیونکہ یہ آئینے ایک طرف سے ٹرانسپیرنٹ تھے۔ دس پندرہ منٹ وہ روشنا کو بڑے انہماک سے ہر پہلو سے دیکھتا رہا۔ پھر اس نے مسکرا کر اپنے ہاتھ میں دبے موبائل کو آن کیا اور مطلوبہ نمبر او کے کرنے کے بعد کان سے لگا لیا۔

''ہاں بابا...... تمہاری بھجوائی ہوئی نئی کتاب پسند آئی۔'' اُدھر سے فون ریسیو کیے جانے پر وہ مقتدر شخص بولا۔ ''ٹائٹل بہت اچھا ہے، اسے پڑھنے میں کچھ وقت لگے گا بابا، سمجھ گئے نا ہماری بات......؟''

اُدھر سے ''جی سائیں، جی سائیں'' کے سوا کچھ نہ کہا گیا۔

اس شخص نے موبائل آف کیا، اسے بائیں ہاتھ میں لے کر دائیں ہاتھ سے اپنی مونچھ پر ہاتھ پھیرا، ایک نظر روشنا پر ڈالی اور کرسی سے اٹھ گیا۔

اس شخص کے خفیہ دروازے سے باہر جانے کے بعد وہ عورت آئینے والے کمرے میں داخل ہوئی اور روشنا کو اپنے ساتھ واپس لے گئی۔ روشنا یہ بات نہ جان سکی کہ اسے ''شیش محل'' میں کیوں لایا گیا اور کیوں واپس لے جایا گیا تھا۔ اگر اسے یہ پتا بھی چل جاتا کہ اس مرر روم میں اس کی نمائش ہوئی تھی تو بھی کوئی فرق نہ پڑتا۔

رات بارہ بجے کے بعد پھر اسے اوپر لے جایا گیا۔ اس مرتبہ ''شیش محل'' کے بجائے دوسرے کمرے کا دروازہ کھلا۔ اس عورت نے دروازے کے باہر لگے سوئچ بورڈ کے دو تین بٹن دبائے تو اندر روشنی ہو گئی۔

یہ ایک ایسا بیڈ روم تھا جس کی چاروں دیواروں پر گہرے نیلے رنگ کے پردے پڑے ہوئے تھے، درمیان میں ایک خوبصورت بیڈ تھا۔ کمرے میں ایک خوشگوار مہک بسی ہوئی تھی۔

''آج رات تم نے یہاں سونا ہے۔'' عورت نے کہا۔ ''اب میں صبح تمہیں لینے آؤں گی۔''

اس سے پہلے کہ روشنا کوئی سوال کرتی، وہ عورت کمرے سے چلی گئی اور دروازہ بند کر کے لاک کر دیا۔ روشنا گہرا سانس لے کر بیڈ پر بیٹھ گئی۔ اس وقت وہ ریشمی نائٹی میں تھی اور چہرے پر کوئی میک اپ نہ تھا، بال کھلے ہوئے تھے۔

چند لمحوں بعد کمرے کی لائٹیں بجھا دی گئیں۔ ان روشنیوں کے بٹن کمرے کے باہر تھے، انہیں اندر سے نہیں جلایا جا سکتا تھا۔ کمرے میں قبر جیسا اندھیرا تھا۔ یہ اور بات کہ اس قبر نما کمرے میں ایک بھاری بیڈ پڑا تھا اور خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔

وہ بیڈ پر لیٹ گئی اور نہ جانے کس وقت اس کی آنکھ لگ گئی۔

جب آنکھ کھلی تو اسے دم گھٹنے کا احساس ہوا۔

☆......☆......☆

''پریشان نہ ہوں۔'' سونی نے اسے چونکتے دیکھ کر کہا۔ ''کافی آئی ہے۔'' پھر اس نے موبائل فون اٹھا کر ''یس'' کہا اور موبائل بیڈ پر ڈال دیا۔

چند لمحوں بعد دراز قد ویٹرس ٹرے اٹھائے اندر آئی۔ اس نے سلیقے سے کافی کے برتن سجائے، سیدھے کھڑے ہو کر اس نے سونی کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

''تم جاؤ۔'' سونی بولی۔ ''میں خود نکالوں گی۔''

ویٹرس کے جانے کے بعد سونی بیڈ سے اٹھی۔ اس نے نفیس مگوں میں کیتلی سے کافی انڈیلی اور بولی۔ ''ادھر صوفے پر آئیں گے یا وہیں لاؤں؟''

''ارے آپ کیوں مجھے شرمندہ کر رہی ہیں۔'' عابر بیڈ سے اٹھتے ہوئے بولا۔ ''میں وہیں آیا جاتا ہوں۔''

تب سونی صوفے پر ہی بیٹھ گئی اور اس نے کافی کا مگ عابر کے سامنے رکھا۔

''سونی صاحبہ، میرا موبائل فون کہاں ہے؟'' عابر نے پوچھا۔

''آپ کہیں فون کرنا چاہتے ہیں؟'' سونی بولی۔

''جی...... میرے گھر والے سخت پریشان ہوں گے، میں چاہتا ہوں ان سے بات کر لوں۔''

''آپ کو نمبر یاد ہے؟'' سونی نے پوچھا۔

''جی۔'' عابر نے کافی کا گھونٹ بھرتے ہوئے کہا۔

سونی نے بیڈ پر پڑا ہوا اپنا موبائل فون اٹھایا اور کسی کو حکم دیا۔ ''موبائل فون......!''

چند منٹ کے بعد دروازے پر دستک ہوئی اور ایک دوسری لڑکی ہاتھ میں موبائل فون لئے اندر آئی۔ اس نے موبائل سونی کے حوالے کیا اور خاموشی سے واپس چلی گئی۔

''عابر صاحب! آپ گھر کے لوگوں سے کیا کہیں گے؟''

''یہی کہ مجھے اغوا کیا گیا ہے اور اغوا کرنے والے لوگ بڑے پیارے ہیں، تاوان لینے کے بجائے میرا تاوان دیا گیا ہے اور مجھے ایک وی آئی پی روم میں رکھا گیا ہے۔'' عابر نے ہنستے ہوئے کہا۔

''اس کا مطلب ہے کہ ہمیں رسوا کر کے چھوڑیں گے؟'' سونی ہنسی۔

''پھر کیا کہوں؟'' وہ بولا۔

''آپ کہیں۔ کسی دوست کے ساتھ لاہور آ گئے ہیں، گھوم گھام کر ایک دو دن میں واپس آ جائیں گے۔'' سونی نے مشورہ دیا۔ ''انہیں یہ باور کرانا ہے کہ آپ جہاں ہیں، بخیر ہیں۔ چلیں نمبر بولیں۔''

عابر نے اس کی بات سمجھ کر نمبر بتایا۔ سونی نے نمبر پنچ کر کے موبائل فون اس کے حوالے کر دیا۔

کان سے لگاتے ہی ادھر سے صائمہ کی آواز آئی۔ ''ہیلو!''

''آپی۔ میں عابر بول رہا ہوں۔''

''عابر تم تین دن سے کہاں ہو؟ امی، ابو سخت پریشان ہیں۔''

''آپی۔ میں اس وقت ایک دوست کے ساتھ لاہور میں ہوں، ایک دو دن بعد واپس آ جاؤں گا پھر آ کر تفصیل بتاؤں گا۔ امی، ابو سے کہنا کہ میں بخیر ہوں، پریشان نہ ہوں، ٹھیک ہے؟'' عابر نے بتایا۔

''ٹھیک ہے۔'' اس سے قبل کہ وہ کوئی اور بات کرتا، سونی نے اس کے ہاتھ سے موبائل فون لے لیا۔ اسی وقت دروازہ کھلا اور کوئی شخص بغیر دستک دیے اندر آیا۔

PDF BY Manzoor

اُس شخص کو دیکھتے ہی سوہنی کی پیشانی پر سلوٹیں پڑ گئیں۔ پھر فوراً ہی اس نے اپنے چہرے کا تاثر بدل لیا۔ وہ سنجیدہ ہو کر ''شاہانہ'' انداز میں بیٹھ گئی۔

آنے والا شخص سیکورٹی افسر سمندر خان تھا۔ وہ ایک لحیم شحیم جثے کا چاق و چوبند خوبرو شخص تھا۔ وہ سوہنی کے بارعب ہو کر بیٹھنے سے قطعاً متاثر نہ ہوا اور قریب آ کر بولا۔

''آپ کو صاحب نے بلایا ہے۔''

''اچھا ٹھیک ہے۔'' سوہنی نے یہ بات کچھ اس انداز میں کہی جیسے کہا ہو میں نے سن لیا، اب دفع ہو جاؤ۔

سمندر خان فوراً واپسی کے لیے مڑا اور بے تاثر چہرے کے ساتھ کمرے سے نکل گیا۔ اس کے جانے کے بعد سوہنی بھی کھڑی ہو گئی۔ اس نے عابر کی طرف مسکرا کر دیکھا، دونوں موبائل فونز اٹھائے اور بغیر کچھ کہے کمرے سے نکل گئی۔

باہر نکل کر سوہنی نے اپنا موبائل فون آن کیا اور بولی۔ ''آپ کہاں ہیں؟''

''اپنے کمرے میں۔'' اُدھر سے جواب آیا لیکن روکھے انداز میں۔

''ٹھیک ہے، میں دو منٹ میں پہنچ رہی ہوں۔'' سوہنی نے کہا اور تیز تیز چلنے لگی۔

ڈاکٹر اعتبار کے جواب سے اسے اندازہ ہو گیا کہ کوئی گڑبڑ ہو گئی ہے۔ اُسے یہ بات اچھی طرح پتا تھی کہ عابر کے کمرے میں جدید ترین کیمرا نصب تھا۔ تصویر کے ساتھ سرگوشی میں کی جانے والی گفتگو بھی صاف اور واضح انداز میں ریکارڈ کی جا سکتی تھی۔ سوہنی نے عابر سے کی گئی گفتگو کو اپنے ذہن میں ''ری وائنڈ'' کر کے دیکھا اور سنا۔ تب اسے احساس ہوا کہ کئی جگہ اس نے غیر محتاط گفتگو کی ہے لیکن وہ ایسی نہ تھی کہ اسے فوری طور پر طلب کیا جاتا۔

ڈاکٹر اعتبار رات کو کیونکہ دیر سے سوتا تھا، لہٰذا وہ دو بجے کے بعد ہی آفس آتا تھا اور ابھی بارہ بجے تھے۔ وہ سوچنے لگی کیا سمندر خان نے کوئی ''ہاتھ'' دکھایا ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جس طرح وہ سوچ رہی ہے، اس طرح کی کوئی بات نہ ہو، کوئی اور ہی ارجنٹ معاملہ ہو۔

دروازے پر کھڑے گارڈ نے اسے دیکھتے ہی دروازہ کھول دیا۔ وہ چہرے پر مسکراہٹ بکھیر کر ڈاکٹر اعتبار کے شاندار کمرے میں داخل ہوئی۔ ڈاکٹر اعتبار دائیں جانب اپنی آرام دہ کرسی پر پیچھے کی طرف جھکا نیم دراز تھا۔ وہ بغیر کچھ کہے سوہنی کو اپنی جہاندیدہ نگاہوں سے دیکھتا رہا، یہاں تک کہ سوہنی اس کے سامنے کرسی پر براجمان ہو گئی۔

ڈاکٹر اعتبار چالیس پینتالیس سال کا وجیہہ شخص تھا۔ اس کے چہرے پر معصومیت تھی جو اس کے چہرے کی نمایاں خوبی تھی۔ وہ ایک پھرتیلا شخص تھا، اس کے بائیں جانب کئی..... ٹیلیفون رکھے تھے۔ میز پر تین موبائل فون قرینے سے سجے تھے۔

''سر..... آپ نے بلایا۔'' سوہنی نے مؤدبانہ انداز میں کہا۔

''سوہنی افتخار، آپ کو کیا ہو گیا ہے۔'' ڈاکٹر اعتبار کا لہجہ اُکھڑا ہوا تھا۔

''کوئی غلطی ہو گئی سر۔'' سوہنی فکرمند ہوئی۔

''میں نے ابھی روم نو کو اسکرین پر دیکھا، یہ آپ نے کیا کیا، اس لڑکے کی گھر والوں سے کیوں بات کرا دی؟'' ڈاکٹر اعتبار نے اس پر فردِ جرم عائد کی۔

''سر..... میں نے نئی سم سے بات کرائی ہے اور وہ سم موبائل سے نکال دی۔'' سوہنی نے وضاحت کی۔

''جانتا ہوں۔'' ڈاکٹر اعتبار نے اسے دیکھا۔ ''لیکن بات کرائی کیوں.....؟''

''سر..... وہ بہت پریشان تھا۔ آپ نے اس کا خیال رکھنے کو کہا تھا۔ یہ مشکل سے ایک منٹ کی گفتگو تھی اور اس نے وہ کہا جو میں نے اسے بتایا۔'' سوہنی نے مزید وضاحت کی۔

''آپ کو مجھ سے اجازت لینا چاہئے تھی۔ آپ نہیں جانتیں کہ ہمارے ہاتھ سے ترپ کا ایک پتا نکل گیا۔'' ڈاکٹر اعتبار نے سرزنش کے انداز میں کہا۔

''سر جانے اس لڑکے میں ایسا کیا ہے کہ مہربان ہونے کو جی چاہتا ہے۔'' سوہنی نڈر انداز میں بولی۔

''مہربان یا فریفتہ.....؟'' ڈاکٹر اعتبار نے اسے تیز نگاہوں سے دیکھا۔

''پتا نہیں۔'' سوہنی نے ایک گہرا سانس لے کر کہا۔

''لیکن مجھے سب پتا چل گیا ہے۔'' ڈاکٹر اعتبار نے اپنے لہجے کو معنی خیز بنایا۔ ''میں نے اس پر تیس لاکھ روپے انویسٹ کیے ہیں، جب تک تیس لاکھ ڈالر نہ بنا لوں، مجھے چین

PDF BY Manzoor

نہیں آئے گا۔ میں آپ سے اس کی فائل واپس لے رہا ہوں۔''

''سر...... ایسا مت کیجئے...... میرے علاوہ اسے کوئی ڈیل نہ کر سکے گا۔'' سوہنی یقین سے بولی۔

''اچھا چلو...... ٹھیک ہے۔'' ڈاکٹر اعتبار کو اچانک کچھ یاد آیا، اس لئے فوراً اس نے اپنا موڈ بدلا۔ ''لیکن آئندہ ایسی کوئی غلطی نہ ہو۔''

''نہیں ہوگی۔'' سوہنی نے بغیر کسی ندامت کے کہا۔

''آج وہ لڑکیوں کے انٹرویو ہونے والے تھے۔ ان کا کیا ہوا؟'' ڈاکٹر اعتبار نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''انٹرویو چار بجے رکھا ہے، آپ کے لئے پندرہ لڑکیاں منتخب کی ہیں۔'' سوہنی نے اسے مسکراتی نظروں سے دیکھا۔

''انہیں میرے کمرے میں بھیجنے سے پہلے اچھی طرح سمجھا تو دو گی نا!'' ڈاکٹر اعتبار ہنسا۔

''جی جیجاجی...... بہت اچھی طرح۔'' سوہنی نے اس کی طرف خاص انداز سے دیکھ کر کہا۔

لیب اسسٹنٹ کی دو آسامیاں خالی تھیں۔ بی ایس سی لڑکیاں مانگی گئی تھیں۔ پچاس لڑکیوں نے درخواستیں بھجوائی تھیں، جن میں سے سوہنی نے تصویریں دیکھ کر پندرہ لڑکیاں کال کی تھیں۔ اس وقت لڑکیاں بڑے کمرے میں موجود تھیں اور سوہنی ایک ایک کر کے لڑکیوں کو اچھی طرح سمجھا کر بھیجتی جا رہی تھی۔

وہ انہیں سمجھا رہی تھی۔ ''دیکھئے۔ انٹرویو کرنے کے بعد اگر سر نے آپ کو سلیکٹ کر لیا تو وہ آپ کا ہاتھ پکڑ کر دیکھیں گے، سر بہت اچھے پامسٹ ہیں، وہ ہاتھ دیکھ کر یہ اندازہ لگائیں گے کہ آپ کو کس برانچ میں بھیجا جائے، ٹھیک ہے؟''

اب گھر سے ملازمت کے لئے آنے والی مجبور لڑکی ''ٹھیک ہے'' کے جواب میں ''جی اچھا'' نہ کہتی تو کیا کہتی۔

یہ ڈاکٹر اعتبار عجب فطرت کا آدمی تھا۔ نام اس کا اعتبار تھا لیکن انتہائی ناقابل اعتبار تھا۔ وہ بس پیسے کا دیوانہ تھا، زر پرست تھا، منٹوں میں بندے کو شیشے میں اُتارنے والا۔ کسی کو بیٹا، کسی کو بہن اور کسی کو باپ بنانے والا...... وہ انسان کو خریدنا جانتا تھا اور کسی کو سستے داموں نہیں خریدتا تھا۔ اگر بندہ پانچ لاکھ کا ہے تو وہ پچیس لاکھ ادا کرتا۔ اگر کوئی دو سو گز کے مکان پر راضی ہو سکتا تھا، وہ اسے ہزار گز کا بنگلہ عطا کرتا...... اگر کوئی بکنے کو راضی نہ ہوتا تو اس کے گرد ایسا جال بنتا کہ وہ شخص نکلنے کے لئے گھٹنے ٹیکنے پر مجبور ہو جاتا۔ اس کے نزدیک ہر شخص کی کوئی نہ کوئی قیمت تھی اور وہ اس کی قیمت سے پانچ گنا زیادہ دینے کا عادی تھا۔ وہ اسے اپنی انویسٹمنٹ سمجھتا تھا۔ ایک پر پانچ دے کر دس کمانے کا عادی تھا۔

ایک زمانے میں اسے سائیکل بھی میسر نہ تھی، اب اس کے پاس ذاتی ہیلی کاپٹر اور پلین موجود تھا۔ وہ خود کیونکہ زر پرست تھا، لہٰذا اس کی ''زر والوں'' سے دوستی تھی۔ سیاستدانوں کو وہ مٹھی میں رکھتا تھا، پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا کے کئی بڑے اس کے زر خرید تھے۔

بنیادی طور پر وہ ایک سائنسداں تھا۔ اس نے انسانی دماغ پر خاصا کام کیا تھا۔ یہ کام اس نے انسانی بہبود کے لئے نہیں بلکہ انسان کو نقصان پہنچانے کے لئے کیا تھا۔ اس کی اس منفی ریسرچ کے لئے ایک بڑا ملک اس پر ہمہ وقت ڈالر کی بارش کرنے کے لئے تیار رہتا تھا۔

ڈاکٹر اعتبار نے پورے ملک میں لیبس قائم کر رکھی تھیں، کئی اسپتال کھول رکھے تھے۔ لاہور کے نواح میں اس نے ایک بڑے فارم ہاؤس پر اپنی خفیہ سرگرمیاں جاری رکھی ہوئی تھیں۔ منفی تحقیق کے علاوہ زر والوں کے لئے ایک گوشۂ عیش مختص کر رکھا تھا۔ یہاں ''وہ لوگ'' آتے، پُرسکون وقت گزارتے اور چلے جاتے، کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوتی۔

ڈاکٹر اعتبار نے آرزو کے گھر کی ویڈیو کلپس دیکھ کر عابر کو اپنے کام کے لئے منتخب کر لیا تھا۔ ڈاکٹر اعتبار نے یادوں کے حوالے سے خاصا کام کیا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ انسان جب چاہے اپنی یادوں کو ری وائنڈ کر کے دیکھ سکتا ہے۔ وہ ایک ایسی چیز ایجاد کرنا چاہتا تھا جس کے ذریعے انسانی ذہن میں محفوظ یادوں کو ریکارڈ کر سکے اور ان ''مجرمانہ یادوں'' کے ذریعے اسے بلیک میل کر کے اپنا کام نکالا جا سکے۔ ڈاکٹر اعتبار کے اس پراجیکٹ میں ایک طاقتور ملک ضرورت سے زیادہ دلچسپی رکھتا تھا۔ اگر ڈاکٹر اعتبار کسی طرح ان ''مجرمانہ یادوں'' کی مائیکرو فلم بنانے میں کامیاب ہو جاتا تو وہ اس ٹیکنالوجی کے منہ مانگے دام وصول کر سکتا تھا۔ گزرے وقت کی مائیکرو فلم بنا کر کسی بھی شریف انسان کی ''غلطیوں'' کے ذریعے اسے بے دام غلام بنایا جا سکتا تھا۔

ڈاکٹر اعتبار کا یہ تجربہ ابھی ابتدائی اسٹیج میں تھا لیکن وہ پُر اُمید تھا کہ بہت جلد اپنے تجربے میں کامیاب ہو جائے گا۔ اس تجربے کے لئے انسانوں کی ضرورت تھی اور ڈاکٹر اعتبار کئی انسانوں کو اس تجربے کی ''بھینٹ'' چڑھا چکا تھا، کئی نوجوان اپنی یادداشت کھو چکے تھے۔

اب عابر کی باری تھی۔

☆......☆......☆

آنکھ کھلنے کے بعد روشنا کو دَم گھٹنے کا احساس ہوا۔ ذرا ہوش بحال ہوئے تو اس نے خود کو کسی کی وحشیانہ گرفت میں پایا۔ کوئی اژدھا اس کے وجود سے لپٹا اسے ڈس رہا تھا۔

کمرے میں مکمل تاریکی تھی، اتنی کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دیتا تھا۔

''کون ہو تم......؟'' روشنا نے مزاحمت کرنا چاہی۔

لیکن سوال یہ تھا کہ اگر اسے اپنی پہچان کرانا ہوتی تو اس کے مقدر کی طرح اس کمرے کو تاریک کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ وہ ''کالا چور'' تھا اور کالے چور کبھی ہاتھ آتے ہیں اور نہ ان کو کوئی شناخت کر سکتا ہے۔ سماج میں ان کی حیثیت بڑی مقتدر ہوتی ہے۔

بس پھر یہ اندھیرا کمرا روشنا کا مقدر بن گیا۔ کتنے دن گزرے کہ کتنے ماہ بیتے، روشنا کو اندازہ نہ ہو سکا۔ اس کا ذہن ہر وقت ماؤف رہتا۔ وہ بے حس سی ہو گئی تھی شاید اسے نشہ آور انجکشن دیئے جا رہے تھے۔ اُسے سوال کرنے کی عادت تھی لیکن اب وہ سوال کرنا بھول گئی تھی۔ اس مقتدر شخص کی اس خفیہ رہائش گاہ میں جو لوگ موجود تھے، وہ سب روبوٹ تھے۔ کسی کو کسی سے غرض نہ تھی، دلچسپی نہ تھی یا پھر ایک دوسرے سے خوف زدہ تھے۔

روشنا ان کی شکلیں دیکھتی رہتی تھی۔ وہاں ایک عورت تھی رُقیہ نامی...... اس کا روشنا سے زیادہ واسطہ رہتا تھا۔ کھانا، پینا، پہننا، اوڑھنا اور اس تاریک کمرے تک پہنچانا، سب کام رُقیہ ہی کرتی تھی لیکن کیا مجال کہ وہ اس سے کام کے علاوہ کوئی اور بات کرتی ہو۔

روشنا چاہتی تھی کہ اس کی زخمی روح کی کوئی فریاد سنے، وہ کسی کے سامنے چیخ چیخ کر روئے، اپنا دُکھ بیان کرے لیکن رُقیہ اس کے دُکھ سننا تو دور کی بات، اس سے بات تک نہ کرتی تھی۔

ایک دن جب روشنا کے دل پر بہت بوجھ تھا۔ اس کا دماغ پھٹا جا رہا تھا تو وہ ہاتھ جوڑ کر رُقیہ کے قدموں میں بیٹھ گئی اور انتہائی دُکھ سے بولی۔ ''کیا تمہارے پاس زہر ہے، مجھے دے دو، میں مرنا چاہتی ہوں۔''

''ایسی بات کر جو سمجھ میں آئے۔'' رُقیہ نے دو قدم پیچھے ہٹتے ہوئے بیزاری سے کہا۔

''تم کیا نہیں جانتیں...... زہر کا مطلب نہیں سمجھتیں۔'' روشنا نے سوال کیا۔

''تجھے یہاں کیا پریشانی ہے، تو اس گھر کی رانی ہے۔'' رُقیہ بولی۔

''میں رانی نہیں بننا چاہتی...... مجھے ملازمہ بنا دو، اپنے ساتھ کام پر لگا لو، خدا کے واسطے اس دوزخ بھری زندگی سے نجات دلا دو۔'' روشنا نے فریاد کی۔

''تو ایک بے وقوف لڑکی ہے، تو جیل میں ضرور ہے لیکن یاد رکھ، تو اے کلاس میں ہے۔''

''رُقیہ باجی...... ایسی اے کلاس سے موت بھلی...... تم مجھے زہر لا دو۔''

رُقیہ نے بیٹھی ہوئی روشنا کو اٹھایا اور اس کے منہ پر زوردار تھپڑ مار کر بولی۔ ''آئندہ مجھے باجی نہ کہنا۔''

تھپڑ پڑتے ہی روشنا کو اپنی ''اوقات'' یاد آ گئی۔ وہ ایسی ''رانی'' تھی جسے ایک ملازمہ، بہن ماننے کو تیار نہ تھی، وہ اسے ''باجی'' نہیں کہہ سکتی تھی۔

رُقیہ اُسے تھپڑ مار کر آرام سے کمرے سے چلی گئی۔ جب دروازہ بند ہو گیا تو وہ بیڈ پر کسی شہتیر کی طرح گری اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ وہ جو زندگی گزار رہی تھی، اس میں اس کی مرضی کا کوئی دخل نہ تھا، وہ بے بس تھی لیکن اس زندگی سے اسے گھن آنے لگی تھی۔ اسے اپنا وجود سڑی ہوئی لاش لگتا تھا، اس کے ضمیر سے تعفن اُٹھتا تھا۔ اب وہ مر جانا چاہتی تھی۔

رُقیہ نے تھپڑ مار کر اس کے دُکھ کو مزید گہرا کر دیا تھا۔ وہ چاہتی تو ''کالے چور'' سے کہہ کر اسے تھپڑ کا مزہ چکھا دیتی لیکن اسے وہ بچی لگی۔ وہ کسی ''رکھیل'' کی آخر باجی کیوں بنتی۔

اس تلخ زندگی کا زہر اس پر چڑھتا ہی جا رہا تھا۔ اُسے اپنے ماں، باپ یاد آئے۔ اپنا گھر، عزیز، رشتے دار، سہیلیاں، بچپن۔ سب اس کی نگاہوں میں گھوم گیا۔ وہ روتی رہی اور گزرے وقت کو یاد کرتی رہی۔

وہ اپنی زندگی کو ختم کرنے کا فیصلہ کر چکی تھی۔ اُسے کہیں سے زہر نہ ملے گا، اس کا اسے اچھی طرح اندازہ ہو گیا تھا۔ اسے ہر وقت قید رکھا جاتا تھا۔ اس وقت بھی رُقیہ اس کی روح پر تھپڑ مار کر اسے کمرے میں بند کر گئی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ وہ دو تین گھنٹے سے پہلے کمرے کا تالا نہ کھولے گی لہٰذا جو کچھ کرنا تھا، انہی اوقات میں کرنا تھا۔

اُس نے تکیے پر پڑے دوپٹے سے اپنے آنسو پونچھے اور ایک عزم کے ساتھ بیڈ پر اُٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ کیا کرنا ہے۔ وہ بیڈ سے اٹھی۔ اس کمرے میں ایک الماری موجود تھی جس میں اس کے کپڑے رکھے تھے۔ اس نے الماری کھول کر کئی شلواروں سے کمر بند کھینچے اور انہیں گرہ باندھ کر ایک کر لیا اور جھٹکے دے کر اس کی مضبوطی کا اندازہ کیا اور پھر بیڈ کی طرف بڑھی۔

اس نے بیڈ کے ساتھ کھڑے ہو کر پنکھے کو دیکھا جو پوری رفتار سے چل رہا تھا۔ اس نے پنکھا بند کیا۔ کرسی اٹھا کر بیڈ پر رکھی اور اس پر چڑھ کر کمر بندوں سے تیار ہونے والی رسی پنکھے پر ڈالی، رَسی کے دونوں سرے جب اس کے ہاتھ میں آ گئے تو اس نے بل دے کر اپنی گردن میں پھندا کسا اور پھر پنجوں کے بل کھڑے ہو کر دونوں ہاتھوں سے رَسی تھامی اور کرسی کو لات مار کر بیڈ سے نیچے گرا دیا اور ہاتھوں سے رسی چھوڑ دی۔

پنکھے سے جھولتی روشنا کو تڑپتے دیکھ کر انارہ نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور تڑپ کر چیخی۔ ''اماں...... بس کر۔''

رانی پنکھی نے اس کی چیخ سن کر اپنی مٹھی کھولی، جلدی جلدی کچھ پڑھا اور چوتھے گھر میں بیٹھی انارہ پر پھونک ماری۔

پھونک مارتے ہی انارہ کے سامنے سے روشنا کی خودکشی کا دلخراش منظر غائب ہو گیا۔ اس منظر نے اس کے حواس معطل کر دیئے تھے۔ اس نے گہرے سانس لے کر اپنے حواس بحال کئے۔

''چل انجو...... نکل آ چوتھے گھر سے۔'' رانی پنکھی نے چاندی کا بھاری تعویذ اپنے گلے میں ڈالا اور ساتویں گھر سے نکل آئی۔

وہ حسب معمول تھکن کی وجہ سے چارپائی پر جا لیٹی۔ انارہ چارپائی پر بیٹھ کر رانی پنکھی کی ٹانگیں دبانے لگی۔ رانی پنکھی نے اپنی آنکھوں پر ایک ہاتھ رکھ لیا اور بولی۔ ''انجو۔ دیکھ لیا تو نے اپنا چوتھا گھر؟''

PDF BY Manzoor

''ہاں۔اماں دیکھ لیا۔''انارہ نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔''پھر وہی المناک انجام.....اماں، کیا بنانے والے نے ہمیں آنسوؤں سے بنایا ہے؟''

''ہاں انجو، یونہی سمجھ لے۔''رانی پنکھی بولی۔

''اماں..... یہ بتا وہ اندھیرے میں اپنا منہ چھپا کر آنے والا شخص کون تھا؟''انارہ نے پوچھا۔

''وہ کالا چور تھا اور کالے چور کا کوئی نام نہیں ہوتا۔''رانی پنکھی نے حقیقت بیان کی۔

''ہاں اماں.....تو ٹھیک کہتی ہے۔''انارہ بولی۔

''انجو، میں چاہتی ہوں کہ تیرے بقیہ گھر جلدی جلدی تجھے دکھادوں۔ مجھے اب بگا کی طرف سے خطرہ لاحق ہوگیا ہے، وہ جانے کب کیا کر بیٹھے۔ یہ تیرے گھروں کا چکر جتنی جلد ہو سکے، پورا ہو جائے، اگر چہ مجھے گھر دکھانے میں خاصی تھکن ہو جاتی ہے لیکن اب یہ کام جلد کرنا ہوگا.....اب میں تجھے کل رات ہی پانچواں گھر دکھاؤں گی، تیار رہنا۔''

''اماں.....میں ہر وقت تیار ہوں، تو چاہے تو ابھی مجھے پانچویں گھر لے چل۔''انارہ پُر جوش ہو کر بولی۔

''اب اتنی بھی اُتاؤلی نہ ہو.....میں کل رات تجھے ضرور پانچواں گھر دکھاؤں گی۔''

''چل ٹھیک ہے اماں۔''انارہ نے کہا اور اس سے پہلے کہ رانی پنکھی اسے کمرے میں جانے کی ہدایت کرتی، انارہ خود اٹھ کھڑی ہوئی۔''اماں میں کمرے میں جاتی ہوں۔''

رانی پنکھی کی حالت اب بحال ہو چکی تھی۔ وہ اُٹھ کر چارپائی پر بیٹھ گئی۔

تب کسی نے اس کی چارپائی اُلٹ دی اور وہ دھم سے اینٹوں کے فرش پر آگری۔

☆.....☆.....☆

ابھی تک عابر کی ڈاکٹر اعتبار سے ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ یہ بات سوہنی اور ڈاکٹر اعتبار اچھی طرح جانتے تھے کہ اس فارم ہاؤس سے عابر کا واپس جانا ممکن نہ تھا۔ اس لئے سوہنی نے یہاں کے بارے میں جو معلومات عابر کو دے دی تھیں، ان کی کوئی اہمیت نہ تھی۔ یہی وجہ تھی کہ ڈاکٹر اعتبار نے سوہنی کی کوئی گرفت نہ کی تھی، اسے بس عابر کے گھر والوں سے رابطہ کرائے جانے پر غصہ تھا۔ دراصل وہ اس جذباتی مسئلے کو ترپ کے طور پر استعمال کرنا چاہتا تھا لہٰذا اس نے سوہنی کو تنبیہ کر کے آئندہ اس طرح کی حرکت سے روک دیا تھا۔

لیکن اتنا ضرور ہوا تھا کہ عابر کو قید تنہائی سے نجات مل گئی تھی۔ اب وہ کمرے سے باہر نکل سکتا تھا۔ یہ ریسٹ ہاؤس چار کمروں پر مشتمل تھا۔ برابر برابر ایک لائن میں چار کمرے تھے، ان کمروں کے سامنے برآمدہ تھا، برآمدے کے سامنے ہرا بھرا لان تھا اور اس لان کے اطراف میں باؤنڈری وال تھی۔ عابر کو اجازت تھی کہ وہ کمرے سے نکل کر لان میں چہل قدمی کر لے یا وہاں موجود کرسیوں پر شام کی چائے پی لے لیکن اس باؤنڈری وال سے باہر جانے کی اجازت نہ تھی۔ گیٹ پر سیکورٹی گارڈز موجود تھیں۔ ایک لیڈی گارڈ تو اب بھی اس کے کمرے کے دروازے پر ہمہ وقت موجود رہتی تھی۔

عابر کو اندازہ ہوا کہ ریسٹ ہاؤس کے بقیہ تین کمرے خالی تھے۔ ایک تو ان کمروں کے دروازوں پر کوئی لیڈی گارڈ موجود نہ تھی، دوسرے عابر نے ان کمروں سے کسی کو باہر نکلتے نہ دیکھا تھا۔

عابر کو اس ریسٹ ہاؤس میں کوئی تکلیف نہ تھی۔ لیکن وہ اپنے گھر والوں سے بات کرنا چاہتا تھا۔ سوہنی کو بھی اس معاملے میں کوئی مضائقہ نظر نہیں آتا تھا لیکن''باس''نے کیونکہ تنبیہ کی تھی اس لئے وہ محتاط ہو گئی تھی۔ وہ عابر کو مختلف بہانوں سے ٹال دیا کرتی تھی لیکن جب عابر زیادہ ہی مصر ہوا تو اس نے ڈاکٹر اعتبار سے بات کی۔

''جیجا جی.....عابر اپنی ماں سے بات کرنے کے لئے بے چین ہے۔ میں اب بہانے بنا بنا کے تنگ آچکی ہوں.....آپ بتائیں کیا کروں۔''

''ابھی اس کی بات نہ کرانا..... ہمارے پاس یہ ایک پاور فل ہتھیار ہے، جب تک میں تجربہ نہ کرلوں، اس وقت تک روکو۔''ڈاکٹر اعتبار نے فیصلہ سنایا۔ پھر بولا۔

''دراصل میں چاہتا ہوں کہ وہ تجربے کے لئے آمادگی ظاہر کردے، جب تک بندہ ذہنی طور پر آمادہ نہ ہو، ہمارا تجربہ کامیاب نہیں ہو سکتا۔ تم نے میری بات سمجھ لی؟''

PDF BY Manzoor

’’لیس جیجا جی……‘‘ سوہنی نے مسکراتے ہوئے کہا۔’’اب میں چلوں۔‘‘ اس نے کھڑے ہوکر ڈاکٹر اعتبار سے ہاتھ ملایا اور دروازے کی طرف بڑھی۔

’’سوہنی سنو۔‘‘ ڈاکٹر اعتبار نے آواز دی۔

’’لیس جیجا جی……‘‘ سوہنی دروازے سے لوٹ آئی۔

’’میں آج اس سے ملاقات نہ کرلوں۔‘‘ ڈاکٹر اعتبار نے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔

’’ہاں کیوں نہیں۔‘‘ سوہنی نے فوراً کہا۔’’کہاں ملیں گے؟‘‘

’’ابھی تو میں غیر رسمی ملاقات چاہتا ہوں۔ ریسٹ ہاؤس میں ہی ٹھیک رہے گی۔‘‘

’’ٹھیک ہے…… میں ارینج کردیتی ہوں۔‘‘

’’یہ بتاؤ اُسے دوا تو پابندی سے دی جارہی ہے۔‘‘ ڈاکٹر اعتبار نے پوچھا۔

’’لیس جیجا جی۔‘‘ سوہنی نے یقین سے کہا۔

’’گڈ!‘‘ ڈاکٹر اعتبار خوش ہوکر بولا۔’’تم بڑے کام کی چیز ہو۔‘‘

’’نہیں جیجا جی…… میں چیز ہوں نہ مکھن! آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ میں کون ہوں…… بس جیسی بھی ہوں، آپ کی ہوں۔‘‘ سوہنی نے ایک خاص انداز سے کہا اور ایک خاص انداز سے چلتی ہوئی کمرے سے نکل گئی۔

’’بے وقوف۔‘‘ ڈاکٹر اعتبار کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ پھر اس نے کرسی گھمائی اور ٹیلیفون آپریٹر کا نمبر ملانے لگا۔

سوہنی نے ڈاکٹر اعتبار سے ملاقات کا وقت لے لیا تھا لیکن اس نے عابر کو کچھ نہیں بتایا تھا۔ وہ آدھا گھنٹہ قبل اس کے کمرے میں آگئی تھی اور حسب عادت اس کے بیڈ پر براجمان تھی جبکہ عابر سامنے صوفے پر بیٹھا تھا۔

’’سوہنی جی…… میں آخر کب تک مہمان بنا رہوں گا۔‘‘ عابر نے مسکرا کر پوچھا۔

’’جب تک بلائے جان نہیں بن جاتے۔‘‘ سوہنی فوراً بولی۔’’ویسے آپ کو یہاں کوئی پریشانی ہے کیا؟‘‘

’’مسئلہ یہی ہے کہ کوئی پریشانی نہیں ہے۔‘‘ عابر نے کہا۔’’کھالیا، پی لیا اور سولیا…… زیادہ جی گھبرایا تو لان میں ٹہل لیا…… آخر کب تک؟‘‘

’’چلیں پھر ایسا کرتے ہیں کہ آج آپ کی ملاقات ڈاکٹر اعتبار سے کرائے دیتے ہیں۔ ان سے اپنا مسئلہ ڈسکس کرلینا۔ ہوسکتا ہے وہ کوئی حل بتادیں اور یہ بھی……‘‘ ابھی وہ بات کرہی رہی تھی کہ اس کا موبائل فون بجنا شروع ہوگیا۔ سوہنی نے بیڈ سے موبائل اٹھا کر اسکرین پر نظر ڈالی۔

موبائل فون کی رنگ بجتا بند ہوگئی، یہ مس کال تھی جس کے ذریعے سوہنی کو الرٹ کیا گیا تھا۔ ڈاکٹر اعتبار ریسٹ ہاؤس کے احاطے میں داخل ہورہا تھا۔

’’آپ بڑے خوش قسمت ہیں۔‘‘ سوہنی نے ہنستے ہوئے کہا۔’’ڈاکٹر صاحب تشریف لا رہے ہیں۔‘‘ یہ کہہ کر سوہنی دروازے کی طرف بڑھی اور اس سے پہلے کہ دروازے پر دستک ہوتی، اُس نے دروازہ کھول دیا۔

ڈاکٹر اعتبار برآمدے کی سیڑھیاں چڑھ رہا تھا، اس کے پیچھے چار لیڈی کمانڈوز تھیں۔

’’عابر صاحب۔ دروازے پر آجائیں۔‘‘ سوہنی نے مڑ کر عابر کو مخاطب کیا۔

’’جی اچھا۔‘‘ عابر تیز تیز چلتا کھلے دروازے پر پہنچا۔

اُس نے اپنے سامنے ایک معصوم صورت پُرکشش شخصیت کو پایا۔ اسے ایک نظر میں وہ اچھا لگا۔ کسی تحقیقی ادارے کے سربراہ کو ایسا ہی ہونا چاہئے۔ اس نے سوچا۔

ڈاکٹر اعتبار نے سوہنی کے ساتھ کھڑے عابر پر ایک اُچٹتی سی نظر ڈالی اور سوہنی سے مخاطب ہوکر بولا۔’’میڈم…… میں اندر آسکتا ہوں؟‘‘

’’سر…… موسٹ ویلکم!‘‘ سوہنی نے مؤدبانہ انداز میں کہا۔’’سر، یہ عابر ہیں۔‘‘

’’اوہ…… اچھا۔‘‘ ڈاکٹر اعتبار نے مسکرا کر اس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔’’کیسے ہیں آپ؟ یہاں آپ کو کوئی پریشانی تو نہیں۔‘‘

’’نہیں سر…… مجھے کوئی پریشانی نہیں۔ میڈم میرا بہت خیال رکھتی ہیں۔‘‘ عابر نے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔

چاروں لیڈی کمانڈوز دروازے پر رک گئی تھیں۔ سوہنی دروازہ بند کرکے پلٹی تو ڈاکٹر اعتبار اور عابر صوفوں پر بیٹھ چکے تھے۔ سوہنی، ڈاکٹر اعتبار کے ساتھ کچھ فاصلہ دے کر براجمان ہوگئی۔

’’مسٹر عابر…… میرا خیال ہے کہ کافی آرام ہوگیا۔ ہمیں کچھ کام کرنا چاہئے۔‘‘ ڈاکٹر اعتبار نے بات شروع کی۔

’’جی سر…… ضرور۔‘‘ عابر نے کہا۔’’میں حاضر ہوں۔‘‘

’’ہمیں ایک تجربے کے سلسلے میں آپ کی خدمات درکار ہیں۔ یہاں ہم سب سے الگ تھلگ ایک کونے میں بیٹھے انسانی فلاح بہبود کے لئے کام کررہے ہیں، ہمیں آپ جیسے نوجوانوں کی سخت ضرورت ہے جو اس نیک کام میں ہمارا ساتھ دے سکیں، ہمیں اُمید ہے کہ آپ اس سلسلے میں ہمارے بہترین معاون ثابت ہوں گے۔ اگر آپ کی معاونت سے ہم اپنے تجربے میں کامیاب ہوگئے تو آپ پر ڈالرز کی بارش کردی جائے گی، ساتھ ہی پوری فیملی کے ساتھ غیر ملکی شہریت عطا ہوگی، یوں سمجھ لیں آپ کی قسمت بدل جائے گی۔‘‘ ڈاکٹر اعتبار نے اپنی لچھے دار گفتگو سے ایسا اعتبار بٹھایا کہ عابر بے چین ہو اُٹھا۔

وہ پُرجوش انداز میں بولا۔’’سر۔ میں آپ کے ساتھ ہوں۔‘‘

’’گڈ! ہمیں آپ سے یہی اُمید تھی۔‘‘ ڈاکٹر اعتبار نے کہا۔ پھر وہ سوہنی سے مخاطب ہوکر بولا۔’’میڈم! عابر کا کوئی مسئلہ تو نہیں؟‘‘

’’سر…… یہ اپنی فیملی سے بات کرنا چاہتے ہیں، اگر آپ اجازت دیں تو……!‘‘

’’ہاں ہاں ضرور کروائیے، ہماری طرف سے اجازت ہے لیکن انہیں اتنا ضرور بتادیجئے کہ گفتگو حدود میں رہ کر کی جائے۔‘‘ ڈاکٹر اعتبار نے تنبیہ کی۔

’’جی سر…… میں بتادوں گی۔‘‘ سوہنی نے عابر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔’’ویسے مسٹر عابر بہت سمجھدار ہیں، ہم سے پورا تعاون کرتے ہیں۔‘‘

’’ویری گڈ۔‘‘ ڈاکٹر اعتبار نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ پھر اس نے عابر سے ہاتھ ملایا اور سوہنی سے مخاطب ہوکر کہا۔’’میڈم! ایسا کریں انہیں یلو کارڈ ایشو کروادیں تاکہ یہ تھوڑا سا باہر نکلیں، ریسٹ ہاؤس کی باؤنڈری وال میں گھوم گھوم کر تنگ آگئے ہوں گے۔‘‘

’’جی سر…… یہ آپ کا اچھا فیصلہ ہے۔‘‘ سوہنی نے پُرتحسین لہجے میں کہا اور عابر کو اَبرو کے اشارے سے دروازہ کھولنے کو کہا۔

عابر نے تیزی سے آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا اور ڈاکٹر اعتبار کی ان عنایات پر شکریہ ادا کیا۔ ڈاکٹر اعتبار مسکراتا ہوا کمرے سے باہر نکلا۔ اس کے باہر نکلتے ہی لیڈی کمانڈوز نے اسے اپنے دائرۂ حفاظت میں لے لیا۔

ڈاکٹر اعتبار کے جانے کے بعد سوہنی نے کمرے کا دروازہ بند کیا اور پُرجوش انداز میں اس سے ہاتھ ملاتے ہوئے بولی۔’’آپ بڑے خوش قسمت ہیں عابر! ایسا پہلی بار ہوا ہے کہ کسی آؤٹ سائیڈر کو یلو کارڈ دیا گیا ہو۔‘‘

’’یہ یلو کارڈ کیا ہے؟‘‘ عابر نے پُرتجسس لہجے میں پوچھا۔

’’اس کارڈ کے ذریعے آپ بلا روک ٹوک ریسٹ ہاؤس سے باہر جاسکیں گے، آپ کی رسائی کیفے اور زو تک ہوگی۔‘‘

ڈاکٹر اعتبار کا حکم ملتے ہی عابر کا یلو کارڈ بنادیا گیا، دو گھنٹے کے اندر یلو کارڈ عابر کو مہیا کردیا گیا۔ سوہنی ابھی عابر کے پاس کمرے میں موجود تھی کہ سیکورٹی افسر سمندر خان کارڈ اس کے حوالے کرگیا۔ زرد رنگ کے اس کارڈ پر اس کی تصویر موجود تھی۔ یہ انہی تصویروں میں سے ایک تھی جو آرزو نے اُتاری تھیں۔ کارڈ پر تصویر کے علاوہ اور کچھ درج نہ تھا، حتیٰ کہ اس کا نام تک موجود نہ تھا۔ پلاسٹک کوٹیڈ اس کارڈ کی پشت پر چند خانے بنے ہوئے تھے لیکن وہ خالی تھے۔ عابر نے اس کارڈ کو روشنی کی طرف کرکے دیکھا، کچھ نظر نہ آیا۔ کارڈ ٹرانسپیرنٹ نہ تھا۔

سوہنی نے اس کے ہاتھ سے کارڈ لے کر کسی ’’ورمالا‘‘ کی طرح اس کے گلے میں ڈال دیا اور کھلے دل سے اسے مبارک باد دی۔

کارڈ آنے سے پہلے سوہنی نے عابر کے گھر اس کی بات کرادی تھی۔ کال کرنے سے پہلے سوہنی نے ہدایت کی تھی کہ وہ بے شک جو چاہے بات کرے لیکن اصل حقائق کے بارے میں ایک لفظ نہ بولے۔ اس نے نازنین سے یہی کہا کہ وہ کسی دوست کے ساتھ ہے اور اسے جلد ہی کوئی اچھی نوکری ملنے والی ہے، وہ لوگ اس کی طرف سے بالکل فکرمند نہ ہوں، انشاء اللہ اچھی خبر سننے کو ملے گی نیز یہ کہ وہ آئندہ خود ہی رابطہ کرے گا اور جلد کرے گا۔

کارڈ ملنے کے بعد سوہنی اسے لے کر باہر نکلی۔ ریسٹ ہاؤس کے گیٹ سے نکلتے ہی عابر کو کم چوڑی پختہ سڑکیں نظر آئیں۔ راستے درختوں سے گھرے ہوئے تھے۔ یہ ایک سرسبز خوبصورت علاقہ تھا۔ کچھ دور چلنے کے بعد زو کا گیٹ نظر آگیا۔

زو کی سیر کرنے کے بعد وہ دونوں باہر آئے۔ اگرچہ یہ زو زیادہ بڑا نہ تھا لیکن نت نئے جانوروں سے بھرا پڑا تھا پھر زو کو اس قدر خوبصورت انداز میں ڈیزائن کیا گیا تھا کہ آدمی کو وہاں کی سیر بھاتی تھی۔

زو سے نکل کر دونوں گھومتے گھامتے کیفے کے سامنے جانکلے۔ سوہنی نے اُسے کافی کی پیش کش کی جو عابر نے بخوشی قبول کرلی۔ یہ کیفے اسٹاف کے لوگوں کے لئے تھا۔ ویسے بھی یہاں کسی باہر کے بندے کا گزر نہ تھا۔ کیفے کے اندر زیادہ رش نہ تھا۔ جو لڑکے، لڑکیاں اور عورتیں، مرد موجود تھے، سب یونی فارم میں تھے۔ وہ دونوں ایک میز منتخب کرکے بیٹھ گئے۔ سوہنی نے اسے ایسی جگہ بٹھایا تھا کہ وہ بآسانی باہر کا نظارہ کرسکتا تھا۔

کافی پیتے ہوئے عابر کی نظریں باہر کی بجائے کیفے کے اندرونی منظر کی طرف تھیں۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ سامنے تھوڑے سے فاصلے پر شیشے کا دروازہ تھا۔ اس دروازے کے سامنے جاکر کوئی شخص کھڑا ہوتا تو وہ خود بخود کھل جاتا اور اندر جانے والا شخص بائیں جانب مڑ کر غائب ہوجاتا۔ اس نے کئی لوگوں کو اس طرح اندر جاتے ہوئے دیکھا۔

اگلے دن اُس نے دوپہر کا کھانا حسب معمول اپنے کمرے میں کھایا اور پھر اس کا جی چاہا کہ وہ کیفے میں کافی پیئے۔ اس نے گلے میں یلو کارڈ ڈالا اور ریسٹ ہاؤس سے باہر نکل آیا۔

وہ درختوں کی چھاؤں میں چہل قدمی کرکے کیفے جا پہنچا۔ اگرچہ کیفے کے گیٹ پر سیکورٹی گارڈز موجود تھیں لیکن انہوں نے اس کے گلے میں جھولتا یلو کارڈ دیکھ کر اسے روکنے ٹوکنے کی کوشش نہ کی۔ عابر ایک احساسِ فخر کے ساتھ اندر داخل ہوا۔

کل وہ سوہنی کے ساتھ جس گوشے میں بیٹھا تھا، وہ آج بھی خالی تھا۔ عابر وہاں ایک میز کے سامنے بیٹھ گیا۔ کیفے کی تزئین و آرائش اور اس کے فرنیچر سے حسن جھلکتا تھا۔ عابر نے اب تک یہاں کی جتنی چیزیں دیکھی تھیں، ان سے جدید طرز اور خوبصورتی کا احساس اُجاگر ہوتا تھا۔

کافی بہت اچھی تھی۔ سرو کرنے والی ویٹرس بھی بُری نہ تھی۔ کافی پیتے ہوئے آج پھر عابر کی نظر اس دروازے پر تھی جس سے اِکا دُکا لوگ اندر جارہے تھے لیکن واپس کوئی نہیں آرہا تھا۔ عابر نے سوچا کہ وہ ذرا اندر جاکر دیکھے کہ وہاں کیا ہے۔

کافی پینے کے بعد تجسس کے مارے عابر نے شیشے کے دروازے کی طرف رُخ کیا۔ اس دروازے پر کوئی محافظ موجود نہ تھی۔ جب وہ شیشے کے دروازے کے نزدیک پہنچا تو اسے بائیں جانب ایک راستہ نظر آیا، بقیہ دو طرف دیواریں تھیں۔

عابر دروازے کے سامنے جاکھڑا ہوا اور دروازہ کھلنے کا انتظار کرنے لگا لیکن دروازہ نہ کھلا البتہ پیچھے سے نسوانی لیکن سخت آواز آئی۔’’آپ کون ہیں؟‘‘

عابر نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو تین لیڈی کمانڈوز اس کی طرف ہتھیار اُٹھائے ہوئے تھیں۔ دو لیڈی کمانڈوز نے بہت تیزی سے اسے اپنی تحویل میں لیا جبکہ تیسری کے دروازے کے سامنے کھڑے ہوتے ہی دروازہ کھل گیا۔

’’چلیں اندر……؟‘‘ ان میں سے ایک نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔

عابر ان کے جدید ہتھیاروں کی زد پر تھا۔ اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ ان کے حکم کی تعمیل کرے۔

☆……☆……☆

رانی پنکھی کے فرش پر گرتے ہی چارپائی اس کے سر پر آرہی۔ اُس نے پٹی پکڑ کر چارپائی کو پرے دھکیلا اور اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔ وہ شدید غصے میں آگئی تھی۔ اس نے چاروں طرف دیکھا، کوئی نظر نہ آیا پھر اوپر نظر اٹھائی تو اسے سفید چمکتے ہوئے دھوئیں کی ایک لکیر سی نظر آئی۔

’’بگا!‘‘ اس کے منہ سے بے اختیار نکلا۔’’یہ تو ہے؟‘‘

جواب میں بھیانک قہقہہ سنائی دیا اور خاموشی چھاگئی۔

رانی پنکھی نے اپنے غصے کو ضبط کرتے ہوئے دوبارہ چارپائی بچھائی اور اس پر براجمان ہوگئی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ اس طرح وہ اسے پریشان کردے گا۔ اگر وہ یونہی اسے پریشان کرتا اور کام میں رُکاوٹ ڈالتا رہا تو وہ عاجز ہوجائے گی۔ بگا شاید چاہتا بھی یہی ہے کہ وہ مجبور ہوکر اس کی رانی بننے کے لئے راضی ہوجائے لیکن وہ بھی ایک ہٹیلی تھی۔ اس نے طے کرلیا تھا کہ چاہے کچھ ہوجائے، وہ اس کی رانی نہیں بنے گی۔ وہ سوچتی رہی کہ اس سے نجات کے لئے کیا راستہ اختیار کیا جائے۔ بالآخر اس نے بڑے شیطان تک رسائی کا فیصلہ کرلیا۔ بڑے شیطان تک رسائی اتنی آسان نہ تھی، اس کے لئے اسے ایک جان لیوا عمل کرنا تھا۔

وہ چاہتی تھی کہ اس عمل سے پہلے وہ انارہ کو اس کے سارے گھر دکھادے اور اس پر وہ راز بھی کھول دے جو وہ اب تک چھپائے ہوئے تھی۔ لہٰذا اُس نے وعدے کے مطابق اگلی رات کو پانچواں گھر دکھانے کی ٹھان لی۔

رات ہوتے ہی اس نے تیاریاں شروع کردیں۔ اب تک تو اس کا کوئی دشمن نہ تھا۔ لہٰذا وہ پورے اطمینان سے انارہ کو اس کے گھر دکھارہی تھی لیکن اب خطرہ پیدا ہوگیا تھا۔ اس لئے اس نے بھی کمر کس لی تھی۔ اب وہ غفلت میں شکار ہونے کے لئے راضی نہیں تھی۔

رات کو مقررہ وقت پر رانی پنکھی نے انارہ کو پانچویں گھر میں بٹھایا اور چاندی کا بھاری تعویذ گلے سے اُتار کر مٹھی میں دبایا اور بولی۔’’ہاں، انجو کیا تو تیار ہے؟‘‘

’’ہاں اماں۔ میں تیار ہوں۔‘‘

رانی پنکھی نے جلدی جلدی کچھ پڑھا اور انارہ کی طرف پھونک مار کر کہا۔’’چل انجو دیکھ، سامنے کیا ہے؟‘‘

’’اماں…… سامنے گھور اندھیرا ہے۔‘‘ انارہ نے کہا۔

’’تیری آنکھیں کھلی ہیں کیا؟‘‘ رانی پنکھی نے غصے سے پوچھا۔

’’نہیں اماں…… میری آنکھیں بند ہیں۔‘‘

’’اب بتا کیا ہے سامنے؟‘‘

انارہ نے جب یہ بتایا کہ وہ کیا دیکھ رہی ہے تو یہ سن کر رانی پنکھی کی سٹی گم ہوگئی۔

PDF BY Manzoor

بات ہی ٹی گم ہونے والی تھی۔

انارہ نے کہا تھا۔ ''اماں، مجھے چمکیلے دھویں کا ایک ہیولا سا نظر آ رہا ہے۔''

رانی پنکھی نے یہ سن کر فوراً ہدایت کی۔ ''انجو...... اپنی آنکھیں کھول دے۔''

انارہ نے آنکھیں کھولنے میں ایک لمحہ بھی ضائع نہ کیا۔ وہ آنکھیں کھول کر بولی۔ ''اماں، میں نے آنکھیں کھول دیں۔''

''اب تجھے کیا نظر آ رہا ہے۔'' رانی پنکھی نے فکرمندی سے کہا۔

''اماں، اب تو نظر آ رہی ہے دھندلی سی۔'' انارہ نے سامنے بیٹھی رانی پنکھی کو بغور دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اماں، یہ کیا تھا جو میں نے دیکھا۔''

''یہ بگا تھا۔'' رانی پنکھی نے اُلجھے ہوئے لہجے میں کہا۔

''اماں...... یہ کیا چاہتا ہے۔''

''پریشان کرنا چاہتا ہے۔'' رانی پنکھی برہم ہو کر بولی۔ ''میرے کام میں رکاوٹ ڈال کر مجھے عاجز کرنا چاہتا ہے...... لیکن شاید وہ یہ نہیں جانتا کہ میں ہار ماننے والی نہیں۔ وہ اس طرح کے اوچھے ہتھکنڈوں سے مجھے جیت نہیں سکتا۔''

''اماں...... میرے پانچویں گھر کا کیا ہوگا؟'' انارہ فکرمند ہوئی۔

''ذرا انتظار کر۔'' رانی پنکھی بولی۔ ''تو پانچویں گھر میں بیٹھی رہ۔ میں دیکھتی ہوں۔''

''ٹھیک ہے اماں۔'' انارہ جو پانچویں گھر سے اٹھنے کی تیاری کر رہی تھی، اطمینان سے بیٹھ گئی۔

رانی پنکھی نے چاندی کا تعویذ اپنے گلے میں ڈالا اور کچھ سوچ کر ساتویں گھر سے اٹھ گئی اور کمرے کے دروازے کی طرف بڑھی۔

رانی پنکھی کو کمرے کی طرف جاتے دیکھ کر انارہ بولی۔ ''اماں تو کہاں جا رہی ہے۔''

''میں اندر جا رہی ہوں۔ ابھی آئی تو آرام سے بیٹھ۔'' یہ کہہ کر رانی پنکھی کمرے کے دروازے میں داخل ہوگئی۔

اندر دو کمرے تھے۔ ایک کمرے میں انارہ کی رہائش تھی جبکہ دوسرے کمرے میں رانی پنکھی کا سامان پڑا تھا۔ وہ کمرے میں کسی ضرورت سے ہی آتی تھی، ورنہ سارا دن صحن میں پڑی چارپائی پر گزارتی تھی۔ رات بھی اس کی صحن میں گزرتی تھی۔ کمرے میں الم غلم سامان بھرا تھا۔ دیوار میں بنی الماری میں اس کے کچھ کپڑے رکھے تھے۔

اُسے معلوم تھا کہ سوئی کہاں رکھی ہے۔ اُس نے کالے دھاگے کی گُتی سے سوئی نکالی اور باہر آ گئی۔ پھر اس نے چارپائی پر کھڑے ہو کر نیم کے پتے توڑے اور واپس ساتویں گھر میں آ گئی اور اپنے خاص انداز میں پھسکڑا مار کر بیٹھ گئی

اُس نے سوئی دائیں ہاتھ میں پکڑی اور بائیں ہاتھ کی پہلی انگلی پر ماری۔ انگلی میں سوئی گھستے ہی رانی پنکھی کے منہ سے بے اختیار ''سی'' کی آواز نکلی۔ اس نے جلدی سے سوئی لہنگے میں ٹانک کر بائیں ہاتھ کی انگلی کو پکڑ کر دبایا۔

جب خون باہر آ گیا تو اس نے خون کی اس بوند کو نیم کی پتی پر منتقل کر لیا اور خون لگی پتی کو دوسری پتیوں کے اوپر رکھ دیا۔ اس کے بعد اس نے بڑبڑانے کے انداز میں بولنا شروع کیا۔

انارہ کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ رانی پنکھی کیا کر رہی ہے۔ اس کے منہ سے تکلیف زدہ آواز سن کر وہ چونکی ضرور تھی لیکن انارہ اس سے کچھ پوچھ نہ پائی۔ اب وہ جانے کیا بڑبڑا رہی تھی اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ کوئی ایک لفظ خاص انداز میں بار بار دہرا رہی ہو۔

بولتے بولتے اچانک رانی پنکھی کی نظر نیم کی پتیوں پر پڑی تو اُسے وہاں پتیاں نظر نہ آئیں۔ رانی پنکھی نے گہرا سانس لے کر ''جاپ'' بند کر دیا اور گلے سے چاندی کا تعویذ اتار کر مٹھی میں لے لیا اور مٹھی کو دبا کر بولی۔ ''ہاں، انجو چل تیار ہو جا۔''

''اماں میں کب کی تیار بیٹھی ہوں۔'' انارہ نے کہا۔

''چل پھر اپنی آنکھیں بند کر۔'' رانی پنکھی نے ہدایت کی۔

''کر لیں اماں۔'' انارہ کی آواز آئی۔

''اب دیکھ انجو...... سامنے کیا نظر آ رہا ہے۔'' رانی پنکھی انجو کی طرف پھونک مارتے ہوئے بولی۔

''اماں...... میں دس بارہ سال کا لڑکا دیکھ رہی ہوں، جو دولہاؤں جیسے کپڑے پہنے ہوئے ہے۔ گول مٹول معصوم سا ہے۔'' انارہ نے بتایا۔

''یہ اصل دولہا ہے۔'' رانی پنکھی نے انکشاف کیا۔ وہ خوش تھی کہ انارہ پانچویں گھر میں جانے میں کامیاب ہوگئی تھی۔

''''ہیں...... اتنا چھوٹا سا۔'' انارہ حیرت زدہ ہوئی۔

''جانتی ہے...... یہ کس کا دولہا ہے۔'' رانی پنکھی ہنس کر بولی۔

''اماں۔ کہیں یہ میرا تو نہیں۔'' انارہ پریشان ہوگئی۔

''ہاں...... یہ تیرا دولہا ہے۔'' رانی پنکھی نے پریقین لہجے میں کہا۔

''ہائے...... نہیں۔'' انارہ سٹ کر بولی۔

''چل اب تُو دیکھتی جا اور سنتی جا۔'' رانی پنکھی نے کہا۔

تب پھر منظر بدلا۔ یہ دلہن کا گھر تھا۔ کمرا عورتوں اور لڑکیوں سے بھرا ہوا تھا۔ دلہن ایک خوبصورت مسہری پر بیٹھی تھی، برات آ چکی تھی۔ نکاح کی تیاری ہو رہی تھی۔

وکیل دو گواہوں کے ساتھ حویلی کی راہداریوں میں چلتے ہوئے دُلہن کے کمرے تک آ پہنچے تھے۔ آنے والے فیملی کے لوگ تھے، انہیں اندر بلا لیا گیا۔

وکیل نے دولہا کا نام، ولدیت اور مہر کی رقم بتا کر بارہ سالہ دولہا کو ''قبول'' کروایا۔ دلہن روبینہ کے نکاح نامے پر دستخط لئے۔

روبی نے ''ہاں'' کرنے سے انکار کرنا چاہا تو اس کے برابر بیٹھی ماں نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔ ''روبی...... میری شہزادی...... اس زہر کو قسمت کا لکھا سمجھ کر پی جا۔''

تب روبی نے ہتھیار ڈال دیئے۔ ویسے بھی وہ جانتی تھی کہ اس 'زہر' کو پیئے بغیر چارہ نہیں۔ وہ تنہا ان اندھے، بہرے لوگوں سے نہیں لڑ سکتی تھی۔

یہ اَنا پرست، روایت پرست، یہ برادریوں میں بٹے لوگ...... بیٹیوں پر جائداد کو ترجیح دینے والے زر پرست...... ان پتھر کی دیواروں سے وہ سر تو پھوڑ سکتی تھی لیکن ان دیواروں کو گرا نہیں سکتی۔ لہٰذا اس نے ماں کے کہنے پر اس زہر کو قسمت کا لکھا سمجھ کر پینے میں ہی عافیت جانی۔

وہ چھ بھائیوں کی اکلوتی بہن تھی۔ اس زمیندار گھرانے میں لڑکیوں کو پڑھانا معیوب سمجھا جاتا تھا لیکن روبی کا شوق دیکھتے ہوئے باپ نے اسے شہر کے کالج بھیج دیا۔ چھوٹی اور لاڈلی ہونے کی وجہ سے بھائیوں نے بھی مخالفت نہ کی۔ اُسے کالج میں پڑھنے اور ہاسٹل میں رہنے کی اجازت مل گئی۔

گھر سے رخصت کرتے وقت البتہ بڑے بھائی رضوان نے اتنا ضرور کہا۔ ''ہم تمہاری ضد اور شوق پر تمہیں شہر بھیج رہے ہیں، تنہا جا رہی ہو تو تنہا ہی واپس آنا۔''

تب پھر منظر بدلا۔ یہ دلہن کا گھر تھا۔ کمرا عورتوں اور لڑکیوں سے بھرا ہوا تھا۔ دلہن ایک خوبصورت مسہری پر بیٹھی تھی، برات آ چکی تھی۔ نکاح کی تیاری ہو رہی تھی۔

وکیل دو گواہوں کے ساتھ حویلی کی راہداریوں میں چلتے ہوئے دُلہن کے کمرے تک آ پہنچے تھے۔ آنے والے فیملی کے لوگ تھے، انہیں اندر بلا لیا گیا۔

وکیل نے دولہا کا نام، ولدیت اور مہر کی رقم بتا کر بارہ سالہ دولہا کو ''قبول'' کروایا۔ دلہن روبینہ کے نکاح نامے پر دستخط لئے۔

روبی نے ''ہاں'' کرنے سے انکار کرنا چاہا تو اس کے برابر بیٹھی ماں نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔ ''روبی...... میری شہزادی...... اس زہر کو قسمت کا لکھا سمجھ کر پی جا۔''

تب روبی نے ہتھیار ڈال دیئے۔ ویسے بھی وہ جانتی تھی کہ اس 'زہر' کو پیئے بغیر چارہ نہیں۔ وہ تنہا ان اندھے، بہرے لوگوں سے نہیں لڑ سکتی تھی۔

یہ اَنا پرست، روایت پرست، یہ برادریوں میں بٹے لوگ...... بیٹیوں پر جائداد کو ترجیح دینے والے زر پرست...... ان پتھر کی دیواروں سے وہ سر تو پھوڑ سکتی تھی لیکن ان دیواروں کو گرا نہیں سکتی۔ لہٰذا اس نے ماں کے کہنے پر اس زہر کو قسمت کا لکھا سمجھ کر پینے میں ہی عافیت جانی۔

وہ چھ بھائیوں کی اکلوتی بہن تھی۔ اس زمیندار گھرانے میں لڑکیوں کو پڑھانا معیوب سمجھا جاتا تھا لیکن روبی کا شوق دیکھتے ہوئے باپ نے اسے شہر کے کالج بھیج دیا۔ چھوٹی اور لاڈلی ہونے کی وجہ سے بھائیوں نے بھی مخالفت نہ کی۔ اُسے کالج میں پڑھنے اور ہاسٹل میں رہنے کی اجازت مل گئی۔

گھر سے رخصت کرتے وقت البتہ بڑے بھائی رضوان نے اتنا ضرور کہا۔ ''ہم تمہاری ضد اور شوق پر تمہیں شہر بھیج رہے ہیں، تنہا جا رہی ہو تو تنہا ہی واپس آنا۔''

روبی نے اس کی بات سمجھتے ہوئے آہستہ سے کہا۔ ''جی بھائی۔''

روبی ایک سمجھدار اور محتاط لڑکی تھی۔ وہ یہ بات اچھی طرح جانتی تھی کہ اس کا کس گھرانے سے تعلق ہے اور اس کے باپ بھائی کس مزاج کے لوگ ہیں۔

وہ حویلی سے ''شریک حیات'' منتخب کرنے نہیں نکلی تھی۔ اسے پڑھنے کا بے حد شوق تھا۔ وہ کالج سے ڈگری کے حصول کے لئے نکلی تھی لیکن قسمت کچھ اور ہی طے کئے بیٹھی تھی۔

روبی کی ساری احتیاط، ساری سمجھداری اندھے کنویں میں جا گری۔ آنکھوں پر پٹی بندھ گئی۔ عقل نے کام کرنا چھوڑ دیا۔ بھائی کی تنبیہ یاد رہی، نہ باپ کی گھورتی آنکھیں۔ اسے اگر کچھ یاد رہ گیا تو وہ تھا ندیم بخاری۔

بی اے کا آخری سال تھا۔ روبی نے اب تک خود کو بچائے رکھا تھا۔ بس ایک سہیلی بینش کی سالگرہ میں جانا غضب ہوگیا۔ ندیم بخاری اسے اس تقریب میں ملا۔ خوبصورت اور باوقار ندیم اس کے دل میں گھر کر گیا اور یوں یہ تقریب ملاقات کا بہانہ بن گئی یا یوں کہنا چاہئے کہ اس سالگرہ کو ملاقات کا بہانہ بنا دیا گیا۔

ندیم بخاری، بینش کا بھائی تھا۔ بینش، روبی کو بے انتہا پسند کرتی تھی۔ وہ اسے اپنی بھابھی بنانے کی آرزو رکھتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اپنے بھائی ندیم سے اس کا تذکرہ کرتی رہتی تھی۔ اس نے روبی کی اپنے موبائل فون پر کھینچی گئی تصویریں بھی دکھائی تھیں۔

ندیم کو یہ سادہ سی حسین لڑکی بھا گئی تھی۔ بس تب ہی بینش نے دونوں کو ملوانے کی ''سازش'' تیار کی اور اپنی سالگرہ کے بہانے شدید اصرار کر کے اسے اپنے گھر بلوا لیا۔

بعض وقت ایک ملاقات ہی خاصی بھاری پڑ جاتی ہے اور دو طرفہ پسندیدگی کے بعد اگر یہ ملاقاتیں جاری رہیں تو پتھر بن جاتی ہیں۔ بینش، روبی کے مزاج سے واقف تھی، لہٰذا اس نے کبھی اس سے اپنے بھائی کا ذکر نہ کیا۔ اور اس نے دونوں کی اس طرح ملاقاتیں کرائیں کہ ہر ملاقات اتفاقیہ معلوم ہو۔ مثلاً ایک دن بینش نے شاپنگ کا پروگرام بنایا اور روبی کو اپنے ساتھ گھسیٹ لیا۔

اُدھر اس نے اپنے بھائی کو بتا دیا کہ وہ کس وقت کہاں پہنچے۔ اس طرح وہ ''اتفاقیہ'' ایک معروف شاپنگ پلازہ میں ان دونوں کو مل گیا اور پھر بینش نے اپنے بھائی پر زور دے کر اسے کھانا کھلانے پر مجبور کیا۔

روبی، بینش کو منع کرتی رہی لیکن بینش نے یہ کہہ کر ''ارے یہ میرا بھائی بڑا کنجوس ہے۔ آج پتا نہیں یہ کیسے کھانا کھلانے پر راضی ہوگیا ہے۔'' روبی کو بصد اصرار اپنے ساتھ لے لیا۔

ان تین چار ملاقاتوں نے اپنا رنگ گہرا کرنا شروع کیا۔ بالآخر بینش نے روبی کو بڑے فطری انداز میں اس راہ پر ڈال دیا جس پر چلنے کی اس کے بھائی نے تنبیہ کی تھی۔

ندیم بخاری پڑھا لکھا لڑکا تھا۔ برسرِ روزگار تھا اور متوسط گھرانے سے تعلق رکھتا تھا۔ وہ روبی سے شادی کے سلسلے میں بہت سنجیدہ تھا۔

روبی بھی اُسے دل و جان سے چاہنے لگی تھی۔ وہ اس کی ہونا چاہتی تھی لیکن اس میں ہمت نہ تھی کہ وہ اپنے باپ خصوصاً اپنے بڑے بھائی رضوان کے سامنے سر اُٹھا سکے۔ لہٰذا وہ فائنل امتحان کے بعد اس سے 'فائنل' ملاقات کر کے چلی آئی۔ اس نے دل میں اُٹھتے محبت کے سونامی کو دل میں ہی دفن کر دیا۔

وقتِ رخصت اس نے بھیگی آنکھوں سے ندیم بخاری سے کہا۔ ''ندیم...... مجھے بھول جانا، میں ایک کمزور لڑکی ہوں۔ روایت شکنی میرے بس کی بات نہیں۔''

''نہیں۔ روبی، میں تمہیں نہیں بھول سکتا۔ تم ہمت کرو۔ اپنے گھر والوں سے بات تو کرو۔'' ندیم بخاری نے اس کی ہمت بندھانے کی کوشش کی۔

''ندیم...... بات انسانوں سے کی جاتی ہے، پتھر کی دیواروں سے نہیں۔ ان دیواروں سے سر پھوڑا جا سکتا ہے۔ اپنا آپ ختم کیا جا سکتا ہے، تم کہو تو میں زہر کھا لوں۔''

''نہیں ہم زہر نہیں کھائیں گے۔ میں ایک دن تمہارے گھر آؤں گا۔ تمہارے لوگوں سے تمہیں مانگوں گا۔ پھر چاہے جو ہو۔'' اس کی دیوانگی سر چڑھ کر بول رہی تھی۔

''ایسی غلطی کبھی نہ کرنا۔'' روبی لرز کر بولی۔ ''میں جانتی ہوں کہ کیا ہوگا۔''

''کیا ہوگا۔'' ندیم بخاری نے پوچھا۔

''تم وہاں سے اپنے پیروں پر واپس نہ آ سکو گے۔ میں آج پچھتاتی ہوں۔ اگر مجھے معلوم ہوتا کہ میں یہاں آ کر اتنی بے اختیار ہو جاؤں گی تو ہرگز شہر نہ آتی۔ محبت کرنا آسان ہے لیکن اسے نباہنا آسان نہیں۔ مجھ جیسے بزدلوں کو محبت کرنا ہی نہیں چاہئے۔'' یہ کہہ کر روبی بے اختیار رو پڑی۔

''روبی...... یہ رونے کا وقت نہیں، کچھ کرنے کا وقت ہے۔'' ندیم بخاری نے ٹشو پیپر اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''مجھے اتنا بتاؤ کہ اگر تمہارے گھر والے میرے بارے میں پوچھیں تو تم انکار تو نہ کر دو گی۔''

''نہیں...... میں انکار تو نہیں کروں گی۔'' روبی نے خود کو سنبھالتے ہوئے کہا۔ ''لیکن میں یہ بات بہت اچھی طرح جانتی ہوں کہ وہ مجھ سے میری مرضی کسی صورت نہیں معلوم کریں گے۔''

''روبی...... میں تمہارے گھر ضرور آؤں گا۔ میرا انتظار کرنا۔'' ندیم بخاری نے پرعزم لہجے میں کہا۔

اور پھر اُس نے ایسا ہی کیا؟

وہ جانے کیا سوچ کر حویلی آ پہنچا۔ اس نے روبی کے باپ اجمل سے ملاقات کی۔ سر پر کفن باندھے ندیم بخاری نے جیسے ہی روبینہ کا ذکر چھیڑا تو اجمل نے اُسے ہاتھ اٹھا کر ٹوکتے ہوئے کہا۔ ''کاکا...... ایک منٹ۔''

ندیم بخاری فوراً خاموش ہوگیا۔ تب اجمل نے پاس کھڑے اپنے ملازم خاص سے کہا۔ ''فوراً رضوان کو بلا...... جلدی۔''

PDF BY Manzoor

ملازم دوڑتا ہوا اندر حویلی میں چلا گیا۔ دو منٹ کے بعد رضوان بیٹھک میں آ پہنچا۔ ''جی ابا۔''

اجمل نے ملازمِ خاص کو باہر جانے کا حکم دیا اور جب بیٹھک میں وہ تینوں رہ گئے تو اجمل نے ندیم بخاری کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ ''یہ کاکا شہر سے آیا ہے اور ہماری روبی کے بارے میں کچھ کہنا چاہتا ہے۔ میں نے اس کی پوری بات نہیں سنی۔ میرا خیال ہے کہ یہ کوئی بے وقوف لڑکا ہے، اس نے شیر کی کچھار میں بلا سوچے سمجھے قدم رکھ دیا ہے۔ اب تو اسے یہ بات اپنی زبان میں سمجھا دے کہ ہم لوگ برادری سے باہر رشتہ نہیں کرتے۔ ویسے بھی اس کا رشتہ پھوپھی زاد سے طے ہو چکا ہے۔ میں چلتا ہوں تو اس سے نمٹ۔''

''ٹھیک ہے ابا۔'' رضوان نے مطمئن لہجے میں کہا۔

اجمل کے جانے کے بعد رضوان نے اسے اوپر سے نیچے تک دیکھا۔ پھر اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے سوال کیا۔ ''حویلی تک آنے کی جرأت کیا تمہیں روبی نے دی ہے۔''

''نہیں سر..... میں خود آیا ہوں۔ انہوں نے تو مجھے سختی سے منع کیا تھا۔'' ندیم بولا۔

''پھر اس نے یہ بھی بتا دیا ہوگا کہ یہ رشتہ ہمیں کسی صورت قبول نہیں ہوگا۔'' رضوان نے اسے گھورا۔

''جی انہوں نے یہ بات بھی بتا دی تھی۔''

''پھر تمہاری مت کیوں ماری گئی۔''

''مجھے نہیں معلوم۔ کیا چیز مجھے یہاں لے آئی۔'' ندیم بخاری دل کی بات کہہ نہ سکا۔

''دراصل جب گیدڑ کی موت آتی ہے تو وہ شہر کا رخ کرتا ہے اور جب کسی جنونی کی موت آتی ہے تو وہ حویلی کی طرف بھاگتا ہے۔ تمہیں تمہاری موت یہاں لے آئی ہے۔'' رضوان نے اپنی مونچھوں پر تاؤ دے کر کہا۔

''سر..... میں موت سے نہیں ڈرتا۔'' ندیم بخاری بے خوفی سے بولا۔

''جو کام تم نے کیا ہے، اس کا انجام بالآخر موت ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ میں تمہیں کیوں چھوڑ رہا ہوں۔ میری گاڑی تمہیں تمہارے گھر تک چھوڑ آئے گی۔ جاؤ۔'' رضوان نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا اور بیٹھک سے نکل گیا۔

ندیم بخاری کو اچھی طرح اندازہ ہو گیا تھا کہ اب وہ کبھی گھر نہیں پہنچ سکے گا۔ یہ گاڑی کا نہیں بلکہ موت کا سفر شروع ہو چکا ہے۔ محبت کا انجام بالآخر یہی ہونا تھا۔ وہ مطمئن تھا کہ اس نے اپنی محبت کو 'آخری منزل' تک پہنچا دیا تھا۔ اب گاڑی میں بیٹھتے ہوئے اس کے دل میں شدید خواہش جاگی تھی کاش، وہ روبینہ کو آخری بار دیکھ لیتا۔

وہ گاڑی سے اُتر کر حویلی کے بھاری دروازے پر کھڑے رضوان کے پاس آیا اور بڑے مؤدبانہ انداز میں بولا۔ ''سر ایک درخواست ہے۔ اُسے آپ میری آخری خواہش سمجھ لیں۔''

PDF BY Manzoor

رضوان نے تیوریوں پر بل ڈال کر اُسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھا، بولا کچھ نہیں۔

''کیا میں روبینہ کو ایک نظر دیکھ......''

ندیم بخاری اپنی بات پوری نہ کر پایا۔ رضوان کے تھپڑ نے اس کا منہ پھیر دیا۔ فوراً دو مسلح ملازمین نے اسے اپنی گرفت میں لے کر گاڑی میں بٹھایا اور گاڑی نے تیز رفتاری سے شہر کا رخ کیا۔

ندیم بخاری نے گاڑی میں بیٹھ کر کلمہ پڑھ لیا تھا۔ اس کی اس 'آخری خواہش' نے جلتی پر تیل کا کام کیا تھا۔ اب اس کی موت یقینی تھی لیکن حیرت ناک بات یہ ہوئی کہ اسے بحفاظت گھر پہنچا دیا گیا۔

واپس جاتے ہوئے ملازم خاص نے کہا۔ ''ہم نے تمہارا گھر دیکھ لیا ہے۔ آئندہ حویلی کا رخ کرنے کی کوشش نہ کرنا۔''

روبینہ کو ندیم بخاری کی حویلی آمد کا فوری طور پر تو پتا نہ چل سکا لیکن کچھ دنوں کے بعد گھر کی ایک ملازمہ نے اسے سارا حال سنا دیا اور یہ نوید بھی دے دی کہ اس گستاخی کے باوجود اس کی جان بخشی گئی۔ روبی کو اس کے حویلی آنے سے زیادہ جان بخشی کی خوشی ہوئی۔

پڑھی لکھی حساس لڑکی روبینہ کے دس بارہ سالہ پھوپھی زاد رستم کو زبردستی اس کے سر منڈھ دیا گیا۔ وہ روتی بلکتی اپنی پھوپھی کے گھر سدھار گئی۔

دس بارہ سال کے رستم کو اگرچہ گھر والوں نے اُسے خاصا سمجھا بجھا دیا تھا۔ اُسے یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ روبینہ اس کی دلہن ہے، بیوی ہے۔ لیکن سوال یہ تھا کہ اس عمر میں ایک لڑکا کس قدر شوہر بننے کا ڈرامہ کر سکتا ہے، جتنی اس میں سمجھ تھی، اتنا وہ کر رہا تھا اور اس کی اس 'اوور ایکٹنگ' سے روبی کی جان عذاب میں تھی۔

آہستہ آہستہ وہ ڈپریشن کی مریضہ ہوتی گئی۔ ندیم کی یادیں اور رستم کی بچگانہ حرکتیں اس کی زندگی میں زہر گھول گئیں۔

وقت نے کروٹ لی۔ دس بارہ سالہ لڑکا چوبیس پچیس سال کا ہو گیا۔ روبی پچاس کے لپیٹے میں آ گئی۔ جوان رستم کو اب روبی ایک آنکھ نہ بھاتی۔ روبی کا حسن گہنا چکا تھا۔ بیماریوں نے اسے ہڈیوں کا ڈھانچا بنا دیا تھا۔

رستم کی حقارت بھری نظریں اس کے وجود میں سوئیوں کی طرح چبھتی تھیں۔ روبی نے اپنی جوانی اس گھر کی نذر کر دی تھی۔

اپنی ماں کی التجا پر قطرہ قطرہ روز زہر پیتی رہی تھی۔ مایوسیوں نے اس کے دل میں گھر کر لیا تھا۔ اندیشے اسے ڈراتے تھے۔ اس کے دل میں شدت سے مر جانے کی خواہش ابھرتی تھی۔ وہ سنجیدگی سے خودکشی کے بارے میں سوچنے لگی تھی۔ پھر کچھ سوچ کر رک جاتی تھی۔

رستم کا اگرچہ اس کے وجود سے کوئی تعلق نہ تھا لیکن اسے یہ احساس تھا کہ رستم اس کا شوہر ہے۔ پھر ایک دن یہ احساس بھی اپنی موت آپ مر گیا۔ وہ حویلی میں 'اُس بازار' کی ایک عورت اُٹھا لایا اور جب اس نے اسے ''بیوی'' کہہ کر متعارف کروایا تو روبی پر سکتہ سا طاری ہو گیا۔

اُس عورت کے انداز دیکھ کر روبی کو اپنا آپ بہت حقیر لگا۔ وہ اس صدمے کو برداشت نہ کر سکی اس نے حویلی کے ایک گوشے میں موجود اندھے کنویں میں چھلانگ لگا دی۔

یہ اندھا کنواں حویلی کے ایک تاریک گوشے میں تھا۔ اس طرف کوئی نہ آتا تھا۔ اس گہرے کنویں کا پانی خشک ہو چکا تھا۔ روبی اس کنویں میں چھلانگ لگانے کے بعد دو دن جان کنی کے عالم میں رہی۔ اس نے سسک سسک کر دم توڑا۔

انارہ کے جب بے اختیار رونے کی آواز آئی تو رانی پنکھی نے چونک کر کہا۔ ''کیا ہوا انجو؟''

''کچھ نہیں اماں۔ کیا ہونا ہے۔'' انارہ سسکتے ہوئے بولی۔ ''بند کر دے یہ دردناک کھیل۔''

''اچھا...... ٹھیک ہے۔'' رانی پنکھی نے جلدی جلدی کچھ پڑھا اور پانچویں گھر میں بیٹھی انارہ پر پھونک ماری۔ پھونک مارتے ہی انارہ کی آنکھوں کے سامنے سے روبی کی موت کا منظر غائب ہو گیا۔

انارہ نے ساڑھی کے پلو سے اپنی خوبصورت آنکھیں پونچھیں اور پانچویں گھر سے نکل آئی۔

رانی پنکھی گلے میں تعویذ ڈال کر ساتواں گھر چھوڑ کر چارپائی پر لیٹ چکی تھی۔

انارہ نے اس کے پاؤں دبانے شروع کئے تو رانی پنکھی اپنی آنکھوں پر ہاتھ رکھے بولی۔ ''انجو...... بس اب تیرے دو گھر اور رہ گئے۔ یہ کسی طرح پورے ہو جائیں، پھر بات بنے۔''

''اماں...... تجھے یاد ہے۔ تو نے کہا تھا کہ کوئی آ کر میرے بھاگ جگائے گا۔'' انارہ نے یاد دلایا۔

''ہاں...... مجھے یاد ہے۔'' انجو وہ ضرور آئے گا۔'' رانی پنکھی نے بڑے یقین سے کہا۔

''آخر کب آئے گا وہ۔'' انارہ جھنجھلا کر بولی۔

''لگتا ہے جیسے وہ اس شہر میں داخل ہو گیا ہے۔'' رانی پنکھی کی آواز کہیں دور سے آ رہی تھی۔ لگتا تھا جیسے وہ غنودگی میں بول رہی ہو۔

''ہائے اماں...... سچ۔'' انارہ خوش ہو کر بولی۔

''کیا سچ......!'' رانی پنکھی نے آنکھوں سے ہاتھ ہٹا کر انارہ کو گھورا۔

''یہی کہ وہ یہاں آ گیا ہے۔ ہمارے شہر میں۔'' انارہ نے چہک کر کہا۔

''یہ تجھے کس نے بتایا۔'' رانی پنکھی نے اسے ٹیڑھی نظروں سے دیکھا۔

''اماں ابھی تو نے ہی تو بتایا ہے۔'' انارہ حیرت زدہ تھی۔

''میں نے تو نہیں بتایا۔ ایسی بات میں کیسے بتا سکتی ہوں۔'' رانی پنکھی صاف مکر گئی۔

''دیکھ اماں، جھوٹ نہ بول۔'' انارہ نے التجا کی۔

''اب ایک رات چھوڑ کر میں تجھے چھٹے گھر میں لے چلوں گی۔ ٹھیک ہے۔ اب تو جا۔'' رانی پنکھی نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

انارہ نے اندازہ لگا لیا کہ رانی پنکھی اس بات کا اقرار نہیں کرنا چاہتی اور انارہ اسے ناراض نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اسی لئے اس نے اس موضوع پر مزید بحث کرنا مناسب نہ سمجھا اور اٹھ کر کمرے میں چلی گئی۔

رانی پنکھی کو یہ بات اچھی طرح یاد تھی۔ اُس نے اس کے شہر میں ہونے کا اقرار کیا تھا لیکن اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ایسا کیوں کر ہوا تھا۔

☆......☆......☆

تینوں لیڈی کمانڈوز جب اُسے تیزی سے اپنی گرفت میں لئے بائیں جانب مڑیں تو عابر کو ڈھلانی راستہ نظر آیا۔ جب ڈھلانی راستہ ختم ہوا تو ان کے سامنے لفٹ کا دروازہ تھا۔ لفٹ کھلتے ہی ایک لیڈی کمانڈو نے اسے لفٹ میں داخل ہونے کا اشارہ کیا۔

جب لفٹ چلی تو دو لیڈی کمانڈوز باہر ہی رک گئیں۔ بس ایک لیڈی کمانڈو ساتھ رہی، جس نے اس کے دل کا نشانہ لے رکھا تھا اور لفٹ اوپر جانے کے بجائے نیچے کی جانب جا رہی تھی۔

عابر کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اُسے کس جرم میں پکڑا گیا تھا۔ اس نے کئی لوگوں کو اندر جاتے دیکھا تھا۔ اگر اس نے بھی اندر جانے کی کوشش کی تھی تو کیا گناہ کیا تھا۔

اس کے پاس یلو کارڈ تھا جو اس کے گلے میں موجود تھا۔ یلو کارڈ کے ہوتے ہوئے اسے آخر کیوں گرفت میں لیا گیا تھا۔

ایک بات اور اس کی اُلجھن کا باعث تھی کہ جب ہر شخص کے لئے یہ دروازہ کھل رہا تھا تو پھر اس کے لئے کیوں نہیں کھلا تھا۔

چند سیکنڈ کے بعد جب اس تیز رفتار لفٹ کا دروازہ کھلا تو عابر حیران رہ گیا۔ یہ دروازہ براہ راست کسی آفس میں کھلا تھا۔

جب وہ لیڈی کمانڈو کے ساتھ باہر آیا تو یہ دیکھ کر مزید حیران ہوا کہ سامنے ڈاکٹر اعتبار ایک شاندار کرسی پر براجمان تھا اور کسی سے فون پر بات کر رہا تھا۔

ڈاکٹر اعتبار نے فون رکھ کر مڑ کر دیکھا تو عابر کو ایک لیڈی کمانڈو کے ساتھ پایا۔ اس نے فوراً لفٹ کی طرف دیکھا۔ تب اُسے یہ اندازہ کرنے میں دیر نہ لگی کہ عابر کیوں گرفتار ہوا۔ پھر بھی اس نے جاننا چاہا...... ''کیا ہوا؟''

''سر...... یہ ایکس زون میں داخل ہونے کی کوشش کر رہے تھے۔'' لیڈی کمانڈو نے بتایا۔

''اوکے...... آپ جائیں، میں دیکھتا ہوں۔'' ڈاکٹر اعتبار نے کہا۔

وہ لیڈی کمانڈو واپس مڑی اور پھر لفٹ میں غائب ہو گئی۔

ڈاکٹر اعتبار نے اُسے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور بولا۔ ''مسٹر عابر...... آپ کہاں جانا چاہ رہے تھے۔''

''سر...... میں تو کہیں نہیں جانا چاہ رہا تھا۔ بس کئی لوگوں کو اندر جاتے دیکھ کر میں نے سوچا۔ ذرا جا کر دیکھوں کہ اندر کیا ہے لیکن میرے لئے دروازہ نہ کھلا اور جانے کہاں سے نکل کر لیڈی کمانڈوز نے مجھے گھیر لیا۔ سوال یہ ہے کہ میرے لئے دروازہ کیوں نہیں کھلا۔'' عابر نے پوچھا۔

''مجھے اندازہ نہیں تھا کہ آپ کا مشاہدہ اس قدر تیز ہے کہ آتے جاتے لوگوں کو فوکس کر لیں گے۔ اگر معلوم ہوتا تو تنبیہ کر دیتا۔ خیر کوئی بات نہیں۔ رہ گئی بات کہ دروازہ آپ پر کیوں نہیں کھلا۔ میں بتاتا ہوں۔ آپ نے یہ تو دیکھ لیا کہ دروازے کے سامنے کھڑے ہونے والے شخص کے لئے چند لمحوں میں دروازہ کھل جاتا لیکن ان لوگوں کی پشت ہونے کی وجہ سے آپ یہ نہیں دیکھ پائے کہ وہ دروازے کے سامنے کھڑے ہوتے ہی اپنے گلے میں پڑے کارڈ کو پلٹ کر دکھاتے جس پر کوڈ نمبر لکھا ہوتا۔ کوڈ کے سامنے آتے ہی دروازہ کھل جاتا۔''

''اچھا...... یہ راز تھا دروازہ کھلنے کا۔'' یہ کہہ کر عابر نے اپنے گلے میں پڑے یلو کارڈ کو پلٹ کر دیکھا۔ اس پر سادہ خانوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ وہ بولا۔ ''میرے کارڈ پر تو کوئی کوڈ نمبر درج نہیں۔''

''آپ کا کیا خیال ہے کہ ہم ایک اجنبی کو کوڈ دے کر اپنے خفیہ دروازے اس پر کھول دیں۔'' ڈاکٹر اعتبار نے ہنس کر کہا۔ ''آپ نے ہمیں اتنا بے وقوف سمجھا ہے کیا؟''

''نہیں سر...... جو شخص اتنا بڑا نیٹ ورک چلا رہا ہو، وہ بھلا کم عقل ہو سکتا ہے۔'' عابر بولا۔

ڈاکٹر اعتبار نے کوئی جواب دینے کے بجائے اسے مسکرا کر دیکھا۔ چند لمحوں میں اس نے کوئی فیصلہ کیا اور پھر تھوڑا گھوم کر لائن سے رکھے ہوئے ٹیلی فون سیٹس سے ایک سفید رنگ کے ٹیلی فون کا ریسیور اٹھایا اور ایک بٹن دبایا۔

دوسری طرف سے سوہنی نے ریسیور اٹھا کر انتہائی مؤدبانہ لہجے میں کہا۔ ''سر۔''

''میڈم...... یہ عابر صاحب میرے سامنے بیٹھے ہیں۔ انہوں نے ایکس زون میں داخل ہونے کی کوشش کی تھی۔'' ڈاکٹر اعتبار نے نرم لہجے میں انکشاف کیا۔

''یہ تو انہوں نے بڑا غلط کام کیا۔'' سوہنی نے فوراً غیر جانبداری برتی۔

''اصل میں یہ اپنے تجسس کے ہاتھوں مارے گئے۔ خیر کوئی مسئلہ نہیں۔ اس طرح ہماری سیکورٹی بھی چیک ہو گئی۔'' ڈاکٹر اعتبار کی نظریں عابر پر جمی ہوئی تھیں۔ ''ہم انہیں اپنی تحویل میں لے رہے ہیں۔ یہ چوبیس گھنٹے تک تجربے گاہ میں رہیں گے۔ رائٹ سوہنی۔''

''جی سر۔'' سوہنی مؤدبانہ انداز میں بولی۔ ''بالکل ٹھیک۔''

ڈاکٹر اعتبار نے ریسیور زور سے پٹخا اور پھر میز پر رکھے ہوئے ریموٹ کو اٹھا کر اس کا بٹن دبایا۔ بٹن دبتے ہی ہلکی سی سرسراہٹ کی آواز آئی۔ لفٹ کا دروازہ کھلا لیکن یہ وہ لفٹ نہ تھی جس سے عابر کو لایا گیا تھا۔

ڈاکٹر اعتبار نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ ''آیئے، چلیں۔''

عابر فوراً اس کے ساتھ چل دیا۔ ڈاکٹر اعتبار نے عابر کے لفٹ میں داخل ہونے کے بعد ڈسپلے کے واحد بٹن پر انگلی رکھی۔ اس پر نمبر کے بجائے ''لیب'' لکھا ہوا تھا۔

تیز رفتار لفٹ کا چند لمحوں بعد ہی دروازہ کھلا۔ یوں لگا جیسے لفٹ چلی ہی نہیں۔ ڈاکٹر اعتبار نے اسے نکلنے کا اشارہ کیا۔ اس کے بعد وہ خود باہر آیا۔

یہ ایک لمبی سی راہداری تھی۔ یہاں سفید کپڑوں پر کوٹ پہنے لوگ آ جا رہے تھے۔ ان میں خواتین بھی تھیں۔

ڈاکٹر اعتبار پر نظر پڑتے ہی ہر شخص مؤدبانہ انداز میں سلام کرتا اور نظریں جھکا کر آگے بڑھ جاتا۔ ڈاکٹر اعتبار محض سر کی جنبش سے ان کے سلام کا جواب دے رہا تھا۔

تھوڑا سا آگے جا کے دائیں طرف مڑتے ہی ایک بڑا دروازہ نظر آیا، جس کی پیشانی پر روشن لفظوں میں لکھا تھا ''لیبارٹری۔''

لیب کے دروازے پر پہنچتے ہی لیڈی سیکورٹی گارڈ نے دروازہ کھول دیا۔ عابر کو لے کر ڈاکٹر اعتبار لیب میں داخل ہوا تو سفید کوٹ میں ملبوس ایک شخص آگے بڑھا۔

وہ اس لیب کا انچارج تھا۔ ڈاکٹر اعتبار نے اس سے ہاتھ ملایا اور پھر وہ تینوں ایک آفس میں داخل ہو گئے۔

ڈاکٹر اعتبار نے اپنی نشست سنبھالتے ہوئے ساتھ آنے والے ڈاکٹر سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''ڈاکٹر ساجد...... یہ ہمارے نئے ساتھی ہیں۔ یہ ایس ون والے تجربے میں ہماری معاونت کریں گے۔ آپ انہیں اپنے ساتھ لے جائیں اور تجربے کی تیاری کریں۔''

ڈاکٹر ساجد نے فوراً کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ ''آیئے۔''

جب وہ دونوں جانے لگے تو ڈاکٹر اعتبار بولا۔ ''ڈاکٹر ساجد یہ بہت سمجھدار نوجوان ہیں۔ ہمارے ساتھ پورا تعاون کریں گے۔ ان کا نام عابر ہے، ذرا ان کا خیال رکھئے گا۔''

''جی بہتر۔'' ڈاکٹر ساجد یہ کہتا ہوا کمرے سے نکل گیا۔

ڈاکٹر ساجد نے اپنے کمرے میں بیٹھ کر مختلف احکامات جاری کئے۔

ایک پرکشش نرس نے اُسے ایک چھوٹے مگر آرام دہ کمرے میں پہنچایا۔ اس کے کپڑے تبدیل کروائے گئے۔ ایک ڈھیلا ڈھالا لباس اُسے پہننے کو دیا گیا۔

اس کمرے میں ٹیلی ویژن موجود تھا۔ ایک کونے میں چھوٹا فریج بھی رکھا تھا جس میں ہر طرح کے مشروبات موجود تھے۔ ایک بھاری بیڈ کے ساتھ کمرے میں صوفہ بھی پڑا تھا۔

PDF BY Manzoor

نرس نے تھوڑی دیر کے بعد آ کر بازو میں ایک انجکشن لگایا۔

اس انجکشن کے لگتے ہی عابر کو ایک انوکھے سکون کا احساس ہوا۔

نرس نے اس کے ہاتھ میں ریموٹ دیا اور بولی۔ ''آپ چاہیں تو ٹی وی دیکھیں۔ اگر فلم دیکھنے کا موڈ ہو تو ایک نئی فلم پلیئر میں موجود ہے۔ وہ دیکھ لیجئے گا۔ ریموٹ ٹیبل پر موجود ہے۔ کوئی مسئلہ ہو تو کال بیل کا بٹن دبا دیجئے گا، میں آ جاؤں گی، او کے۔''

نرس کے جانے کے بعد اس نے ریموٹ ٹیبل پر رکھ دیا۔ اُسے ٹی وی یا فلم سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ وہ آنکھیں بند کر کے کچھ سوچنا چاہتا تھا۔

اُسے تجربے کے بارے میں کوئی بات نہیں بتائی گئی۔ بالکل اندھیرے میں رکھا گیا تھا۔

اسے اپنا گھر یاد آیا۔ امی، ابو اور صائمہ اس کے لئے کتنے پریشان ہوں گے۔ اگرچہ ان سے فون پر کئی مرتبہ بات ہو چکی تھی۔ لیکن اس نے انہیں جس انداز میں جو کچھ بتایا تھا، اس سے یہ اندازہ تو لگایا جا سکتا تھا کہ وہ جہاں ہے، خیریت سے ہے۔ لیکن جو کچھ وہ کہہ رہا ہے، اس پر یقین کرنا اتنا آسان نہ تھا۔ وہ اس وقت کو کوستا تھا جب وہ آرزو کے چنگل میں پھنسا تھا۔

بھلا اسے کیا ضرورت تھی اس کے گھر جانے کی۔ وہ چلتے پھرتے اسے اپنا کارڈ تھما گئی اور وہ کچے دھاگے سے بندھا، اس کے گھر جا پہنچا تھا۔ یہ ایک غیر دانش مندانہ قدم تھا جو اس نے بلا سوچے سمجھے اُٹھا لیا تھا۔

آرزو ایک فراڈ لڑکی تھی۔ ایسی عیار اور شاطر لڑکی کہ اس کے بارے میں کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ وہ تو بھلا ہو سونی افتخار کا، جس نے اس کی شخصیت کا پردہ چاک کر دیا ورنہ اُسے زندگی بھر اس کے فراڈ ہونے کا پتا نہ چلتا۔

اُس وقت وہ جہاں موجود تھا۔ اس جگہ کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا۔ اسے لگ رہا تھا جیسے وہ آسمان سے گر کر کھجور میں اٹک گیا۔

یہ کون لوگ تھے، کیا چاہتے تھے۔ کچھ پتا نہیں چل رہا تھا۔ ڈاکٹر اعتبار بظاہر ایک معصوم صورت شخص نظر آتا تھا، اندر سے وہ کیا نکلے، کیا کہا جا سکتا تھا۔

بہر حال اب صبر کے سوا کیا چارہ تھا۔ وہ بری طرح جکڑا ہوا تھا۔ اس قدر سخت پہروں میں تھا کہ یہاں سے نکلنا آسان نہ تھا۔

ابھی وہ منتشر خیالی کا شکار تھا کہ نرس دستک دے کر اندر آ گئی اور بولی۔ ''بلڈ چاہئے۔''

''خون..... کس لئے؟'' عابر نے پوچھا۔

''بلڈ ٹیسٹ کرنا ہے۔'' اس نے کہا۔

''میرا خون بہت اچھا ہے۔ کسی قسم کی ٹیسٹنگ کی ضرورت نہیں۔'' عابر مسکرا کر بولا۔

''اچھا۔'' نرس خوشدلی سے مسکرائی اور پھر اس نے سرنج کے ذریعے خاصا خون نکال لیا۔

''سسٹر..... ایک بات بتائیں۔'' عابر نے خون سے بھری سرنج کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''میرا اتنا سارا خون نکال لیا۔ آپ کہیں خون بیچتی تو نہیں۔''

تب اسے آپریشن تھیٹر لے جایا گیا۔ وہاں اسے ایک بیڈ نما اسٹریچر پر لٹایا گیا۔ عابر کو سامنے ایک بڑا مانیٹر لگا دکھائی دیا۔ اس کے اسٹریچر پر لیٹتے ہی کئی ڈاکٹروں نے اُسے گھیر لیا۔ اُس کے سر پر مختلف آلات فٹ کر دیئے گئے۔ پاؤں اور ہاتھوں کو بھی مختلف تاروں سے منسلک کر دیا۔

جب تجربے کی تیاری مکمل ہو گئی تو ڈاکٹر اعتبار کو بلایا گیا۔ ڈاکٹر اعتبار نے ہر چیز کا معائنہ کرنے کے بعد آنکھ اور کان کے درمیان انجکشن لگانے کا حکم دیا۔

انجکشن لگتے ہی عابر پر ایک غنودگی سی طاری ہو گئی لیکن وہ بڑی حد تک ہوش میں تھا۔ اسے اپنے اردگرد ہونے والی گفتگو صاف سنائی دے رہی تھی۔

''جی..... عابر صاحب..... اب ہم اپنا کام شروع کرتے ہیں۔ اجازت ہے۔'' ڈاکٹر اعتبار کی آواز آئی۔

''جی سر۔'' عابر بولا۔

''اس وقت آپ کی عمر کیا ہے۔'' ڈاکٹر اعتبار نے سوال کیا۔

تب اسے آپریشن تھیٹر لے جایا گیا۔ وہاں اسے ایک بیڈ نما اسٹریچر پر لٹایا گیا۔ عابر کو سامنے ایک بڑا مانیٹر لگا دکھائی دیا۔ اس کے اسٹریچر پر لیٹتے ہی کئی ڈاکٹروں نے اُسے گھیر لیا۔ اُس کے سر پر مختلف آلات فٹ کر دیئے گئے۔ پاؤں اور ہاتھوں کو بھی مختلف تاروں سے منسلک کر دیا۔

جب تجربے کی تیاری مکمل ہو گئی تو ڈاکٹر اعتبار کو بلایا گیا۔ ڈاکٹر اعتبار نے ہر چیز کا معائنہ کرنے کے بعد آنکھ اور کان کے درمیان انجکشن لگانے کا حکم دیا۔

انجکشن لگتے ہی عابر پر ایک غنودگی سی طاری ہو گئی لیکن وہ بڑی حد تک ہوش میں تھا۔ اسے اپنے اردگرد ہونے والی گفتگو صاف سنائی دے رہی تھی۔

''جی..... عابر صاحب..... اب ہم اپنا کام شروع کرتے ہیں۔ اجازت ہے۔'' ڈاکٹر اعتبار کی آواز آئی۔

''جی سر۔'' عابر بولا۔

''اس وقت آپ کی عمر کیا ہے۔'' ڈاکٹر اعتبار نے سوال کیا۔

''ہم..... آپ کو آہستہ آہستہ مرحلے وار ماضی میں لے جائیں گے۔ آپ تیار ہیں۔''

''میں تیار ہوں۔'' غنودگی گہری ہوتی جا رہی تھی۔ عابر کو اپنی آواز دور سے آتی ہوئی سنائی دی۔

سوال و جواب جاری تھے۔ ڈاکٹر اعتبار ہپناٹزم کے ذریعے اسے ماضی کے دھندلکوں میں لے جا رہا تھا، آہستہ آہستہ وہ بچپن کی حدود میں داخل ہو گئے تھے۔

پانچ سالہ عابر اپنی بچپن کی یادوں کو دہرا رہا تھا۔ ڈاکٹر اعتبار کی نظریں مانیٹر پر جمی تھیں۔ اسکرین پر کچھ اشکال ابھر رہی تھیں لیکن یہ واضح نہیں تھیں۔ ڈاکٹر اعتبار کی کوشش تھی کہ یہ یادیں، یہ باتیں کسی طرح تصویری شکل اختیار کر لیں۔ عابر جو دیکھ رہا ہے وہ صاف اور واضح طور پر نظر آنے لگے۔

اچانک مانیٹر کی اسکرین پر ایک ایسی چیز نظر آئی کہ ڈاکٹر اعتبار کے ہوش اُڑ گئے۔

☆.....☆.....☆

انارہ کے جانے کے بعد رانی پنکھی اُٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس وقت رات کے دو ڈھائی بجے تھے۔ دیوار کے اس طرف سے کچھ مردوں کے تیز تیز بولنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ یہ جواری تھے جنہوں نے قبرستان کو جوئے کا اڈا بنایا ہوا تھا۔ یہاں روز ہی جوا ہوتا اور روز ہی جھگڑا ہو جاتا تھا۔ کچھ دیر زور زور سے آوازیں آتیں۔ پھر خاموشی چھا جاتی۔ اس کے بعد کتے بھونکنا شروع ہو جاتے۔ انسان اگر پیسوں پر لڑتے تو کتے ہڈیوں پر جھگڑتے۔

رانی پنکھی نے اُٹھ کر صحن میں ٹہلنا شروع کر دیا تھا۔ ابھی کچھ دیر پہلے کی بات اس کے گلے سے نہیں اُتر رہی تھی کہ آخر ایسا کیوں کر ہوا تھا۔ اسے اتنا ضرور یاد تھا کہ چند لمحوں کے لئے اس پر غنودگی چھائی تھی اور اسی غنودگی کے دوران، اس نے اس کے شہر میں داخل ہونے کی اطلاع دی تھی۔ رانی پنکھی نے ایسا شعوری کوشش کے تحت نہ کیا تھا بلکہ لاشعوری طور پر اس سے یہ الفاظ کہلوائے گئے تھے۔

آخر ایسا کس نے کیا تھا۔ کیا بگا نے؟

اگر بگا نے کیا تو اس نے ایسا کیوں کیا؟ ایسی اطلاع دے کر کیا وہ انجو کو اس کے پیچھے لگانا چاہتا تھا۔ ممکن ہے کہ اس کی اس حرکت کا مقصد انجو کو اس سے برگشتہ کرنا ہو۔ وہ اب دشمنی پر اتر آیا تھا۔ اسی لئے اوچھے ہتھکنڈے استعمال کرنے شروع کر دیئے تھے۔

رانی پنکھی چاہتی تھی کہ کسی طرح تھوڑا وقت گزر جائے۔ وہ انجو کے معاملے کو کسی طور انجام تک پہنچا دے۔ بس اب دو گھر رہ گئے تھے۔ گویا پنکھوں کی سوئیاں نکالنا باقی تھیں۔ یہ سوئیاں نکل جائیں تو پھر وہ بگا سے نمٹے۔ بڑے شیطان تک رسائی کا کٹھن مرحلہ طے کرے۔ یہ ایک جان لیوا عمل تھا۔ اس عمل کے لئے چالیس روز درکار تھے۔ ان چالیس دنوں میں کچھ بھی ہو سکتا تھا۔

وہ ٹہلتی رہی اور سوچتی رہی۔ پھر ایک خیال اس کے ذہن میں آیا۔ اس نے سوچا کہ ایک مرتبہ وہ بگا سے بات کیوں نہ کر لے، اسے سمجھائے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ اپنی ناراضی ختم کر دے۔ یہ بات ذہن میں آتے ہی اس نے ملاقات کا فیصلہ کر لیا۔

اُس نے چارپائی گھسیٹ کر صحن کے وسط میں کی اور پھر اُسے اُلٹ دی۔ وہ ''اُلٹی کھاٹ'' کا جاپ کرنا چاہتی تھی۔ اُلٹی چارپائی کے گرد اس نے سات چکر کاٹے اور پھر وہ پاکستی کی طرف اس طرح بیٹھی کہ دونوں پایے اس کے ہاتھوں میں تھے۔ دونوں پایے پکڑنے کے بعد اس نے زور زور سے جھومنا شروع کیا۔

وہ ایک خاص انداز سے جھومتی جاتی تھی اور کچھ بولتے ہوئے دونوں ہاتھوں سے ایک پایے کو پکڑتی اور زوردار آواز میں پکارتی۔ ''آ، بگا۔''

گیارہویں بار جب عمل دُہرانے کے بعد اس نے زور سے پکارا۔ ''آ، بگا۔''

تب بگا تو نہ آیا، جو چیز اس کے سامنے آئی اسے دیکھ کر رانی پنکھی پریشان ہو گئی۔ وہ گھبرا کر بولی۔ ''کالی تو۔''

PDF BY Manzoor

''ہاں۔میں!''خون میں ڈوبی آنکھیں،سیاہ رنگت،باہر نکلی ہوئی سرخ زبان والی عورت نے اپنی آمد کا کرخت آواز میں اقرار کیا۔

''تو کیوں آئی ہے۔بگا کہاں ہے؟''رانی پنکھی سیدھی ہو کر بیٹھتی ہوئی بولی۔

''مجھے بگا نے بھیجا ہے،اس لیے آئی ہوں۔بگا کہاں ہے مجھے نہیں معلوم۔''جواب میں بے اعتنائی تھی۔

''وہ کیوں نہیں آیا؟''رانی پنکھی نے پوچھا۔

''یہ سوال پوچھنے کا تجھے حق نہیں۔وہ تیرا غلام نہیں۔''کالی نے اپنی سرخ آنکھوں سے گھورتے ہوئے کہا۔

''میں جانتی ہوں کہ وہ کیا ہے؟''رانی پنکھی اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی۔''بتا تو کیوں آئی ہے؟''

''بگا نے کہا ہے کہ اگر زندگی چاہتی ہے تو بھینٹ دینا ہوگی۔''انکشاف ہوا۔

''کیسی بھینٹ؟''رانی پنکھی نے پوچھا۔

''تجھے اپنا خون دینا ہوگا۔''کالی نے اپنی لمبی زبان ہلائی۔

''وہ اب میرے خون کا پیاسا ہو گیا۔''رانی پنکھی کے لہجے میں دکھ تھا۔

''بگا کی رانی بن جا۔تیرے سارے دکھ دور ہو جائیں گے۔''راستہ بتایا گیا۔

''کالی تو اپنی حد میں رہ۔مجھے تیرے مشورے کی ضرورت نہیں۔''رانی پنکھی غصے میں آ گئی۔

''پنکھی۔یاد رکھ تیری یہ اکڑ ایک دن تجھے لے ڈوبے گی۔''تنبیہ کی گئی۔

''تو میری فکر چھوڑ۔وہ بات کر جو بگا نے کہی ہے۔''

''کہا نا۔تجھے خون دینا ہوگا۔''کالی نے جواب دیا۔

''میرے خون کی ایک بوند چکھ کر اسے نشہ چڑھ گیا۔جا اس سے کہنا کہ پنکھی اپنے خون کی آخری بوند تک بھینٹ چڑھا دے گی لیکن وہ جو چاہتا ہے،اس کے لیے راضی نہ ہوگی۔''رانی پُرعزم لہجے میں بولی۔

''چل ٹھیک ہے۔پھر بھینٹ دے۔''کالی نے مٹی کا پیالہ اس کے سامنے کرتے ہوئے کہا۔

رانی پنکھی ایک جھٹکے سے غصے سے اٹھی۔اس نے چارپائی سیدھی کر کے دیوار کے ساتھ لگائی اور کچن میں جا کر ایک تیز دھار کی چھری اٹھا کر باہر آ گئی۔

''لا۔پیالہ ادھر کر۔''اس نے چارپائی پر بیٹھتے ہوئے اپنی بائیں کلائی پر چھری سے کٹ لگایا۔

نس کٹتے ہی خون تیزی سے نکلنے لگا۔کالی نے پیالہ اس کی کلائی کے نیچے کر دیا۔

جب آدھے سے زیادہ پیالہ بھر گیا تو رانی پنکھی نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔پھر اپنی کلائی کی نس کو دباتے ہوئے بولی۔''جا دفع ہو جا۔''

کالی نے یہ سن کر بھیانک قہقہہ لگایا اور پیالے سمیت غائب ہو گئی۔

اس کے جانے کے بعد رانی پنکھی باورچی خانے میں گئی۔اس نے ایک چٹکی راکھ نس پر ڈالی اور اسے انگوٹھے سے دبا دیا۔بہتا خون یکدم منجمد ہو گیا۔رانی پنکھی نے چند لمحوں بعد اپنا انگوٹھا زخم سے ہٹا لیا اور ایک گہرا سانس لے کر چارپائی پر لیٹ گئی۔اس کے چہرے پر ایک تلخ مسکراہٹ تھی۔

o.....o.....o

ڈاکٹر اعتبار نے اسکرین پر جو دیکھا،وہ اس کے ہوش اُڑا دینے کے لئے کافی تھا۔وہ پورے اطمینان سے عابر کی بچپن کی یادوں کو کرید رہا تھا۔اسکرین پر کچھ غیر واضح اشکال اُبھر رہی تھیں کہ اچانک ایک بلّی نمودار ہوئی۔

وہ کالے منہ کی سفید بلی تھی۔پہلے وہ ایک ہیولے کی شکل میں دھندلی نظر آئی۔پھر دیکھتے ہی دیکھتے اس نے ایک واضح شکل اختیار کر لی اور اتنی واضح ہو گئی کہ اس کا ایک ایک بال

PDF BY Manzoor

صاف نظر آنے لگا۔اس کی آنکھیں سرخ تھیں۔منہ کالا،جسم سفید اور پنجے کالے تھے۔

ابھی ڈاکٹر اعتبار اس کے بارے میں تجزیہ ہی کر رہا تھا کہ یہ کیا ہے اور کہاں سے آئی۔اتنے میں وہ کالے منہ کی سفید بلی ایکشن میں آ گئی۔اس نے اسکرین سے سیدھی ڈاکٹر اعتبار پر جست لگائی۔اگر وہ غیر ارادی طور پر جھک نہ گیا ہوتا تو وہ یقیناً اس کے چہرے سے ٹکراتی۔ڈاکٹر اعتبار نے جب پلٹ کر دیکھا کہ بلی کہاں گئی تو وہ اسے پورے کمرے میں کہیں نظر نہ آئی۔ڈاکٹر اعتبار کو اس طرح اچانک جھکتے دیکھ کر وہاں موجود ڈاکٹروں کو بڑی حیرت ہوئی۔

''سر کیا ہوا؟'' انچارج ڈاکٹر ساجد نے فکر مندی سے پوچھا۔

''کیا آپ نے وہ نہیں دیکھا جو میں نے دیکھا؟'' ڈاکٹر اعتبار نے اُلجھے ہوئے لہجے میں کہا۔

''سر.....آپ نے کیا دیکھا؟'' ڈاکٹر ساجد بولا۔

''میں نے سرخ آنکھوں اور کالے منہ کی سفید بلی دیکھی، جو اچانک اسکرین پر نظر آئی۔پھر اس نے اسکرین سے نکل کر مجھ پر چھلانگ لگائی تو میں اس سے بچنے کے لیے نیچے جھکا۔'' ڈاکٹر اعتبار نے ساری بات تفصیل سے بتائی۔

یہ سن کر وہاں موجود سارے اسٹاف کے منہ حیرت سے کھل گئے۔اُنہیں ڈاکٹر اعتبار کے بیان پر سخت حیرت ہوئی۔اس لیے کہ ایسا کوئی واقعہ پیش نہ آیا تھا۔اگر واقعی ایسا ہوا ہوتا تو اس بند لیب سے وہ بلی کہاں غائب ہو گئی۔اوّل تو اسکرین سے کسی بلی کا مجسم ہو کر نکلنا ہی بعید از قیاس تھا۔بالفرض اگر ایسا ہوا بھی تھا تو وہ بلی آخر کہاں گئی۔

ڈاکٹر اعتبار کا اصرار تھا کہ اس نے جو دیکھا ہے وہ بہ چشم خود دیکھا ہے۔دیگر اسٹاف پریشان آخر یہ کیوں کر ممکن ہے۔لیکن کیونکہ یہ باس کا فرمان ہے،اس لیے کیسے جھٹلایا جاتا۔سب نے مان لیا کہ آپ جو کہتے ہیں ٹھیک کہتے ہیں۔

ڈاکٹر اعتبار کیونکہ اَپ سیٹ ہو چکا تھا،اس لیے تجربے کو فوری طور پر ملتوی کر دیا گیا۔عابر نیم غنودگی کے عالم میں تھا۔دو گھنٹے آئی سی یو میں رکھ کر اسے اپنے کمرے میں بھیج دیا گیا۔

ڈاکٹر اعتبار نے وہاں اس مسئلے پر مزید کوئی بات نہ کی۔وہ لیب سے نکل کر اپنے مین آفس پہنچ گیا۔وہ ذہنی طور پر پریشان تھا۔اس نے سونی افتخار کو بلا بھیجا۔

وہ اس کی کال کی منتظر ہی تھی۔جیسے ہی اسے پیغام ملا،وہ سر کے بل دوڑتی چلی آئی۔وہ کمرے میں داخل ہوئی۔ڈاکٹر اعتبار اپنے دونوں ہاتھ سے سر پکڑے بیٹھا تھا۔

سونی کے مخصوص پرفیوم کی خوشبو پا کر اس نے اپنا سر اٹھایا اور سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔'' آؤ۔سونی!''

''کیا ہوا جیجا جی۔خیر تو ہے؟'' سونی یہ بات اچھی طرح جانتی تھی کہ ڈاکٹر اعتبار سے کس وقت کس انداز میں بات کرنی ہے۔اور یہ اندازہ ڈاکٹر اعتبار کے طرزِ تخاطب سے لگا لیتی تھی۔ڈاکٹر اعتبار کو سر پکڑے دیکھ کر وہ پریشان ہو گئی تھی۔اس نے آج تک اسے اس انداز میں نہیں دیکھا تھا۔وہ سیٹ پر بیٹھنے کے بجائے اس کے قریب آ کھڑی ہوئی اور بولی۔''سر میں درد ہو رہا ہے کیا؟ دبا دوں۔''

PDF BY Manzoor

''ارے نہیں۔''ڈاکٹر اعتبار مسکراتا ہوا بولا۔''سر میں درد نہیں ہو رہا۔ میں ایک اُلجھن کا شکار ہوں۔''

''جیجا جی۔آپ اور اُلجھن کا شکار۔ یہ ناقابلِ یقین بات ہے۔''

''کبھی کبھی ناقابل یقین باتیں بھی ہو جاتی ہیں۔ میرے ساتھ بھی ابھی کچھ ایسا ہی ہوا ہے۔''

''آپ تو لیب میں تھے۔کیا کوئی تجربے میں گڑبڑ ہو گئی۔''سوہنی نے کرسی سنبھالتے ہوئے پوچھا۔

''عابر تو بخیر ہے۔ وہ ایک دو گھنٹے میں اپنے کمرے میں پہنچ جائے گا۔''ڈاکٹر اعتبار نے سوہنی کا خدشہ دور کرتے ہوئے کہا۔''مسئلہ میرے ساتھ ہوا اور دلچسپ بات یہ ہے کہ وہاں موجود اسٹاف کا ہر شخص اس بات سے انکاری ہے۔''

''آخر ہوا کیا؟''سوہنی افتخار نے فکرمندی سے کہا۔

''تجربہ اپنی منزلیں طے کر رہا تھا۔ میری نظریں مانیٹر پر جمی تھیں۔ میں پوری توجہ سے اسکرین پر بنتی بگڑتی شکلوں کو دیکھ رہا تھا کہ اچانک ایک کالے منہ کی سفید بلّی اسکرین پر نمودار ہوئی اور اس سے پہلے کہ اس کے بارے میں کوئی رائے قائم کروں، بلّی نے اسکرین سے سیدھی میرے اوپر چھلانگ لگائی۔ اگر میں غیر ارادی طور پر جھک نہ جاتا تو یقیناً اس کا پنجہ میرے منہ پر پڑتا۔''

''ہائے۔نہیں۔''سوہنی درمیان میں مداخلت کیے بنا رہ نہ سکی۔

''سنو آگے کیا ہوا؟''ڈاکٹر اعتبار نے اسے مداخلت کرنے سے روکا۔''ہوا یہ کہ اس بلّی کا پتا نہ چلا کہ وہ کدھر گئی۔ بند کمرے سے اس کا نکل جانا ناممکن تھا۔لیکن وہ کمرے میں کہیں نہ ملی اور جب ڈاکٹروں کے پوچھنے پر میں نے انہیں بتایا کہ ایک بلّی نے کس طرح میرے اوپر چھلانگ لگائی تھی، تو وہ سارے کے سارے حیرت زدہ رہ گئے۔ انہوں نے بلّی کو چھلانگ لگاتے دیکھا ہی نہ تھا۔سوہنی میں کیا بتاؤں کہ ان کے انکار پر مجھے کس قدر شرمندگی ہوئی۔ میں سوچتا رہ گیا کہ آخر یہ لوگ میرے بارے میں کیا رائے قائم کریں گے۔''

''پھر کیا ہوا؟''

''بس پھر۔ میں نے تجربہ ملتوی کر دیا اور لیب سے یہاں چلا آیا۔''

''یہ آپ نے بہت اچھا کیا۔''سوہنی نے اس کے فیصلے کو سراہا۔

''میں کیا کرتا۔ ذہنی طور پر اس قابل نہیں رہا تھا کہ تجربہ جاری رکھتا۔''ڈاکٹر اعتبار بولا۔

''یہ واقعی بڑی انوکھی بات ہے۔''سوہنی بولی۔

''سوہنی۔کیا تم اس بات پر یقین رکھتی ہو کہ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں سچ کہہ رہا ہوں۔''

''جی۔ مجھے پکا یقین ہے کہ آپ جو کہہ رہے ہیں سچ کہہ رہے ہیں۔''سوہنی نے اس کی حوصلہ افزائی کی۔ پھر اچانک اس کے چہرے پر حیرت پھیل گئی۔اس کی نظریں ڈاکٹر اعتبار کے چہرے پر تھیں۔ وہ پریشان کُن انداز میں صوفے کی طرف دیکھ رہا تھا۔

''کیا ہوا؟ آپ ایسے کیوں دیکھ رہے ہیں؟''وہ پریشان ہو کر بولی۔

''وہ.....ادھر، صوفے پر دیکھو۔''ڈاکٹر اعتبار نے اشارہ کیا۔

''کیا ہے صوفے پر؟''سوہنی افتخار جہاں بیٹھی تھی، صوفہ اس کے دائیں جانب تھوڑا سا پیچھے رکھا تھا۔سوہنی نے اپنی گردن گھما کر صوفے کی طرف دیکھا۔سوہنی کو صوفے پر کچھ نظر نہ آیا تو وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

صوفے پر کالے منہ کی سفید بلّی موجود تھی۔ وہ اپنی سرخ آنکھوں سے ڈاکٹر اعتبار کو گھور رہی تھی۔ سوہنی کے اٹھتے ہی، وہ بھی صوفے پر کھڑی ہو گئی۔

''جیجا جی۔صوفہ تو خالی ہے۔''سوہنی صوفے کی طرف بڑھتی ہوئی بولی۔

اتنے میں کالے منہ کی سفید بلّی اپنی دونوں ٹانگوں پر جھکی اور اس نے سوہنی کے اوپر چھلانگ لگائی۔

''سوہنی بچنا۔''ڈاکٹر اعتبار نے گھبرا کر کہا۔

سوہنی پریشان ہو کر ایک طرف ہو گئی۔ اسے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا تو وہ بچتی کس چیز سے۔اس نے پوچھا۔''جیجا جی۔ ہے کیا؟ کچھ بتائیں تو۔''

''سوہنی۔ بلّی ہے۔ وہی لیب والی۔کالے منہ کی سفید بلّی۔''

''لیکن مجھے تو بلّی کہیں نظر نہیں آ رہی۔''سوہنی بولی۔

''تمہیں نظر نہیں آ رہی۔ وہ تو تمہارے کندھے پر بیٹھی ہے۔''ڈاکٹر اعتبار نے بتایا۔

''ہائے۔میں مر جاؤں۔''وہ جلدی سے صوفے پر بیٹھ گئی اور اس نے نادیدہ بلّی کو اپنے کندھے سے دھکیلنے کی تصوراتی کارروائی کی۔

ڈاکٹر اعتبار سفید بلّی پر نظریں جمائے ہوئے تھا۔ جیسے ہی سوہنی صوفے پر بیٹھی، اس نے لمبی زقند بھری اور سیدھی ڈاکٹر اعتبار کے اوپر آئی۔اس کا منہ کھلا ہوا تھا اور ہاتھ پھیلے ہوئے تھے۔

کالے منہ کی سفید بلّی کو اپنی طرف چھلانگ لگاتے دیکھ کر وہ فوراً میز کی آڑ میں ہو گیا۔ بلّی سامنے پردے سے ٹکرائی اور دیکھتے ہی دیکھتے غائب ہو گئی۔

سوہنی نے ڈاکٹر اعتبار کو میز کی آڑ میں بیٹھتے دیکھ لیا تھا۔ وہ جب اٹھ کر میز کے نزدیک آئی تو اس نے ڈاکٹر اعتبار کو میز کے اندر گھسا بیٹھا دیکھا۔

''سوہنی۔ وہ کدھر گئی۔''ڈاکٹر اعتبار نے سوہنی کے پیر دیکھتے ہی پوچھا۔

''جیجا جی۔ یہاں تو کوئی چیز نہیں ہے۔''سوہنی نے کمرے پر ایک طائرانہ نظر ڈالتے ہوئے کہا۔

ڈاکٹر اعتبار شرمندہ شرمندہ سا میز کے نیچے سے نکل آیا۔ دو تین گہرے سانس لے کر اس نے میز پر رکھا ہوا پانی پیا اور کرسی سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا اور خالی نظروں سے سوہنی کو دیکھنے لگا۔

''آپ پریشان نہ ہوں۔ یہاں اس کمرے میں کوئی چیز موجود نہیں ہے۔''

''اصل پریشانی میری یہی ہے۔''ڈاکٹر اعتبار بولا۔''جو میں دیکھتا ہوں، وہ کسی کو نظر نہیں آتا۔افسوس سوہنی تمہیں بھی نہیں۔''

''بائی گاڈ جیجا جی۔ میں صحیح کہہ رہی ہوں۔''سوہنی نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔''لیکن آپ کی کیفیت بتا رہی ہے۔ واقعی کوئی چیز ہے جو آپ کو ستا رہی ہے۔آپ ذرا دوبارہ پوری تفصیل سے ساری بات دہرائیں۔''

ڈاکٹر اعتبار نے دوبارہ ساری بات پوری جزئیات کے ساتھ سنا دی۔ سوہنی افتخار نے ساری بات سن کر کہا۔''کہیں اس بلّی کا عابر سے تو کوئی تعلق نہیں۔''

''سوہنی ایسا ہو سکتا ہے۔ وہ ایک غیر معمولی لڑکا ہے۔ یہ بات مجھے تجربے کے دوران محسوس ہوئی۔ یوں بھی بائی فیس وہ بہت چارمنگ ہے۔لیکن سوال یہ ہے کہ اس بلّی کا اس سے کیا تعلق ہو سکتا ہے۔ اگر کوئی تعلق ہے بھی تو وہ کالے منہ کی بلّی صرف مجھ ہی کو کیوں نظر آ رہی ہے۔ مجھے لگتا ہے جیسے وہ مجھے نقصان پہنچانا چاہتی ہو۔''ڈاکٹر اعتبار اُلجھن کا شکار تھا۔

''کیا اس واقعہ کا عابر کو علم ہے؟''سوہنی نے پوچھا۔

''میرے خیال سے نہیں۔اس وقت وہ ٹرانس میں تھا۔''ڈاکٹر اعتبار نے بتایا۔

''اس وقت عابر کہاں ہے؟''سوہنی نے سوال کیا۔

''آئی سی یو میں ہو گا۔ ٹھہرو، میں پوچھ کر بتاتا ہوں۔''یہ کہہ کر اس نے ریسیور اٹھایا اور ایک نمبر دبا کر اس نے عابر کے بارے میں معلومات کی۔ ادھر سے بتایا گیا کہ وہ وقت سے پہلے ٹرانس سے نکل آئے۔ بس آدھے گھنٹے میں انہیں اپنے کمرے میں بھیج دیا جائے گا۔

ریسیور رکھ کر وہ سوہنی سے مخاطب ہوا۔''آدھے گھنٹے کے بعد وہ اپنے روم میں چلا جائے گا۔''

''اگر آپ کی اجازت ہو تو میں اس سے بات کر لوں۔''سوہنی نے کہا۔

''ہاں۔کر لینا۔''ڈاکٹر اعتبار بولا۔''اس سے پوچھنا کہ کیا اس کے بچپن میں اس طرح کی کوئی بلّی اس کے گھر میں رہی ہے؟''

''جی۔ٹھیک ہے۔ میں نے آپ کی بات سمجھ لی ہے۔''سوہنی نے اٹھنے کے لیے پر تولے۔''جیجا جی۔ میں چلوں؟''

PDF BY Manzoor

''نہیں بیٹھو۔ میں چائے منگواتا ہوں۔'' ڈاکٹر اعتبار جس اُلجھن کا شکار تھا، وہ اس حال میں تنہا نہیں رہنا چاہتا تھا۔ سوہنی سے اس کی بہت اچھی انڈر اسٹینڈنگ تھی اور اس وقت اسے کسی ایسی ہی رفاقت کی ضرورت تھی۔

آدھے گھنٹے کے بعد سوہنی اس کے کمرے سے نکلی۔ عابر کے اپنے کمرے میں جانے کی اسے اطلاع مل چکی تھی۔ وہ سیدھی عابر کے پاس پہنچی۔ دستک دے کر جب وہ اندر داخل ہوئی تو اس نے اسے بڑے پُرسکون انداز میں بیڈ پر لیٹا پایا۔

سوہنی کو دیکھتے ہی وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ وہ تیزی سے آگے بڑھی اور بولی۔ ''عابر صاحب۔ آپ لیٹے رہیں۔''

''سوہنی صاحبہ۔ خدانخواستہ میں کوئی مریض تھوڑا ہی ہوں۔ وہاں لیب والے مجھے کچھ اسی طرح ٹریٹ کر رہے تھے۔ میں ان سے جان چھڑا کر چلا آیا۔'' عابر نے ہنستے ہوئے کہا۔

''کہیے۔ کیسا رہا ایکس پیریمنٹ!'' سوہنی نے حسبِ معمول اس کے بیڈ پر براجمان ہوتے ہوئے کہا۔

''یہ بات تو ڈاکٹر اعتبار ہی بتا سکتے ہیں۔'' عابر بولا۔ ''اچھا رہا یا بُرا۔ مجھے اُنہوں نے کچھ نہیں بتایا۔''

''میری ان سے بات ہوئی تھی۔ وہ کہہ رہے تھے کہ آپ ایک غیر معمولی آدمی ہیں۔'' سوہنی نے عابر کی آنکھوں میں مسکرا کر دیکھا۔ ''وری اسپیشل۔''

''سوہنی صاحبہ۔ آج کے معاشرے میں کسی معذور کو اسپیشل کہا جاتا ہے۔'' یہ کہہ کر وہ ہنسا۔

''آپ ایسے اسپیشل ہیں جس نے ہمیں مفلوج کر دیا ہے۔'' سوہنی نے اپنی ذہانت دکھائی۔

''اللہ نہ کرے۔'' عابر بولا۔

''اچھا۔ ایک بات بتائیں۔ آپ کو کبوتروں میں دلچسپی ہے؟'' سوہنی نے گرہ کھولنا شروع کی۔

''نہیں۔'' عابر نے جواب دیا۔

''بلیوں وغیرہ سے لگاؤ ہے؟'' سوہنی نے دوسرا سوال کیا۔

''نہیں۔ کیوں پوچھ رہی ہیں؟'' عابر پریشان ہوا۔

''گھر میں بھی کبھی کسی نے کوئی بلی نہیں پالی۔'' سوہنی نے ایک نیا سوال کیا۔

''نہیں۔ میرے گھر میں کسی کو ایسا شوق نہیں۔'' وہ بولا۔

''گھر میں اکثر بلیاں آجاتی ہیں۔ کبھی آپ نے کالے منہ کی سفید بلی جس کی دُم اور پاؤں بھی کالے ہوں، اپنے گھر میں آتی جاتی دیکھی؟''

''نہیں۔'' عابر نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''سوہنی صاحبہ۔ یہ آپ نے کس قسم کی تحقیق شروع کر دی۔''

''دراصل بات یہ ہے کہ آپ پر جو تجربہ کیا گیا ہے، اس میں ایک بلی کی نشاندہی ہوئی ہے۔ ڈاکٹر اعتبار براہِ راست آپ سے اس مسئلے پر بات کریں گے۔ میں تو یونہی پوچھ رہی تھی۔''

''اس کا مطلب ہے کہ میرے لاشعور سے کوئی کالے منہ کی سفید بلی نکل آئی ہے۔'' عابر نے ہنستے ہوئے سوہنی کو دیکھا۔

''ہاں۔ شاید۔'' سوہنی نے اس کی تائید کی۔

''ارے!'' عابر بے اختیار چونکا۔ اس کی نظریں بند دروازے پر تھیں، جہاں ایک کالے منہ کی سفید بلی پاؤں پھیلائے بیٹھی تھی۔

''خیریت۔ کیا ہوا؟'' سوہنی نے اس کی نظروں کے تعاقب میں دروازے کی طرف دیکھا۔ اس کا دل دھاڑ دھاڑ کرنے لگا۔ لیکن اسے کچھ نظر نہ آیا۔

اتنے میں وہ سفید بلی تیزی سے اٹھی۔ دوڑتی ہوئی آگے آئی۔ اس نے صوفے پر چھلانگ لگائی اور اس کی پشت پر چڑھ کر اپنی سرخ آنکھوں سے ان دونوں کو دیکھا اور وہیں سے ان کی طرف چھلانگ لگائی۔

عابر فوراً نیچے جھک گیا۔ سوہنی کو یہ سمجھتے دیر نہ لگی کہ وہ نادیدہ بلی کمرے میں داخل ہوگئی ہے اور اس نے عابر پر چھلانگ لگائی ہے۔ لیکن وہ یہ اندازہ نہ کر سکی کہ چھلانگ اس نے عابر پر نہیں، خود اس پر لگائی ہے۔

کالے منہ کی سفید بلی چھلانگ لگا کر سوہنی کے کندھے پر سوار ہوگئی۔ اس بار اسے اپنے کندھے پر شدید بوجھ محسوس ہوا۔ وہ بے ساختہ نیچے جھک گئی۔

''سوہنی صاحبہ۔ بلی۔'' عابر نے اس کے کندھے کی طرف اشارہ کیا۔

''ہائے۔ میں مرجاؤں۔'' سوہنی نے اپنے بائیں کندھے کی طرف ہاتھ بڑھا کر اسے دھکیلنے کی کوشش کی لیکن اس کے ہاتھ کچھ نہیں آیا۔ وہ بلی اسے دکھائی دی، نہ محسوس ہوئی۔

سفید بلی سوہنی کے کندھے سے نیچے اتری اور اپنے دو پنجے عابر کے گھٹنے پر رکھ کر منہ اٹھائے اسے دیکھنے لگی۔ پھر اس نے عابر کے گرد دو تین چکر کاٹے۔ چھلانگ لگا کر بیڈ سے اتری اور دروازے کے پاس جا کر دیکھتے دیکھتے غائب ہوگئی۔

سوہنی سہمی نظروں سے عابر کو دیکھ رہی تھی۔ اس کے کندھے سے بوجھ اتر گیا تھا۔ اس نے سمجھ لیا تھا کہ بلی اب اس کے کندھے پر نہیں ہے۔ وہ عابر کو بغور دیکھ رہی تھی اور اس کی حرکات سے اندازہ ہو رہا تھا کہ بلی اسے نظر آرہی ہے۔ بلی کی حرکت کے ساتھ اس کی نظریں بھی گھوم رہی تھیں۔ بالآخر اس کی نظریں دروازے پر جم گئیں۔

''گئی۔'' سوہنی نے اطمینان کا سانس لیتے ہوئے عابر سے پوچھا۔

''ہاں، گئی۔ کیا وہ آپ کو نظر آئی؟''

''نہیں۔'' سوہنی نے فوراً خود کو سنبھال لیا۔ ''لیکن وہ آپ کو نظر آرہی تھی۔''

''ہاں۔ میں نے اسے اچھی طرح دیکھا۔ اس کا منہ، دُم اور ٹانگیں کالی تھیں، بقیہ جسم سفید اور آنکھیں ایک دم سرخ تھیں۔ آپ اسی بلی کے بارے میں مجھ سے دریافت کر رہی تھیں؟'' عابر نے پوچھا۔

''جی۔ اسی بلی کے بارے میں پوچھ رہی تھی۔ آپ دوسرے آدمی ہیں جسے یہ بلی نظر آئی ہے۔ آپ اسے دیکھ کر خوفزدہ تو نہیں ہوئے؟'' سوہنی نے دریافت کیا۔

''نہیں۔ میرے ساتھ اس کا سلوک بہت دوستانہ تھا۔'' عابر نے بتایا۔

''لیکن ڈاکٹر اعتبار کے ساتھ اس کا سلوک بڑا جارحانہ ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے وہ انہیں نقصان پہنچانا چاہتی ہو۔'' یہ کہہ کر وہ فوراً بیڈ سے اٹھ گئی۔ ''میں چلتی ہوں۔''

پھر وہ تیزی سے کمرے سے نکل گئی۔ باہر نکلتے ہی اس نے اپنا موبائل فون آن کر کے ڈاکٹر اعتبار سے رابطہ کیا۔ فون ریسیو ہوتے ہی سوہنی بولی۔ ''آپ اس وقت کہاں ہیں؟''

''میں راستے میں ہوں۔ اسلام آباد جا رہا ہوں۔ کل دوپہر تک واپس آجاؤں گا۔'' ڈاکٹر اعتبار نے بتایا۔

''اوکے۔'' سوہنی سفید بلی سے متعلق اطلاع دینے کے لیے بے چین تھی۔ وہ بے تابی سے بولی۔ ''جیجاجی۔ میں نے خدشہ ظاہر کیا تھا نا کہ اس کالے منہ کی بلی کا عابر سے تعلق نہ ہو۔''

''تو کیا اس کا کوئی تعلق نکل آیا ہے؟'' ڈاکٹر اعتبار نے پوچھا۔

''ارے۔ جیجاجی، میں اس کے کمرے میں بیٹھی بلی سے متعلق سوالات کر رہی تھی کہ وہ کمبخت نمودار ہوگئی۔''

''کیا تم نے دیکھی؟'' ڈاکٹر اعتبار نے سوال کیا۔

''نہیں۔ مجھے تو نظر نہیں آئی لیکن اپنے کندھے پر اس کا بوجھ ضرور محسوس کیا۔ کلموہی ضرورت سے زیادہ وزنی ہے، لیکن عابر نے اسے بہت اچھی طرح دیکھا۔ اس نے جو حلیہ بیان کیا، وہ وہی ہے جو آپ نے بتایا تھا۔'' سوہنی نے ایک گہرا سانس لیا۔

''شکر ہے۔ کسی اور نے بھی دیکھا۔ کوئی گواہ ملا۔ ورنہ میں تو ذہنی اُلجھن کا شکار ہوگیا تھا۔'' ڈاکٹر اعتبار کے لہجے سے خوشی جھلک رہی تھی۔ ''ایک بات بتاؤ سوہنی۔ کیا وہ عابر پر جھپٹی تھی؟''

''نہیں۔ وہ کہہ رہا تھا کہ اس کا رویہ دوستانہ تھا۔''

''اچھا ٹھیک ہے۔ پھر کل بعد دوپہر تم سے ملاقات ہوگی۔ اوکے۔ ٹیک کیئر۔'' یہ کہہ کر ڈاکٹر اعتبار نے رابطہ منقطع کر دیا۔

سوہنی بات کرتی ہوئی ابھی ریسٹ ہاؤس کی باؤنڈری سے نکلی ہی تھی، اس نے اپنے بڑھتے ہوئے قدم روک دیئے۔ ڈاکٹر اعتبار نے کہا تھا کہ وہ کل دوپہر تک آئے گا۔ اس کا مطلب تھا کہ آج کی رات وہ تمام پابندیوں سے آزاد تھی۔ کچھ سوچ کر وہ مسکرائی اور واپس عابر کے کمرے کی طرف چل دی۔

O......O......O

رانی پنکھی پر اب یہ بات اچھی طرح واضح ہوگئی تھی کہ بگّا نے اس کی زندگی میں زہر گھول دیا ہے۔ وہ آہستہ آہستہ اسے سوئیاں چبھا رہا تھا۔ وہ اسے زچ کر دینا چاہتا تھا۔ اتنا بے بس کہ وہ اس کے قدموں پر سر رکھنے پر مجبور ہوجائے۔

وہ انارہ کو محفوظ کرنا چاہتی تھی۔ اس کا حل یہی تھا کہ وہ اسے اس کے سارے گھر جلد از جلد دکھا دے۔ اس وقت رات اپنے آخری پہر میں تھی۔ یہ وقت اس عمل کے لیے مناسب نہ تھا۔ اسے اگلی رات کا انتظار کرنا تھا۔

اگلی رات جیسے ہی آدھی ہوئی، اس نے چارپائی پر بیٹھی انارہ کو اشارہ کیا۔

انارہ سمجھ نہ سکی کہ رانی پنکھی کیا چاہتی ہے۔ اس نے پوچھا۔ ''ہاں۔ اماں بول۔''

''آجا۔ تجھے چھٹا گھر دکھاؤں۔'' رانی پنکھی کھڑے ہوتے ہوئے بولی۔ ''لا۔ کوئلہ لا۔''

انارہ یہ سن کر تیزی سے باورچی خانے میں گئی اور وہاں سے ایک کوئلہ اٹھا کر رانی پنکھی کے ہاتھ میں تھما دیا۔

رانی پنکھی نئے سرے سے سات گھر بنانے لگی۔

''اماں۔ ایک بات بتا، تو کچھ پریشان ہے۔'' انارہ نے پوچھا۔

''ہاں انجو۔ تو نے ٹھیک اندازہ لگایا۔'' رانی پنکھی نے لکیر کھینچتے ہوئے کہا۔

''اماں تُو تو پریشان ہونے والوں میں سے نہیں ہے۔ پریشان کرنے والوں میں سے ہے۔'' انارہ نے صاف گوئی سے کہا۔

''میری انجو۔ کبھی کبھی اونٹ بھی پہاڑ کے نیچے آجاتا ہے۔'' رانی پنکھی نے اپنا لہجہ شگفتہ بنانے کی کوشش کی۔

''اماں۔ تو پہاڑ کے نیچے سے نکل کیوں نہیں آتی۔'' انارہ نے جوش دلایا۔

''مجھے اپنے سے زیادہ اب تیری فکر ہے۔'' رانی پنکھی نے کہا۔

''اماں مجھ سے زیادہ اپنی فکر کر۔ تجھے کچھ ہوگیا تو میں بن موت ماری جاؤں گی۔''

''تو پریشان نہ ہو۔ میں تجھے مرنے نہ دوں گی۔'' رانی پنکھی نے بڑے یقین سے کہا۔ ''چل آجا۔ چھٹے گھر میں بیٹھ جا۔''

انارہ نے چارپائی سے اٹھ کر پہلے گھر میں قدم رکھا۔ پھر اچھل اچھل کر چھٹے گھر میں پہنچی۔ رانی پنکھی نے اسے اُچھلتے ہوئے دیکھا تو بولی۔ ''بچپن یاد آرہا ہے کیا؟''

''ہاں اماں۔ یونہی سمجھ لے۔ ویسے بچپن بھی کوئی بھولنے والی چیز ہے۔'' انارہ یہ کہہ کر زور سے ہنسی۔ پھر بولی۔ ''اماں۔ میں تو خیر سے ابھی بچی ہوں۔''

''تو کب تک بچی بنی رہے گی۔ تو سولہ سال کی ہونے والی ہے۔'' رانی پنکھی بولی۔ ''اچھا، چل اب جلدی سے تیار ہوجا۔''

انارہ چھٹے گھر میں رانی پنکھی کی طرح پھسکڑا مار کر بیٹھ گئی۔ ''اماں میں تیار ہوں۔''

رانی پنکھی نے چاندی کا بھاری تعویذ گلے سے اتار کر ہاتھ میں پکڑا اور مٹھی بند کرتے ہوئے کچھ پڑھ کر اس نے انارہ کی طرف پھونک ماری اور بولی۔ ''ہاں، بتا کیا نظر آرہا ہے؟''

''اماں۔ کوئی لڑکی سنک کے سامنے کھڑی برتن دھو رہی ہے۔ میری طرف اس کی پشت ہے۔ میں اس کا چہرہ نہیں دیکھ سکتی، لیکن جو بھی ہے، پُرکشش جسم کی مالک ہے۔'' انارہ کی آواز آئی۔

''اس لڑکی کا نام نورین ہے۔ انجو یہ تو ہے۔ اب تو دیکھتی جا۔'' رانی پنکھی بولی۔

تب انارہ کو کچن کے دروازے پر ایک دبلا پتلا مرد نظر آیا۔ وہ کوئی پچاس پچپن سال کا ہوگا۔ انارہ کو اس کی آنکھوں میں شیطان ناچتا ہوا دکھائی دیا۔ اس خبیث شخص نے کچن کے دروازے پر کھڑے ہو کر اِدھر اُدھر دیکھا اور دبے پاؤں اندر داخل ہوگیا۔

نورین دیگچی مانجھنے میں محو تھی۔ اس کے ہاتھ بہت تیزی سے چل رہے تھے۔ سنک میں دیگچی ٹکرانے کی وجہ سے کھٹ کھٹ کی آوازیں آرہی تھیں۔ وہ اس بات سے بے خبر تھی کہ کوئی اس کے پیچھے آکھڑا ہوا ہے اور کسی بھی لمحے اسے اپنی گرفت میں لینے والا ہے۔

جیسے ہی اس نے اپنی شیطانی گرفت میں لیا تو نورین کو ایک دَم غصہ آگیا۔ یہ تو اس کے تصور میں بھی نہیں تھا کہ اس کے پیچھے اس کے شوہر نعمان کے بجائے اس کا دوست ریحان ہوگا۔ اسے غصہ اپنے شوہر پر تھا۔ وہ اس سے ناراض تھی اور اس کو کسی قسم کی ''رعایت'' دینے کو تیار نہ تھی۔

گرفت میں لینے کے بعد جب اس شیطان نے منہ کھولا۔ ''کیسی ہو میری......''

تو وہ تڑپ کر اس کی گرفت سے نکل گئی۔ اس نے ریحان کو دھکا دیا۔ نورین کم عمر اور صحت مند جسم کی مالک تھی۔ دبلا پتلا ریحان دھکا کھا کر پیچھے ہوا تو نورین کچن سے بھاگی۔ ریحان نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے حصار میں لینے کی کوشش کی تو وہ چکنی مچھلی طرح کی اس کے ہاتھوں سے نکل گئی۔

وہ اب آگ بن چکی تھی۔ اس نے گھوم کر ایک زوردار تھپڑ اس کے منہ پر مارا اور بولی۔ ''شیطان کے بچے۔ جا چلا جا ورنہ ابھی تجھے کاٹ کر پھینک دوں گی۔'' اس نے سنک پر

PDF BY Manzoor

پڑی ہوئی تیز چھری ہاتھ میں لے لی اور اس پر حملہ کرنے کے لیے تیار ہوگئی۔ تھپڑ کھانے کے بعد نورین کو شیرنی کی طرح بپھرا دیکھ کر ریحان کے حوصلے پست ہو گئے۔ اس نے یہاں سے نکل جانے میں ہی عافیت جانی۔

اس کے جانے کے بعد نورین نے چھری سنک میں پھینکی اور کچن میں بیٹھ کر سسک سسک کر رونے لگی۔

نورین کی قسمت تو اسی دن آنسوؤں میں بھیگ گئی تھی جب وہ بیاہ کر اپنے سسرال پہنچی تھی۔ یہ ”وٹے سٹے“ کی شادی تھی۔ نورین کے بھائی کو تو ایک اچھی سلیقے کی لڑکی مل گئی تھی لیکن اس کے نصیب میں ایک نکھٹو شوہر آیا تھا۔

نعمان چالیس سے اوپر کا تھا جبکہ نورین کی عمر بیس بائیس سال سے زیادہ نہ تھی۔ چلو وہ ادھیڑ عمر کے بندے کو برداشت کر لیتی، بہ شرط یہ کہ وہ کام والا ہوتا۔ نعمان کے گھر والوں نے جھوٹ بول کر نورین کے والدین کو پھنسایا تھا۔ نعمان کے بارے میں کہا گیا تھا کہ وہ پراپرٹی کا کام کرتا ہے۔ ایک پراپرٹی ڈیلر کے ہاں وہ ان دنوں بیٹھتا بھی تھا۔ اس کے بارے میں زیادہ چھان بین نہ کی گئی اور نعمان کی ماں کی چکنی چپڑی باتوں میں آ کر انٹر پاس نورین کو ایک ایسے شخص کے ساتھ باندھ دیا گیا جو نکھٹو تو تھا ہی، ساتھ ہی وہ اَن پڑھ تھا۔ اس نے کسی اسکول کی شکل تک نہ دیکھی تھی جبکہ اسے میٹرک پاس بتایا گیا تھا۔

وہ ایک جگہ ٹک کر کام کرنے کا عادی نہ تھا۔ پانچ دن نوکری پر جاتا تو دس دن گھر میں پڑا اینڈتا رہتا۔ ایسے نکھٹو شخص کی اصولی طور پر شادی ہونا ہی نہیں چاہیے، لیکن ماں کی ممتا کو کیا کیجئے جو چاند سی دلہن لانے کو ہمہ وقت بے چین رہتی ہے۔

نعمان کے بھائی پریشان تھے۔ وہ اکیلا ہی ان پر کیا کم بوجھ تھا کہ کھانے والوں میں اس کی بیوی نورین کا بھی اضافہ ہو گیا۔ چند ماہ تو بھائیوں نے اسے گھر بٹھا کر کھلایا۔ جب شادی کے بعد بھی اس نے اپنی روش نہ بدلی تو انہوں نے اسے گھر چھوڑنے کا نوٹس دے دیا۔

نعمان نے یہ بات ایک کان سے سنی اور دوسرے سے نکال دی۔ بھلا وہ اس گھر سے نکل کر کہاں جاتا۔ تب ایک بھائی نے گھر کے قریب ہی ایک چھوٹا سا مکان اسے کرائے پر دلوا دیا اور نورین کے جہیز کا سامان وہاں ڈلوا دیا۔ اگرچہ نعمان اب بھی دوسرے گھر میں منتقل ہونے کے لیے تیار نہ تھا لیکن نورین کے لیے یہ بات انتہائی ندامت کی تھی۔ وہ اپنے شوہر کو لے کر نئے گھر میں آ گئی۔

اس نے اپنے شوہر کو سمجھایا۔ اس کی غیرت جگائی۔ تب وہ ایک گارمنٹس کے کارخانے میں جانے لگا۔ وہ سلائی کا کام جانتا تھا۔ نورین نے ایک پرائیویٹ اسکول میں بطور ٹیچر ملازمت ڈھونڈ لی، اگرچہ تنخواہ کم تھی لیکن کچھ نہ ہونے سے تو بہتر تھی۔

نعمان کا ایک دوست تھا ریحان۔ وہ اس سے دس سال بڑا تھا۔ وہ اکثر گھر آ جاتا تھا۔ نعمان نے اس سے اپنی شادی کے لیے ایک موٹی رقم ادھار لی ہوئی تھی۔ نعمان اس کا احسان مند تھا۔ قرض لیے ایک سال ہونے کو آیا تھا۔ قرض اتارنے کی سبیل نہ تھی۔ قرض اتارنا تو دور کی بات، نعمان اس چکر میں تھا کہ مزید قرض مل جائے۔ کھانے کے علاوہ اب تو مکان کا کرایہ بھی سر پر پڑ گیا تھا۔

نورین کو گھر میں ریحان کی آمد پسند نہ تھی۔ وہ آ کر بیٹھ جاتا تو جانے کا نام نہ لیتا تھا۔ ایک کمرے کا مکان چھوٹا سا صحن۔ نورین اس کی خواہش بھری آنکھوں سے خود کو کہاں تک محفوظ رکھتی۔ وہ اس کے آتے ہی کچن میں ”پناہ“ لے لیتی۔ نعمان کو کھڑا دیکھ کر ریحان بھی کچن میں آ جاتا۔ نورین کو سخت کوفت ہوتی۔ اس بندے سے اسے چڑ تھی۔ وہ اپنے شوہر سے کہتی کہ یہ تمہارا دوست ہے، اس سے باہر ملا کرو، گھر میں نہ لایا کرو۔ وہ اسے یاد دلاتا کہ یہ مت بھولو ہم اس کے مقروض ہیں اور یہ قرض میں نے تمہیں اپنے گھر لانے کے لیے لیا تھا۔ اگر وہ گھر آ جاتا ہے تو اس میں اعتراض کی بھلا کیا بات ہے۔ قرض کا ذکر سن کر نورین چپ ہو جاتی۔

نورین کی چھٹی حس پکار پکار کر کہہ رہی تھی کہ ریحان کی گھر میں بڑھتی ہوئی آمد خالی از علت نہیں۔ ایک دن نعمان نے اس سے کہا۔ ”نورین، ریحان میرا دوست ہے۔ اس کا خیال رکھا کرو۔ وہ شکایت کر رہا تھا کہ بھابی مجھ سے بات نہیں کرتی۔ اس نے قرض واپس کرنے کو کہا ہے۔ اس کا تقاضا بڑھتا جا رہا ہے۔ بتاؤ۔ میں قرض اتارنے کے لیے رقم کہاں سے لاؤں۔ ذرا اسے ہاتھ میں رکھو۔ چائے وائے پلا دیا کرو اور ہاں کبھی وہ میری غیر موجودگی میں آ جائے تو اسے بٹھا لینا۔ میں آس پاس ہی کہیں گیا ہوں گا۔ آ جاؤں گا۔“

یہ خطرے کی گھنٹی تھی جو اس کے عین سر پر بج رہی تھی۔ اس نے اپنے شوہر کو سمجھانے کی کوشش کی۔ ”دیکھو، نعمان۔ مجھے اس سے ڈر لگتا ہے۔ وہ عجب انداز میں مجھے گھورتا ہے۔ اسی لیے میں اس سے بھاگتی ہوں۔“

”ارے۔ ایسی کوئی بات نہیں۔“ نعمان نے ہنستے ہوئے کہا۔ ”وہ بہت شریف آدمی ہے۔ تم خواہ مخواہ اس میں عیب نہ نکالو۔“

نورین نے اندر ہی اندر اپنا سر پیٹ لیا۔ اس مکالمے کے بعد شوہر سے اور کیا کہا جا سکتا تھا۔ اس نے خود پر قابو پاتے ہوئے آہستہ سے کہا۔ ”اچھا۔ میں کوشش کروں گی۔“ لیکن دل میں اس نے ٹھان لی تھی۔ وہ ہرگز اس سے راہ و رسم نہ بڑھائے گی۔

ایک دن دوپہر کے کھانے کے بعد نعمان گھر سے یہ کہہ کر نکلا۔ ”میں ذرا چائے کے لیے دودھ لے آؤں۔ تم دروازے کی کنڈی نہ لگانا۔ میں پانچ منٹ میں آیا۔“

”اچھا۔“ نورین نے کہا اور سنک میں پڑے برتن دھونے کھڑی ہو گئی۔ برتن دھوتے ہوئے وہ اپنی اذیت ناک زندگی کے بارے میں سوچنے لگی۔ نعمان کئی دن سے کام پر نہیں جا رہا تھا۔ آج صبح سے کئی بار اس سے لڑائی ہو چکی تھی۔ وہ سخت غصے میں تھی۔ دوپہر کو کھانے کے لیے گھر میں کچھ نہ تھا۔ نعمان جانے کہاں سے کچھ رقم لے کر آیا تھا۔ تب گھر کا چولہا جلا تھا۔ اس کی زندگی سسک سسک کر گزر رہی تھی۔

وہ ابھی انہی سوچوں میں غلطاں تھی کہ ریحان کھلے دروازے سے اندر آیا اور کسی عفریت کی طرح اس نے نورین پر چھانے کی کوشش کی لیکن تھپڑ کھانے اور چھری دیکھنے کے بعد ریحان کے چھکے چھوٹ گئے۔ وہ بدحواس ہو کر گھر سے نکلا۔ وہ سیدھا اس ہوٹل میں پہنچا جہاں نعمان بیٹھا چائے پی رہا تھا۔ ریحان نے گھر میں جو بیتی تھی، وہ شدید غصے کے عالم میں سنا ڈالی۔

نعمان کو تھوڑی بہت مزاحمت کی ضرور توقع تھی لیکن وہ اس قدر جارحانہ انداز اختیار کرے گی، اس کی اس کو ہرگز توقع نہ تھی۔ اسی وقت اس نے فیصلہ کر لیا کہ اس ”ستی ساوتری“ کو وہ مزہ چکھا کر رہے گا۔ ایسا انتقام لے گا کہ وہ زندگی بھر یاد رکھے گی۔

جب نعمان گھر واپس پہنچا تو نورین بیڈ پر پڑی زار زار رو رہی تھی۔ نعمان نے روتی ہوئی نورین کو نفرت بھری نظروں سے دیکھا۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ ابھی جوتا اٹھا کر اس کی ٹھکائی شروع کر دے اور اس کی ساری پارسائی جوتے کے ذریعے جھاڑ دے لیکن اس نے ایسا نہ کیا۔

بیڈ پر بیٹھ کر اس نے پریشانی کی اداکاری کرتے ہوئے رونے کی وجہ پوچھی۔ نورین نے رو رو کر ریحان کی دست درازی کی کتھا حرف بہ حرف سنا دی۔ نعمان یہ سب سن کر آگ بگولا ہو گیا۔ اس نے ریحان کو قتل کرنے کی دھمکی اور نورین کو شاباش دی کہ اس نے جو کیا کم کیا۔ اسے چھری مار دینی چاہیے تھی۔

شوہر کی بات سن کر نورین کو بہت خوشی ہوئی۔ وہ آنسو پونچھتی ہوئی اٹھ گئی اور اس نے نعمان کو قسم دی کہ وہ ریحان کو کچھ نہیں کہے گا، جو سزا اس نے دے دی وہ کافی ہے۔

اگلے دن نعمان صبح ہی صبح گھر سے چلا گیا۔ جاتے ہوئے اس نے کہا۔ ”نورین میں کام پر جا رہا ہوں۔ تم اندر سے دروازہ بند کر کے تالا ڈال لو۔ کوئی آئے دروازہ ہرگز مت کھولنا۔“

نعمان کو کام پر جاتے دیکھ کر وہ نہال ہو گئی۔ اسے یہ بھی خوشی تھی کہ اس کے شوہر کو اس کے تحفظ کا احساس ہو گیا تھا۔ وہ دن بھر گھر میں مگن گھومتی رہی۔ اس نے اپنے گھر کو صفائی کر کے چمکا دیا۔

نعمان رات تک گھر لوٹا۔ وہ بازار سے اس کے لیے نہاری روٹی لایا تھا۔ ساتھ میٹھے پان بھی تھے۔ یہ دونوں چیزیں اس کی پسندیدہ تھیں۔ اس نے اپنے شوہر کو پیار بھری نظروں سے دیکھا اور سوچا آج رات کو وہ ڈھیروں پیار اس پر نچھاور کر دے گی۔ اس کی ساری محرومی دور کر دے گی۔

رات کا کھانا کھانے کے بعد نعمان اس سے معافیاں مانگتا رہا۔ اس نے وعدہ کیا کہ آئندہ وہ نوکری پر جائے گا اور اس کے سارے دکھ دور کر دے گا۔ ریحان کے بارے میں اس نے بتایا کہ اب وہ کبھی گھر پر نہیں آئے گا۔ اس نے اس سے قطع تعلق کر لیا ہے۔

”اس منحوس کے قرضے کا کیا ہوگا۔“ نورین نے فکر مند ہو کر کہا۔

”میں نے اپنے بڑے بھائی سے بات کی ہے۔ اگر وہ کچھ رقم ادھار دے دیں تو وہ ریحان کو دے کر بقیہ رقم قسطوں میں ادا کر دوں گا۔“ نعمان نے بتایا۔

”میں بھی اپنی کسی اسکول ٹیچر سے کمیٹی کی بات کرتی ہوں۔ اگر پہلی مل جائے تو اچھا ہو۔“ نورین بولی۔

”اچھا چلو کر لینا۔“ نعمان تسلی آمیز لہجے میں بولا۔ ”کیا اب میں آپ کی خدمت میں میٹھا پان پیش کروں۔“

”لو نیکی اور پوچھ پوچھ۔“ نورین ہنس کر بولی۔ ”جلدی نکالو، کہاں چھپا کر رکھے ہیں۔“

نعمان نے پینٹ کی جیب میں ہاتھ ڈال کر پُڑا نکالا اور بولا۔ ”یہ ہیں۔“

پُڑے میں دو بڑے پان تھے۔ اس کی طرف ایک پان بڑھاتے ہوئے نعمان نے کہا۔ ”میں اپنے ہاتھ سے کھلاؤں گا۔“

نورین نے خوشی سے سرشار ہو کر کہا۔ ”ہاں۔ کیوں نہیں۔“

پھر نعمان نے دونوں پان ایک ایک کر کے اسے کھلا دیے اور اس سے چکنی چپڑی باتیں کرتا رہا۔ وہ اس وقت تک اس سے باتیں کرتا رہا، جب تک اس کے جسم میں شدید تکلیف نہ شروع ہو گئی۔

انارہ کچھ دیر اسے تڑپتا دیکھتی رہی۔ پھر چیخی۔ ”اماں۔ بس۔“

PDF BY Manzoor

''کیا ہوا؟'' رانی پنکھی اس کی چیخ سن کر چونکی۔

''اماں۔ وہ بری طرح تڑپ رہی ہے۔ خون کی اُلٹیاں کر رہی ہے اور اس کا کمینہ شوہر اسے دیکھ کر مسکرا رہا ہے۔ اماں بند کر دے ورنہ مجھے کچھ ہو جائے گا۔'' انارہ دُکھی لہجے میں بولی۔

''اچھا۔ بند کرتی ہوں۔ دھیرج رکھ۔'' رانی پنکھی نے اپنی بند مٹھی کھولی۔ جلدی جلدی کچھ پڑھا اور انارہ کی طرف پھونک ماری۔ پھونک مارتے ہی المناک منظر غائب ہو گیا۔

رانی پنکھی نے گلے میں چاندی کا بھاری تعویذ ڈالا اور ساتویں گھر سے نکل کر چارپائی پر آ بیٹھی جبکہ انارہ سکتے کے عالم میں چھٹے گھر میں بیٹھی رہی۔

''انجو آ جا۔ کب تک وہاں بیٹھی رہے گی۔'' رانی پنکھی چارپائی پر لیٹتے ہوئے بولی۔

''آتی ہوں اماں۔'' انارہ خود کو سمیٹتی، حواس بحال کرتی، چھٹے گھر سے نکل آئی۔

اسے اُٹھتا دیکھ کر رانی پنکھی نے اپنے پاؤں سکوڑ لیے۔ انارہ چارپائی کی پائنتی بیٹھ گئی اور اس کے سوکھے پاؤں اپنی گود میں رکھ کر دبانے لگی۔

''اماں۔ وہ بری طرح تڑپ رہی تھی۔ خون کی اُلٹیاں کر رہی تھی۔ اسے کیا ہو گیا تھا؟'' انارہ نے گہری سانس لے کر کہا۔ ''اس کمینے نے نورین کو کیا کھلا دیا تھا۔''

''اس نے پانوں کے ذریعے پارہ کھلا دیا تھا۔ جس نے اس کا معدہ کاٹ دیا۔ پارے کا یہ زہر اس قدر خطرناک ہوتا ہے کہ آدمی کسی صورت بچ نہیں سکتا۔'' رانی پنکھی نے بتایا۔

''اماں۔ میں اپنی موتیں دیکھ دیکھ کر پاگل ہوتی جا رہی ہوں۔ مجھ سے نہیں دیکھا جاتا اب یہ سب۔'' انارہ بھیگی آواز میں بولی۔

''اس سنسار میں عورت کے لیے کانٹے ہی کانٹے ہیں۔ ان چھ گھروں میں گھوم کر تجھے اچھی طرح اندازہ ہو گیا ہو گا کہ تو یعنی عورت کیا ہے؟''

''ہاں۔ اماں، بہت اچھی طرح۔ اب ایک گھر اور رہ گیا ہے۔ وہ بھی دکھا دے۔ جانے اس میں کیسی موت لکھی ہو۔'' انارہ خوفزدہ انداز میں بولی۔

''ساتویں گھر میں ایسا کچھ نہیں۔ لیکن جو کچھ ہے، وہ کسی آگ کے دریا سے کم نہیں۔ اگر تو نے یہ آگ کا دریا پار کر لیا تو پھر تیری زندگی پھول بن جائے گی اور اگر نہ پار کر سکی تو پھر جلنا تیرا مقدر ٹھہرے گا۔'' رانی پنکھی نے اسے اگلی زندگی کا عکس دکھایا۔

''اماں۔ تیرا ابھی کچھ ٹھیک نہیں۔ کبھی کہتی ہے کہ کوئی آ کر تیرے بھاگ جگائے گا اور کبھی کہتی ہے کہ آگ کا دریا میرا مقدر ہو گا۔ آخر میں تیری کس بات پر یقین کروں؟''

''دونوں باتوں پر۔'' رانی پنکھی نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ''جا اب تو اپنے کمرے میں جا۔''

o.....o.....o

لیکن وہ عابر کے کمرے میں نہ گئی۔

سونی نے ریسٹ ہاؤس کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اپنا ارادہ بدل دیا۔ اسے معلوم تھا کہ اس وقت ریسٹ ہاؤس کے تین کمرے خالی ہیں۔ وہ یہ بھی جانتی تھی کہ ان بند کمروں کا جاسوسی کا خفیہ نظام معطل ہے۔ لہٰذا بہتر یہی تھا کہ ایسے کمرے میں قیام کیا جائے جو ہر لحاظ سے محفوظ ہو۔

یہ خیال آتے ہی اس کا چہرہ گلنار ہو گیا۔ اس نے بہت تیزی سے روم نمبر چار کھلوانے کا انتظام کیا۔

کمرے میں پہنچ کر وہ پورے اطمینان سے بیڈ پر لیٹ گئی اور کچھ دیر بعد ہونے والے ''ناٹک'' کا ایک ایک منظر ذہن میں سوچنے لگی۔ جب اس نے ہر بات ذہن کے اسکرین پر لکھ لی تو وہ باہر آئی۔ اس نے عابر کے کمرے پر متعین لیڈی گارڈ کو اشارے سے اپنے پاس بلایا۔

''جی میڈم۔'' وہ قریب آ کر مؤدبانہ انداز میں بولی۔

''دیکھو۔ صاحب سے کہنا کہ آپ کو میڈم بلا رہی ہیں۔ اس پیغام دینے کے بعد تم ڈیوٹی آف کر کے چلی جانا۔ مجھے یہاں لیڈی کمانڈوز کو تعینات کرنا ہے۔'' سونی افتخار نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔

''جی بہتر۔'' لیڈی گارڈ واپس عابر کے کمرے کی طرف چل دی۔

چند لمحے وہ لیڈی گارڈ کو جاتے ہوئے دیکھتی رہی، پھر وہ کمرے میں داخل ہو گئی۔

لیڈی گارڈ نے دروازے پر دستک دی اور چند لمحوں کے توقف کے بعد دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گئی۔

عابر بیڈ پر لیٹا اس کالے منہ کی سفید بلی کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ آخر وہ کیا چیز تھی جو صرف اسے نظر آئی۔ کمرے میں اچانک نمودار ہوئی اور پھر جیسے آئی تھی ویسے چلی گئی۔ وہ بلی اس سے کچھ مانوس سی محسوس ہوئی، جس انداز سے اس نے دیکھا اور پھر اس کے گرد چکر لگائے، وہ اس بات کے غماز تھے کہ بلی کو اس سے خصوصی دلچسپی ہے۔

دروازے پر ہونے والی دستک نے اسے چونکایا۔ وہ فوراً اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ اس وقت کون آ گیا۔ سونی کچھ دیر قبل ہی یہاں سے گئی تھی۔ اتنی جلد اس کی واپسی کا امکان نہ تھا۔

لیڈی گارڈ کو اندر آتے دیکھ کر اس کی آنکھوں میں سوال آیا۔ لیڈی گارڈ نے دروازہ کھول کر اندر جھانکا اور مؤدبانہ انداز میں بولی۔ ''سر۔ میں اندر آ سکتی ہوں؟''

''ہاں۔ آیئے۔'' عابر بولا۔

بیڈ کے قریب آ کر لیڈی گارڈ نے ایک نظر عابر کو دیکھا۔ پھر بولی۔ ''سر۔ آپ کو میڈم بلا رہی ہیں۔''

''میڈم۔ کہاں ہیں وہ؟'' عابر نے پوچھا۔

''سر۔ وہ روم نمبر فور میں موجود ہیں۔''

''اچھا۔'' عابر نے کہا اور بیڈ سے اُتر کر اس کے ساتھ چل دیا۔

عابر نے باہر آ کر لیڈی گارڈ سے پوچھا۔ ''روم نمبر فور کہاں ہے؟''

''سر۔ آپ سیدھے چلے جایئے۔ آخری کمرا چار نمبر ہے۔'' لیڈی گارڈ نے بتایا۔

''او کے۔'' عابر سوچنے لگا۔ آخر سونی اس کے کمرے میں کیوں نہیں آئی۔ وہاں چار نمبر کمرے میں کیا ہے۔ کیا وہاں ڈاکٹر اعتبار موجود ہے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ بلی کے متعلق کچھ پوچھنا چاہتا ہو۔ اس پُراسرار بلی نے سب کو نچا کر رکھ دیا تھا۔ جانے یہ اچانک کہاں سے نمودار ہو گئی۔ یہ سوچتا ہوا وہ روم نمبر چار کے دروازے پر پہنچا۔ اس نے آہستہ سے دستک دی اور پھر ہینڈل پر ہاتھ رکھ کر دباؤ ڈالا لیکن خلافِ توقع دروازہ نہ کھلا۔ عابر نے پھر دستک دی۔

جواب میں فوراً ہی دروازہ کھلا لیکن تھوڑا سا۔ اندر سے سونی کی آواز آئی۔ ''دو منٹ کے بعد بغیر دستک دیئے اندر آ جایئے گا۔''

''جی اچھا۔'' عابر نے کہا۔

سونی دروازہ بند کر کے واپس پلٹی۔ پھر وہ تیزی سے واش روم میں گئی۔ ایک منٹ کے بعد وہاں سے نکلی تو شرم و حیا نام کی کوئی چیز اس کے بدن پر نہ تھی۔ اس نے کمرے کی تمام لائٹس روشن کر دیں اور کسی ''اندھیرے'' کی طرح بیڈ پر لیٹ گئی اور آنکھوں میں ''خواہشوں کی برات'' سجائے دروازے کی طرف دیکھنے لگی۔

اسے اس بات کا اندازہ نہیں تھا کہ سر کے پیچھے کالے منہ کی سفید بلی نمودار ہو چکی ہے اور کوئی لمحہ جاتا ہے کہ وہ اس پر حملہ آور ہونے کو ہے۔

عابر نے باہر آ کر لیڈی گارڈ سے پوچھا۔ ''روم نمبر فور کہاں ہے؟''

''سر۔ آپ سیدھے چلے جایئے۔ آخری کمرا چار نمبر ہے۔'' لیڈی گارڈ نے بتایا۔

''او کے۔'' عابر سوچنے لگا۔ آخر سونی اس کے کمرے میں کیوں نہیں آئی۔ وہاں چار نمبر کمرے میں کیا ہے۔ کیا وہاں ڈاکٹر اعتبار موجود ہے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ بلی کے متعلق کچھ پوچھنا چاہتا ہو۔ اس پُراسرار بلی نے سب کو نچا کر رکھ دیا تھا۔ جانے یہ اچانک کہاں سے نمودار ہو گئی۔ یہ سوچتا ہوا وہ روم نمبر چار کے دروازے پر پہنچا۔ اس نے آہستہ سے دستک دی اور پھر ہینڈل پر ہاتھ رکھ کر دباؤ ڈالا لیکن خلافِ توقع دروازہ نہ کھلا۔ عابر نے پھر دستک دی۔

جواب میں فوراً ہی دروازہ کھلا لیکن تھوڑا سا۔ اندر سے سونی کی آواز آئی۔ ''دو منٹ کے بعد بغیر دستک دیئے اندر آ جایئے گا۔''

''جی اچھا۔'' عابر نے کہا۔

سونی دروازہ بند کر کے واپس پلٹی۔ پھر وہ تیزی سے واش روم میں گئی۔ ایک منٹ کے بعد وہاں سے نکلی تو شرم و حیا نام کی کوئی چیز اس کے بدن پر نہ تھی۔ اس نے کمرے کی تمام لائٹس روشن کر دیں اور کسی ''اندھیرے'' کی طرح بیڈ پر لیٹ گئی اور آنکھوں میں ''خواہشوں کی برات'' سجائے دروازے کی طرف دیکھنے لگی۔

اسے اس بات کا اندازہ نہیں تھا کہ سر کے پیچھے کالے منہ کی سفید بلی نمودار ہو چکی ہے اور کوئی لمحہ جاتا ہے کہ وہ اس پر حملہ آور ہونے کو ہے۔

دو منٹ کے بعد عابر پورے اعتماد سے دروازہ کھول کر اندر آیا۔ سونی نے اسے دیکھ کر بڑے والہانہ انداز میں کہا۔ ''آؤ، میرے مہینوال۔''

عابر کی اس پر نظر پڑی تو رات میں سورج نظر آ گیا۔ وہ فوراً پلٹ کر دروازے کی طرف بھاگا۔

اسے واپس جاتے دیکھ کر سونی تڑپ کر اٹھی۔ ''پلیز عابر۔ واپس مت جانا۔''

اس سے پہلے کہ وہ عابر کو جانے سے روکتی، کالے منہ کی سفید بلی ''ایکشن'' میں آ گئی۔ اس نے اس کی بے لباس پیٹھ پر پنجہ مارا۔ خون کی چار لکیریں اس کے کورے بدن پر بنتی چلی گئیں۔

وہ شدت تکلیف سے چیخی۔

عابر نے اس کی چیخ باہر نکل کر دروازہ بند کرتے ہوئے سنی لیکن اس نے پروانہ کی۔ وہ تیزی سے اپنے کمرے میں چلا گیا اور دروازہ بند کیا۔

سونی نے جب پلٹ کر دیکھا تو اسے کوئی نظر نہ آیا۔ لیکن اسے اپنے چہرے کی کھال ادھڑتی ہوئی محسوس ہوئی۔ کالے منہ کی سفید بلی نے نہ صرف اس کا چہرہ زخمی کر دیا بلکہ پورا جسم اپنے پنجوں سے لہولہان کر دیا اور پھر پورے اطمینان سے ٹہلتی ہوئی دروازے تک آئی اور باہر نکل گئی۔

سونی افتخار یہ جاننے سے قاصر رہی کہ اسے لہولہان کرنے کی کارروائی کس نے کی۔ لیکن اسے اتنا اندازہ ضرور ہو گیا تھا کہ عابر کے ساتھ کوئی ایسی چیز ہے جو اسے بچا رہی ہے۔ اس کی حفاظت کر رہی ہے۔ دوسری طرف عابر کو ذہنی جھٹکا لگا تھا۔ اسے ہرگز اُمید نہ تھی کہ سونی اس قدر پست ہو جائے گی۔ اس کی نظر میں سونی ایک کھلے دل کی سلجھی ہوئی باوقار عورت تھی۔ جانے اسے کیا ہوا تھا کہ وہ اپنا مقام چھوڑ کر مٹی بن گئی تھی۔ کہتے ہیں کہ نیکی بدی کے درمیان بس ایک لمحے کا فاصلہ ہوتا ہے۔ اب جو بھی لمحہ فیصلہ کن بن جائے۔ یہ بندے کا مقدر۔

سونی اپنے کمرے میں پہنچ چکی تھی۔ اس نے فون کر کے لیڈی ڈاکٹر کو بلوا لیا تھا۔ وہ دو نرسوں کے ساتھ آ کر اس کی ''مرہم پٹی'' کر گئی تھی۔ لیڈی ڈاکٹر نے بتایا تھا کہ یہ کسی جانور کے پنجوں کے نشانات ہیں۔ سونی کو اب اچھی طرح یقین آ گیا تھا کہ یہ کس جانور کے پنجوں کے نشانات ہیں۔ سونی نے ڈاکٹر کو اُلٹی سیدھی کہانیاں سنا کر مطمئن کرنے کی کوشش کی تھی لیکن لیڈی ڈاکٹر بے یقینی کی کیفیت میں مبتلا رہی تھی۔

لیڈی ڈاکٹر کے جانے کے بعد سونی چاہتی تھی کہ ڈاکٹر اعتبار کو فون کر کے حالات سے آگاہ کرے لیکن اس کے فون کرنے سے پہلے ہی ڈاکٹر اعتبار کا فون آ گیا۔ اس نے بعد دوپہر اسلام آباد سے واپس آنے کی بات دُہرائی اور ساتھ ہی اس نے عابر کے سلسلے میں چند ضروری ہدایات دیں۔

تب سونی نے اسے بتایا کہ نادیدہ بلی نے اسے زخمی کیا ہے۔ اسے یہ نہ بتایا کہ ایسا کیوں ہوا۔ بہرحال اسے یہ جان کر خوشی ہوئی تھی کہ ڈاکٹر اعتبار نے ایک غیر ملکی ایجنسی سے تیس لاکھ ڈالر میں عابر کا سودا کر لیا تھا۔ اب اس کو جلد از جلد دبئی روانہ کیا جانا تھا۔ وہاں کسی ایجنٹ کے حوالے کیا جاتا اور رقم وصول کر کے واپس لاہور آ جانا تھا۔

ڈاکٹر اعتبار چاہتا تھا کہ سونی، عابر کو لے کر دبئی جائے تاکہ اسے کسی قسم کا شک و شبہ نہ ہو۔ اب سونی نے اپنے زخمی ہونے کی خبر سنا دی تھی تو ڈاکٹر اعتبار نے کہا کہ اچھا میں آ کر دیکھتا ہوں کہ اس کے ساتھ کس کو بھیجا جائے۔ بہرحال اس اثنا میں اس کا پاسپورٹ اور ویزا کا بندوبست کیا جائے۔

لاہور ایئرپورٹ پر ڈاکٹر اعتبار کو لانے کے لئے گاڑی مع گارڈ موجود تھی۔ وہ پورے اطمینان کے ساتھ گاڑی میں براجمان ہوا اور گاڑی چل دی۔ ڈاکٹر اعتبار کے ساتھ تین لیڈی کمانڈوز پچھلی سیٹ پر موجود تھیں اور اس گاڑی کے پیچھے ایک اور گاڑی تھی جن میں ڈاکٹر اعتبار کے منتخب کردہ کمانڈوز موجود تھے۔

ڈاکٹر اعتبار کی گاڑی لاہور شہر سے نکل کر فراٹے بھرتی لاہور کے نواح میں موجود فارم ہاؤس کی طرف بڑھ رہی تھی جہاں اس کا خفیہ نیٹ ورک موجود تھا۔

گاڑی مین روڈ سے ذیلی سڑک پر ٹرن لے چکی تھی۔ دو تین کلومیٹر کے بعد ڈاکٹر اعتبار کا خفیہ ٹھکانہ تھا۔ یہ ایک کم چوڑی سڑک تھی۔ اس وقت سنسان تھی اور سڑک پر وہی گاڑیاں آتی تھیں جن کا تعلق ریسرچ انسٹیٹیوٹ سے ہوتا تھا۔

اچانک ڈرائیور کو تیز رفتار گاڑی کو بریک لگانے پڑے۔ اسے اُمید نہ تھی کہ اس سڑک پر اس کے سامنے دو ڈرم آ جائیں گے۔ یہ ڈرم سڑک پر اس طرح پڑے تھے کہ گاڑی کا ان کے درمیان سے نکلنا ممکن نہ تھا۔ ایمرجنسی بریک لگانے پر ڈاکٹر اعتبار جو پُرسکون انداز میں بیٹھا تھا، ہل گیا۔

''یہ کیا ہے؟'' ڈاکٹر اعتبار نے ڈرموں کی طرف دیکھتے ہوئے غصے سے کہا۔

''میں دیکھتا ہوں۔'' ڈرائیور یہ کہہ کر اُترنے لگا۔

''تم بیٹھو۔'' ڈاکٹر اعتبار نے اسے روکا۔

اتنے میں پچھلی گاڑی آ گے آئی۔ اس سے کمانڈوز نیچے اترے۔ لیڈی کمانڈوز بھی گاڑی سے نکل چکی تھیں۔ گاڑی میں اس وقت ڈرائیور اور ڈاکٹر اعتبار موجود تھے۔

لیڈی کمانڈوز کے اترتے ہی کالے منہ کی سفید بلی پچھلی سیٹ پر نمودار ہو چکی تھی۔ اس نے اپنے پاؤں پر کھڑے ہو کر اس کی گردن پر پنجہ مارا۔

جیسے ہی ڈاکٹر اعتبار نے مڑ کر دیکھا تو بلی نے بہت پھرتی سے اس کی آنکھوں پر حملہ کیا۔ آناً فاناً اس نے ڈاکٹر اعتبار کی دونوں آنکھیں لہولہان کر دیں اور پورے اطمینان کے ساتھ وہ گاڑی سے معدوم ہو گئی۔

یہ خونی کارروائی ڈرائیور نے اپنی آنکھوں سے دیکھی لیکن اسے زخمی کرنے والا ''شخص'' نظر نہ آیا۔ وہ چیختا ہوا گاڑی سے اُترا۔ کمانڈوز سڑک سے ڈرم ہٹا کر واپس پلٹ رہے تھے کہ اُنہوں نے ڈرائیور کو چیختے ہوئے اپنی طرف آتا دیکھا۔

''کیا ہوا؟'' ایک کمانڈو نے پوچھا۔

ڈرائیور کے حواس گم تھے۔ وہ کچھ نہ بتا سکا۔ بس گاڑی کی طرف اشارہ کر کے رہ گیا۔ لیڈی کمانڈوز ڈرائیور کا اشارہ دیکھتے ہی گاڑی کی طرف لپکیں تو کمانڈوز بھی اس جانب بھاگے۔

گاڑی میں ڈاکٹر اعتبار اپنی دونوں آنکھوں پر ہاتھ رکھے ہوئے بیٹھا تھا۔ اس کی انگلیوں کے درمیان سے خون باہر آ رہا تھا۔ یہ وقت کسی سے سوال جواب کا نہ تھا۔ کیا ہوا؟ کیسے ہوا؟ یہ بعد کی باتیں تھیں۔ فی الحال جو نظر آ رہا تھا اسے سنبھالنا تھا۔ کمانڈوز نے بہت تیز رفتاری سے ڈاکٹر اعتبار کو اسپتال پہنچایا۔

پہلے ریسرچ انسٹیٹیوٹ کے ڈاکٹروں نے سنبھالا۔ پھر لاہور سے آناً فاناً ڈاکٹروں کی ٹیم پہنچ گئی۔ ڈاکٹر اعتبار کی بائیں آنکھ بچالی گئی کہ اس کو زیادہ گزند نہ پہنچا تھا لیکن دائیں آنکھ مکمل طور پر ضائع ہو چکی تھی۔

ڈاکٹر اعتبار نے جو بیان دیا، اس پر کسی ڈاکٹر کو اعتبار نہ آیا۔ بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ کوئی بلی گاڑی میں اچانک نمودار ہو، حملہ کرے اور پھر بغیر کسی کو دکھائی دیئے غائب ہو جائے۔ بلی صرف ڈاکٹر اعتبار کو کیوں دکھائی دی۔ اس ڈرائیور کو کیوں نظر نہ آئی جو اس کی بغل میں موجود تھا۔

پھر سونی افتخار بھی زخمی ہوئی تھی۔ اس کے چہرے اور جسم پر کسی بلی کے پنجوں کے نشانات تھے، لیکن اسے کوئی چیز نظر نہ آئی تھی۔ ڈاکٹر اعتبار نے بلی کو دیکھا تھا جبکہ سونی کو کچھ نہ دکھائی دیا تھا۔ بہرحال زخمی دونوں ہوئے تھے۔

اور اب یہ بات دونوں کے دلوں میں اچھی طرح بیٹھ گئی تھی کہ اس بلی کا تعلق عابر سے ضرور ہے۔ ڈاکٹر اعتبار اور سونی اپنی اپنی جگہ غصے میں تھے۔ سونی اس لیے ناراض تھی کہ عابر نے اس کی بات نہ مان کر اس کی اَنا کو ٹھیس پہنچائی تھی اور ڈاکٹر اعتبار اس لیے جلا بیٹھا تھا کہ اس نے اسے سخت نقصان پہنچایا تھا۔ دونوں کا غصہ اپنی جگہ لیکن دونوں اس سے براہِ راست انتقام لینے کی پوزیشن میں نہ تھے۔

ڈاکٹر اعتبار کے لیے عابر کو قتل کروا کے فارم ہاؤس کے کسی گوشے میں دفن کروا دینا کوئی مشکل کام نہ تھا لیکن اس کی موت کے بعد اگر اس بلی نے انتقامی کارروائی کی تو پھر اس سے کس طرح بچا جا سکے گا۔

ڈاکٹر اعتبار کے پاس اس کا آسان حل یہی تھا کہ وہ اس کو دبئی بھجوا کر ایک پنتھ دو کاج کرے۔ غیر ملکی ایجنسی سے اس کے عوض تیس لاکھ ڈالر وصول کرے اور اپنی جان چھڑا لے۔ دبئی سے اسے امریکا منتقل کیا جانا تھا اور وہاں سے واپسی کسی طور ممکن نہ تھی۔

عابر کو جب یہ خوش خبری سنائی گئی کہ اسے دبئی ایک اچھی ملازمت پر بھیجا جا رہا ہے تو اس کی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی۔ ڈاکٹر اعتبار اور سونی جب سے زخمی ہوئے تھے، اس کے سامنے نہیں آئے تھے اور اسے معلوم نہ تھا کہ کالے منہ کی سفید بلی نے ان دونوں کی کیا گت بنائی ہے۔ وہ اپنی دھن میں مگن دبئی کے خواب دیکھے جاتا تھا۔

PDF BY Manzoor

ایک رات اس نے خواب میں ''بابا دنیا'' کو دیکھا۔ وہ سڑک پر ایسے ہی چلا جاتا تھا کہ عقب سے اچانک آواز آئی۔ ''کہاں جاتا ہے؟''

عابر نے پیچھے پلٹ کر دیکھا تو بابا کو فٹ پاتھ پر بیٹھا پایا۔ وہ بابا کو دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ اس کا جی چاہا کہ وہ بابا کو دبئی جانے کی خبر سنائے۔ اس سے پہلے کہ وہ اپنے لب کھولتا۔ بابا نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''بے وقوف۔ تو دبئی ملازمت پر نہیں، جال میں پھنسنے جا رہا ہے۔''

عابر کو بڑی حیرت ہوئی کہ بابا نے اس کے دل میں چھپی بات کیسے جان لی۔ وہ مؤدبانہ لہجے میں بولا۔ ''بابا۔ آپ کو کیسے معلوم ہوا کہ میں دبئی جا رہا ہوں؟''

''یہ کوئی مشکل بات نہیں۔ تو اللہ کا ہو جا۔ تجھ پر بھی سب آشکار ہو جائے گا۔''

''بابا۔ پھر میں چلا جاؤں؟''

''بے وقوف تو نے سنا نہیں کہ میں نے کیا کہا۔ تو وہاں جال میں پھنسنے جا رہا ہے۔ کھائی میں گرنے جا رہا ہے۔ تجھے مہنگے داموں بیچا جا رہا ہے۔''

''بابا۔ میں پھر کیا کروں؟'' عابر یکدم پریشان ہو گیا۔

''تو کچھ نہ کر۔ بس اللہ پر بھروسا کر۔''

ابھی وہ کوئی اور بات کرنا چاہتا تھا کہ اس کی آنکھ کھل گئی۔ وہ بہت دیر تک اس خواب کے بارے میں غور کرتا رہا مگر اس کے ہاتھ کوئی سرا نہ آیا۔

صبح ہی صبح اسے اٹھا دیا گیا۔ ناشتے کے بعد اس سے ایئرپورٹ چلنے کو کہا گیا۔ ریسٹ ہاؤس کے سامنے گاڑی کھڑی تھی۔ سیکورٹی افسر سمندر خان اسے اپنے ساتھ لے کر پچھلی نشست پر بیٹھ گیا۔ اگلی نشست پر ڈرائیور کے ساتھ ایک سیکورٹی گارڈ موجود تھا۔ گاڑی چل پڑی۔

سمندر خان نے بتایا کہ وہ اس کے ساتھ دبئی جائے گا۔ اس نے مزید تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔ ''دراصل سر چاہتے ہیں کہ آپ کو وہاں کسی قسم کی کوئی پریشانی نہ ہو۔ وہ کہتے ہیں کہ عابر صاحب ہمارے خاص آدمی ہیں۔ میں وہاں آپ کی رہائش وغیرہ دیکھوں گا کہ کیا انتظام کیا ہے ان لوگوں نے۔ پھر جب ہم اچھی طرح مطمئن ہو جائیں گے تو میں وہاں سے واپس آ جاؤں گا۔ ہو سکتا ہے کہ اس دوران سر بھی وہاں کا چکر لگائیں۔''

''ڈاکٹر صاحب سے میری ملاقات نہ ہو سکی، اس کا مجھے افسوس رہے گا۔'' عابر بولا۔

''سر آج مصروف تھے۔ کچھ غیر ملکی مہمان آئے ہوئے ہیں۔ وہ صبح سے ان کے ساتھ مصروف تھے۔'' سمندر خان نے بتایا۔

گاڑی اب ڈیلی سڑک سے نکل کر مین روڈ پر آ چکی تھی اور کالے منہ کی سفید بلی ڈرائیور کے پیروں کے پاس ظاہر ہو چکی تھی۔ اس سے قبل کہ وہ کوئی 'کارروائی' کرتی، سمندر خان کے موبائل فون کی گھنٹی بجی۔

سمندر خان نے موبائل اپنے کان سے لگا کر کہا۔ ''جی میڈم۔''

''میری عابر صاحب سے بات کرائیں۔'' دوسری طرف سوہنی افتخار تھی۔

''جی اچھا۔'' کہہ کر سمندر خان نے موبائل عابر کی طرف بڑھایا۔ ''میڈم سوہنی آپ سے بات کرنا چاہتی ہیں۔''

عابر نے موبائل فون اپنے ہاتھ میں لے کر کان سے لگایا۔ سوہنی کے نام نے اسے چونکایا تھا۔ وہ اپنے لہجے پر کنٹرول کر کے خوشدلی سے بولا۔ ''جی سوہنی صاحبہ۔''

''میں جو بات کرنے والی ہوں، اسے بس خاموشی سے سن لینا۔ سوال جواب مت کرنا۔''

''او کے۔'' عابر نے کسی قدر فکرمند ہو کر کہا۔

''عابر تم جتنے دن بھی یہاں رہے، میری آنکھ کا تارا بن کر رہے۔ میں بہت صاف گو عورت ہوں۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ میں تم پر فریفتہ ہو گئی تھی۔ تم ہو ہی اتنے دلکش۔ خیر اس بات کو چھوڑو۔ اب میری بات غور سے سنو۔ تم دبئی کسی نوکری پر نہیں جا رہے۔ تمہیں تیس لاکھ ڈالر کے عوض بیچ دیا گیا ہے۔ دبئی میں سمندر خان تمہیں ایک غیر ملکی ایجنٹ کے حوالے کر کے واپس آ جائے گا۔ پھر تمہارے ساتھ کیا ہو گا، کوئی نہیں جانتا۔ ابھی وقت ہے۔ فرار ہو سکتے ہو، تو ہو جاؤ۔ دبئی پہنچ گئے تو پھر اس جال سے نکلنا ممکن نہ رہے گا۔ میں نہیں جانتی کہ اچانک کس جذبے کے تحت میں نے یہ راز کھول دیا۔ اب میرے ساتھ جو گزرے سو گزرے۔ تمہیں اللہ محفوظ رکھے۔ بائی۔'' اس کے بعد فون بند ہو گیا۔

عابر نے موبائل فون کان سے ہٹا کر ایک گہرا اور ٹھنڈا سانس لیا اور موبائل سمندر خان کو دے دیا۔

''عابر صاحب۔ خیر ہے۔'' سمندر خان نے رسماً پوچھا۔

''جی سب خیر ہے۔ چلتے وقت میڈم سے ملاقات نہ ہو سکی۔ وہ وش کر رہی تھیں۔'' عابر نے بتایا۔

''اس میڈم کو میں آج تک نہیں سمجھ سکا۔ پتا نہیں کیا چیز ہے یہ۔'' سمندر خان نے ایک طرح سے خود کلامی کی۔ عابر، اس کے اس تبصرے پر مسکرائے بنا نہ رہ سکا۔

سوہنی افتخار کے اس انکشاف پر کہ اسے تیس لاکھ ڈالر میں بیچ دیا گیا اور وہ دبئی کسی ملازمت پر نہیں بلکہ غیر ملکی ایجنسی کے جال میں پھنسنے جا رہا ہے، اسے فوراً ہی ''بابا دنیا'' یاد آئے تھے۔ انہوں نے بھی خواب میں یہی کچھ کہا تھا۔ سوہنی کا یہ انکشاف کسی شک و شبے سے بالاتر تھا۔ لیکن سوال یہ تھا کہ وہ اس جال سے نکلے کیسے؟

ابھی وہ سوچ ہی رہا تھا کہ کالے منہ کی سفید بلی ''ایکشن'' میں آ گئی۔ اس نے ڈرائیور کے بریک والے پیر پر زبردست وزن ڈال دیا۔ تیز رفتار گاڑی کو اچانک بریک لگے تو سب سے پہلے ایک موٹر سائیکل والا گاڑی سے ٹکرایا۔ اس کے بعد پیچھے آنے والی گاڑی اس پر چڑھی۔ اس طرح کئی گاڑیاں آپس میں ٹکرائیں۔

موٹر سائیکل والے کا سر پیچھے سے آنے والی گاڑی کے پہیے کے نیچے آ گیا۔ وہ موقع پر ہی ہلاک ہو گیا۔ چلتی روڈ پر ایک ہنگامہ کھڑا ہو گیا۔

گاڑی کو بریک لگتے ہی سمندر خان اور عابر کا سر اگلی نشست سے ٹکرایا۔ آگے بیٹھے گارڈ کا سر ڈیش بورڈ سے لگا۔ اس کا سر پھٹ گیا۔

''کیا ہوا؟'' سمندر خان سنبھلتے ہوئے چیخا۔

''سر۔ کچھ نہیں معلوم کیا ہوا؟'' ڈرائیور گھبرا کر بولا۔

''بریک میں نے لگایا یا تم نے۔'' سمندر خان نے آنکھیں نکال کر کہا۔

''سر جی۔ مجھے نہیں معلوم بریک کیسے لگا۔'' ڈرائیور حیران پریشان تھا۔

''بکواس کرتے ہو۔'' سمندر خان کا غصہ کسی طور کم نہیں ہو رہا تھا۔

اتنے میں لوگوں نے گاڑی کو گھیر لیا۔ یہ چاروں گاڑی سے اُتر آئے۔ عابر نے عقل مندی کی کہ برابر رکھے سفری بیگ کو کندھے پر ڈال کر باہر نکلا۔ اس بیگ میں سفری دستاویزات کے علاوہ چند کپڑے اور کچھ رقم موجود تھی۔

سمندر خان گاڑی سے اُتر کر جب پیچھے آیا تو اس کے ہوش اُڑ گئے۔ موٹر سائیکل والے نوجوان کا سر پہیے کے نیچے تھا اور وہاں خون ہی خون تھا۔ لوگوں نے ڈرائیور کو پکڑ کر مارنا شروع کر دیا تھا۔ گارڈ کی پیشانی زخمی تھی، اسے اپنا ہوش نہ تھا۔ سب غافل تھے۔

بس یہی موقع تھا کہ عابر یہاں سے باآسانی فرار ہو سکتا تھا۔

وہ بہت تیزی سے بچتا بچاتا باہر آیا۔ اس نے آناً فاناً سڑک کراس کی۔ یہ ایک چوڑی ڈبل روڈ تھی۔ اس نے مخالف سڑک کے کنارے پہنچ کر ایک رکشا روکا۔

ڈرائیور نے پوچھا۔ ''کہاں جانا ہے؟''

عابر کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ ''داتا دربار۔''

''آؤ۔ بیٹھ جاؤ۔'' رکشا ڈرائیور نے خوشدلی سے کہا۔ ''کراچی سے آئے ہو؟''

''ہاں جی۔'' عابر نے رکشا میں بیٹھتے ہوئے کہا۔

''میں نے تین سال کراچی میں رکشا چلایا ہے۔ میں ملیر میں رہتا تھا۔'' رکشا ڈرائیور نے رکشا اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا۔

''بھائی ذرا جلدی چلو۔'' عابر پریشان ہو کر بولا۔

''باؤ شاہو۔ جلدی کا کام شیطان کا ہوتا ہے۔'' رکشا والے نے مسکراتے ہوئے کہا اور ساتھ ہی رکشا کی اسپیڈ بڑھا دی۔ ''چلو خیر ہے۔''

عابر نے شکر ادا کیا۔ وہ چاہتا تھا کہ اس سے پہلے کہ سمندر خان کو اس کے گم ہونے کا احساس ہو، وہ اس کی رینج سے نکل جائے۔

عابر جب اس جگہ سے دو کلومیٹر دور نکل آیا تو اس نے سکون کا سانس لیا۔ رکشا والا باتونی معلوم ہوتا تھا۔ پھر ''کراچی پلٹ'' تھا۔ کراچی والے کو دیکھ کر اس کی زبان کا تالا کھلنا فطری بات تھی۔

رکشا والا راستے بھر اس سے کراچی کے بارے میں اپنے تاثرات بیان کرتا رہا۔ ان بے لاگ تبصروں میں ایک تبصرہ یہ بھی تھا۔ ''باؤ۔ برا نہ ماننا۔ ویسے کراچی والے ہوتے بڑے روکھے ہیں۔''

''کیوں۔ ان میں مرچیں کم ہوتی ہیں؟'' عابر تفریحاً بولا۔

''مرچیں کم نہیں۔ بہت زیادہ ہوتی ہیں۔'' رکشے والے نے ہنستے ہوئے کہا۔

داتا دربار پر اُتر کر جب عابر نے اس سے کرایہ پوچھا تو وہ بڑی محبت سے بولا۔ ''او نئیں باؤ۔ تسی ساڈے مہمان ہو۔ کیسا کرایہ؟''

''ارے نہیں یار۔'' عابر نے بمشکل اسے کرایہ لینے پر مجبور کیا اور پھر وہ بیگ کندھے پر لٹکا کر دربار کی طرف چل دیا۔

اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ اتنی آسانی سے جال میں پھنسنے سے رہ گیا تھا۔ اسے بار بار سوہنی یاد آ رہی تھی۔ یہ اس کا بڑا احسان تھا کہ اس نے 'گمشدہ' ہونے سے بچا دیا تھا۔ وہ جیسی بھی تھی، اس نے اپنے تئیں جو بھی کھیل کھیلنا چاہا، اس کی اس نے سزا پائی۔ غصے کے باوجود سوہنی نے اسے خبردار کر دیا۔ یہ اس کا ایسا احسان تھا جسے عابر زندگی بھر نہیں بھول سکتا تھا۔ عابر نے اس کی غلطی معاف کر دی تھی اور اب اس کا رواں رواں اس کے لیے دعا گو تھا۔ یہ انسان بھی عجیب چیز ہے، اسے بنتے دیر لگتی ہے نہ بگڑتے۔

PDF BY Manzoor

عابر کو پھر ''باباڈنیا'' یاد آئے۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ ان کا اصل نام کیا تھا۔ پوچھنے پر انہوں نے بتایا بھی نہ تھا۔ ''باباڈنیا'' عابر نے اپنی سہولت کے لیے رکھ لیا تھا۔ وہ جب بھی ملتے تھے، عابر کو نوید دیتے تھے۔ ''ڈنیا تجھے ڈھونڈ رہی ہے۔'' اس حوالے سے وہ انہیں باباڈنیا کہنے لگا تھا۔ باباڈنیا کون تھے۔ وہ ان کے بارے میں رتی بھر نہیں جانتا تھا، لیکن ان کی وجہ سے اسے فائدہ پہنچا تھا۔ ملکہ کو جب وہ طلاق دے کر نکلا تھا تو اسے نہیں معلوم تھا کہ وہ کہاں جائے گا۔ تب بابا نے ہی اسے ماں کی شدید بیماری کی اطلاع دے کر اسے گھر جانے کی تلقین کی تھی اور اب بھی یہ بابا ہی تھے جنھوں نے خواب میں آ کر اسے دبئی جانے کی حقیقت آشکار کی تھی اور اللہ پر بھروسا رکھنے کی تلقین کی تھی۔ شاید اللہ پر بھروسا ہی تھا کہ سونی جیسی حسین ''قاتلہ'' نے اسے کھائی میں گرنے سے بچا لیا تھا۔

ابھی وہ ''باباڈنیا'' کے بارے میں سوچتا ہوا مزار کی سیڑھیاں چڑھ رہا تھا کہ پیچھے سے کسی نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔

جب اس نے پلٹ کر دیکھا تو حیران رہ گیا۔

o……o……o

دو متضاد باتیں کر کے رانی پنکھی نے انارہ کو اُلجھا دیا تھا۔ جب بھی اسے کسی بات پر پختہ یقین ہونے لگتا اور وہ بار بار اس کے متعلق سوالات کرنے لگتی تو رانی پنکھی پینترا بدل لیتی۔ کسی اور پٹری پر چل پڑتی۔ اب ساتواں گھر رہ گیا تھا اور رانی پنکھی چاہتی تھی کہ گھر دکھانے کا کام جلد از جلد نمٹ جائے۔ اس کی اس بات سے انارہ کو اُمید بندھی تھی کہ وہ عنقریب منزل پا لے گی۔

ساتواں گھر دیکھنے کے بعد کیا ہوگا، وہ نہیں جانتی تھی۔ لیکن اسے اتنا ضرور یقین تھا کہ اس کی ڈولتی کشتی کو کنارہ مل جائے گا۔

رات گہری ہوئی تو انارہ کمرے سے نکل آئی۔ اس نے رانی پنکھی کو صحن میں ٹہلتے ہوئے پایا۔ وہ دیوار کے سائے میں پڑی چارپائی پر بیٹھ گئی اور اس کی طرف دیکھتی ہوئی بولی۔ ''اماں تو پریشان ہے؟''

''نہیں ری۔ پریشانی کیسی؟'' رانی پنکھی نے ٹہلتے ٹہلتے رک کر کہا اور پھر انارہ کے ساتھ بیٹھ گئی۔ اس نے انارہ کا چہرہ اپنی طرف کیا اور اسے بغور دیکھنے لگی۔

''اماں۔ تو مجھے اس طرح کیوں دیکھ رہی ہے۔ مجھے ڈر لگ رہا ہے۔ کیا کچھ ہونے والا ہے؟'' انارہ پریشان ہو کر بولی۔

''دیکھ میری انجو۔ یہ جو دنیا ہے یہاں ہر وقت کچھ نہ کچھ ہوتا رہتا ہے۔ کوئی چیز اپنی جگہ رکی ہوئی نہیں ہے۔ ہر شے حرکت میں ہے۔ کل میں ایک دن کی تھی، آج میں اسّی سے کچھ ماہ اوپر کی ہو چکی ہوں۔ کچھ ہی وقت رہتا ہے کہ تو سولہ سال کی ہو جائے گی۔ انجو۔ لڑکی پر یہ سولہواں سال بڑی قیامت ڈھاتا ہے۔ اندر ہی اندر ایسے طوفان اُٹھاتا ہے کہ لڑکی لرز کر رہ جاتی ہے۔ وہ خود کو چھپا پاتی ہے، نہ بچا پاتی ہے۔ میں تجھے دیکھتی ہوں تو مجھے اپنا قیامت خیز زمانہ یاد آ جاتا ہے۔

انجو میں اس وقت کولکتہ میں تھی۔ میرا نام کاشی تھا۔ میں نے اپنے باپ کو کبھی نہیں دیکھا۔ میری ماں ارادھنا اس بازار کی ایک قیمتی عورت تھی۔ دور دور سے لوگ میری ماں کا گانا سننے آتے تھے۔ رات کو محفل سجتی۔ ہر طرح کے لوگ اس محفل میں ہوتے، لیکن کیا مجال کہ محفل میں ذرّہ بھر بھی بدمزگی ہوتی۔ گانا سننے والوں کو پہلے ہی بتا دیا جاتا کہ جسے گانا سننے کا واقعی ذوق ہے، وہ یہاں بیٹھے ورنہ شوق پورا کرنے کو اَنّے بتیرے۔

میری ماں ارادھنا کو ناچنا نہیں آتا تھا لیکن اس کے ایک اشارے پر اچھے سے اچھا مرد ناچنے لگتا تھا۔ میری ماں رہتی تو بالا خانے پر تھی لیکن اس کا دماغ آسمان پر ہوتا۔ وہ ''بالا خانہ'' کی لگتی ہی نہ تھی۔

تب اس کی زندگی میں ایک مجسمہ ساز آیا۔ اس سنگتراش کا نام تھا امرت رائے۔ وہ بذاتِ خود کسی مجسمے سے کم نہ تھا۔ میری ماں اس پر مرمٹی۔ اس کے پریم میں ایسی دیوانی ہوئی کہ اپنی سدھ بدھ بھولی، لے، سُر، تال۔ اسے کچھ یاد نہ رہا۔ یاد رہ گیا تو امرت رائے۔ وہ سنگتراش ایک آرٹ اسکول میں ٹیچر تھا۔ اس کی میری ماں کے جسم پر نظریں تھیں۔ اس کی نظروں میں میری ماں شاہکار جسم کی مالک تھی۔ وہ اس کا مجسمہ بنانا چاہتا تھا جبکہ میری ماں کی نظریں اس کی روح پر تھیں۔ وہ اس کا دل جیتنا چاہتی تھی۔

امرت رائے نے میری ماں کو اپنا مجسمہ بنوانے کے لیے راضی کر لیا۔ اس بازار کی عورت بالا خانے سے اُتر کر اس کے آرٹ اسکول میں آ گئی۔ اس دن اسٹوڈیو میں ان دونوں کے سوا کوئی اور نہ تھا بلکہ اس وقت پورے اسکول میں کوئی موجود نہ تھا۔

امرت رائے نے کام کی ابتدا کی۔ مجسمہ بناتے بناتے صبح ہوگئی۔ میری ماں ایک ہی انداز میں بیٹھے بیٹھے تھک کر چور ہوگئی۔ وہ کمر ٹکانے کی خاطر اسٹوڈیو میں پڑی ایک بڑی سی میز پر لیٹ گئی۔ امرت رائے بھی تھک چکا تھا۔ وہ بھی اس میز پر چڑھ کر بیٹھ گیا۔

میری ماں ارادھنا آنکھوں میں خواب سجائے آنکھیں موندے لیٹی تھی کہ امرت رائے جو میری ماں کو شاہکار مجسمہ کہتا تھا، اُس نے اس مجسمے پر ایسی کالک پوتھ دی کہ میری ماں کا دل کرچی کرچی ہو گیا۔ اس نے امرت رائے سے کچھ نہ کہا۔ بس ٹوٹے دل کے ساتھ اپنے ٹھکانے پر آ گئی۔ وہ اس بازار کی تھی لیکن اس کا دل ''بازاری'' نہ تھا۔ اس نے گانا چھوڑ دیا۔ امرت رائے جب اس سے ملنے آیا تو اس نے ملنے سے انکار کر دیا۔ سب سمجھا سمجھا کر تھک گئے لیکن اس نے کسی کی نہ سنی۔ اگر میں اس کی کوکھ میں نہ ہوتی تو ممکن تھا کہ وہ خودکشی کر لیتی۔ بس وہ اس وقت تک زندہ رہی، جب تک میں نے جنم نہ لے لیا۔ انجو جان لے کہ میں کیسے باپ اور کیسی ماں کی بیٹی ہوں۔'' رانی پنکھی نے گہرا سانس لیا۔

''ہاں اماں۔ جان لیا۔ اب اپنی سنا۔'' انارہ اس کی آپ بیتی میں کھو گئی تھی۔ پھر اسے یاد آیا کہ 'اماں' نے آج کی رات ساتواں گھر دکھانا تھا۔ اس نے فوراً پوچھا۔ ''اماں۔ وہ ساتواں گھر؟''

''بے وقوف ساتواں گھر شروع ہو چکا۔'' رانی پنکھی نے انکشاف کیا۔ ''تو دیکھتی نہیں تھی کہ میں ساتویں گھر میں خود بیٹھتی تھی۔''

''ہاں اماں۔ دیکھتی تھی۔ پھر اماں میرا ساتواں گھر کہاں گیا؟''

''تیرا ساتواں گھر میرے ساتھ ہے۔ جہاں تو بیٹھی ہے، یہ تیرا ساتواں گھر ہے اور میرا بھی۔ تو مجھ سے اکثر سوال کیا کرتی تھی۔ اماں تو کون ہے؟ تو میری انجو اب تُو سنبھل کر بیٹھ جا۔ ویسے ہی جیسے تو اب تک چھ گھروں میں بیٹھی رہی۔ آج یہ چارپائی ہی تیرا ساتواں گھر بنے گی۔ پہلے مجھے جان لے، پھر میں تجھے تیرے آخری گھر کے بارے میں بتاؤں گی۔ کیا تُو تیار ہے؟''

''ہاں۔ اماں، میں تیار ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ چارپائی پر پھسکڑا مار کر بیٹھ گئی اور آنکھیں موند لیں۔

رانی پنکھی بھی اس کے سامنے اسی انداز میں براجمان ہوگئی۔ پھر اس نے اپنے گلے سے چاندی کا بھاری تعویذ اُتارا اور مٹھی میں لے کر زیرِ لب کچھ پڑھا اور انارہ پر پھونک ماری اور گویا ہوئی۔ ''ہاں۔ انجو اب تو سنتی جا اور جو دکھائی دیتا ہے، وہ دیکھتی جا۔ ہاں تو میں تجھے بتا رہی تھی کہ میں نے کس ماحول میں اور کس جگہ جنم لیا۔

میری ماں کی وہاں ایک منہ بولی بہن تھی۔ اس کا اصل نام تو پتا نہیں۔ سب اسے بندو کہتے تھے۔ وہ میری ماں کی رازدار اور مزاج شناس تھی۔ میری پرورش اسی نے کی۔ میں ایک انتہائی ضدی لڑکی تھی۔ جو بات کرنے کی ٹھان لیتی، وہ کر کے چھوڑتی تھی۔ چاہے مجھے کوئی کاٹ کر ہی کیوں نہ پھینک دے۔ موسی بندو جسے میں ''ماں جی'' کہتی تھی۔ میرا ہر طرح خیال رکھتی تھی۔

مجھے وہاں کے ماحول سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ مجھے پڑھنے کا شوق تھا۔ میری ہٹ پر ماں جی نے مجھے اسکول میں داخل کرا دیا۔ میں نے میٹرک بہت اچھے نمبروں سے پاس کیا۔ میں کالج میں داخلہ لینا چاہتی تھی، تب ماں جی نے میرے آگے ہاتھ جوڑ لیے۔ دراصل میٹرک کرنے کی اجازت ماں جی نے اس گھر کی نائیکا سرلا دیوی سے ٹکر لے کر لی تھی۔ سرلا نے کہہ دیا تھا کہ اگر آگے پڑھنے کی بات کی تو دونوں کو زہر دے کر مار دوں گی۔ اسی خوف کے پیشِ نظر ماں جی میرے سامنے ہاتھ جوڑ کر بولی۔ ''بھگوان کے لیے کاشی، اب تو پڑھائی کو بھول جا۔ میں نے سرلا دیوی سے ضد کر کے تجھے میٹرک کرنے کی اجازت دلوا دی۔ اب تو گھر میں بیٹھ۔ اس گھر کے ریت رواج سیکھ۔ اپنی ماں کی طرح گا نہیں سکتی تو رقص سیکھ لے۔''

''ماں جی۔ وہ ہم دونوں کو زہر دینے کی بات کرتی ہے۔ وہ ہمیں کیا زہر دے گی، اس سے پہلے ہی میں اسے مار دوں گی۔'' میں نے پُریقین لہجے میں کہا۔

میری یہ بات سن کر ماں جی دَہل گئی۔ وہ میری ہٹیلی طبیعت سے اچھی طرح واقف تھی، جو سوچ لیتی تھی، وہ کر کے چھوڑتی تھی۔

''تجھے اپنی مری ماں کی قسم، ایسا تو کچھ نہیں کرے گی۔'' ماں جی نے گلے لگاتے ہوئے کہا۔ وہ مجھے گلے لگا کر بہت دیر تک روتی رہی۔

''اچھا ماں جی۔ تم پریشان مت ہو۔ میں سوچتی ہوں۔ ابھی کالج میں داخلے میں دو مہینے باقی ہیں۔'' میں نے ماں جی کو تسلی دی۔

لیکن پھر میری کالج میں داخلے کی نوبت نہ آئی۔ میری زندگی کا رُخ ہی بدل گیا۔ نائیکا سرلا دیوی نے میرا بالا ہی بالا سودا کر لیا۔ اس نے ماں جی کو بھی کچھ نہ بتایا۔ وہ جانتی تھی کہ میں ضد کی پکی ہوں۔ کسی صورت یہاں کے ریت و رواج نہ اپناؤں گی، اس لیے اس نے اندر اندر ہی شہر کے ایک رئیس سے میرا معاملہ طے کر لیا۔ میں اس وقت سولہ سال کی تھی۔ میرے حسن کے چرچے پورے علاقے میں تھے۔ کئی عیش پرست میری بولیاں لگا رہے تھے۔ بس میری طرف سے سگنل کی دیر تھی، لیکن میں نے ماں جی سے کہہ دیا تھا کہ اگر ایسا ہوا تو میں جان دے دوں گی۔ لیکن اس چنڈال عورت نے کسی بات کی پروا نہ کی اور مجھے سیج پر بٹھا دیا۔ دروازے کے باہر مسلح پہرہ تھا۔ میں کمرے سے کسی صورت باہر نہیں نکل سکتی تھی اور یہ سب اچانک ہوا تھا۔

میں مسہری پر بیٹھی رو رہی تھی۔ مجھے شدت سے اپنی اصل ماں یاد آ رہی تھی جسے میں نے دیکھا نہ تھا لیکن ماں جی نے میری ماں ارادھنا کے بارے میں اتنی تفصیل سے بتایا تھا کہ وہ میرے سامنے مجسم ہو گئی تھیں۔ آج وہ زندہ ہوتیں تو مجھے یوں اکیلے رونا نہ پڑتا۔

تب ہی کسی نے میرے سر پر ہاتھ رکھا اور ایک باریک سی آواز آئی۔ ''روتی کیوں ہے؟''

میں نے سر اٹھا کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ دروازے کی طرف دیکھا۔ مگر کوئی نظر نہ آیا۔ اس آواز کو میں نے اپنا وہم سمجھا اور پھر ماں کی یاد میں کھو گئی۔

تب پھر آواز آئی۔ ''تیرے تکیے کے نیچے چاقو رکھ دیا ہے۔ موٹے سیٹھ کو اس کی چمک دکھا دینا۔ باقی میں دیکھ لوں گا۔''

''تم کون ہو اور کہاں ہو؟''

''میں بگّا ہوں اور تمہارے دل میں ہوں۔''

میری سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ یہ کون ہے اور کیا کہہ رہا ہے، لیکن جب میں نے تکیے کے نیچے ہاتھ ڈالا تو میرے ہاتھ میں ایک بڑا چاقو آ گیا۔ یہ ایک کھٹکے دار چاقو تھا۔ کھٹکا دباتے ہی چھ انچ کا چمکدار پھل باہر آ گیا۔ چاقو کو دیکھ کر میرے اندر یکایک جان پڑ گئی۔

اسی وقت بند دروازے پر آہٹ ہوئی۔ یوں لگا جیسے بند تالا کھولا جا رہا ہے۔ چند لمحوں بعد ایک سیاہ رو، موٹی توند والا سیٹھ اندر داخل ہوا۔

اتنی دیر میں، میں ہاتھ میں کھلا چاقو لیے اس کے استقبال کے لیے تیار ہو چکی تھی۔

PDF BY Manzoor

وہ موٹی توندوالا سیٹھ اپنی آنکھوں میں جانے کتنے خواب سجائے اندر آیا تھا۔ جب اس نے اپنے نشہ آور خوابوں کی تعبیر خنجر بدست دوشیزہ کی شکل میں دیکھی تو یکدم اس کی آنکھوں میں اندھیرا بھر گیا۔

''نا بابا نا۔ مجھ پر حملہ مت کرنا۔ میں واپس چلا جاتا ہوں۔'' اس نے لرزتی آواز میں کہا اور فوراً ہی واپس مڑ گیا۔

میں اس کی بزدلی پر مسکرائے بنا نہ رہ سکی۔ اس نے دروازہ کھولنے کی کوشش کی لیکن دروازہ نہ کھلا۔ وہ باہر سے مقفل ہو چکا تھا۔ اس کی پیٹھ دیکھ کر میرے اندر جنون سا اٹھا۔ میرا جی چاہا کہ اس ہوس پرست کی پسلیوں میں چاقو بھونک دوں اور اس وقت تک چاقو کے وار کرتی رہوں جب تک یہ مر نہ جائے۔ میں اس ارادے سے آگے بڑھی۔

''سرلا بائی دروازہ کھولو۔ سربالا بائی دروازہ کھولو۔'' وہ مسلسل دروازہ پیٹ رہا تھا۔

چند لمحوں بعد دروازہ کھلا اور نائیکہ سرلا دیوی بوکھلائی ہوئی اندر داخل ہوئی اور بولی۔ ''سیٹھ را جندر کیا ہوا؟''

سیٹھ نے کوئی جواب دینے کے بجائے میری طرف اشارہ کیا اور بغیر کچھ بولے، حیران پریشان کمرے سے نکل گیا۔ میں جو اس پر وار کرنے لیے آگے بڑھ رہی تھی، رک گئی۔ اب میری نظریں اس لومڑی پر تھیں، جو اس فساد کی جڑ تھی، جس نے میرا سودا کیا تھا۔

میرے ہاتھ میں چمکتا چاقو دیکھ کر ایک لمحے کو وہ ٹھٹھکی۔ اس نے یہ اندازہ لگانے کی کوشش کی کہ میرے ہاتھ میں چاقو کہاں سے آیا۔ پھر اسے اپنی اہانت کا احساس ہوا۔ اس دو دن کی چھوکری نے اسے سیٹھ کے سامنے بے عزت کر دیا تھا۔ وہ کسی بھوکی شیرنی کی طرح مجھے کھانے دوڑی۔ میں پہلے سے ہی جنونی ہو رہی تھی، جب اس کے منہ سے طیش میں نکلا۔

''کنجری تیری یہ مجال۔'' تو میں اپنے حواسوں میں نہ رہی۔ اس وقت جانے میرے اندر کہاں سے اتنی طاقت آ گئی کہ میں نے اس پر چاقو کے وار کر کے لمحوں میں اس موٹی تازی عورت کو لہولہان کر کے رکھ دیا۔

وہ اسپتال پہنچتے پہنچتے چل بسی۔ میں گرفتار ہوئی۔ مقدمہ چلا۔ مجھے عمر قید ہو گئی۔ میری زندگی کا دھارا بدل گیا۔ میں انسان سے شیطان ہو گئی۔ بگا جو میری نوعمری سے میرے اندر چھپا بیٹھا تھا، باہر آ گیا۔ اس نے مجھے آگ بھرے راستوں پر ڈال دیا۔ پھر یہی آگ میرے لیے 'پھول' ہو گئی۔

کالا جادو، جنتر منتر، سفلی عمل، شمشان گھاٹ، کھوپڑیاں، قبرستان، جنگل ویرانے۔ میری زندگی بن گئے۔ جیل میں ایک قیدی عورت تھی شوبھنا، وہ اپنی سوکن کو مار کر جیل آئی تھی۔ وہ کئی عملیات کی ماہر تھی۔ وہ مجھ پر فریفتہ ہو گئی تھی۔ اس سے میں نے کئی عمل سیکھے۔ ''کاشی میں تمہیں بتاؤں جب کوئی عورت عامل کے پاس جاتی ہے تو وہ اس سے کہتا ہے کہ تم پر زبردست جادو کرایا جا چکا ہے اور ثبوت کے طور پر وہ اس کے تکیے سے تعویذ گنڈے یا الماری سے سوئیوں لگا پتلا نکال دیتا ہے تو ایسا کسی جادو کے زیر اثر نہیں ہوتا بلکہ وہ عامل اپنے عمل کے ذریعے اس طرح کی چیزوں کو اس کے گھر کی خفیہ جگہوں سے نکال کر اسے اپنا بے دام غلام بنا لیتا ہے۔ اسی طرح عورتیں اپنا گھر اور مرد اپنا سرمایہ گنوا بیٹھتے ہیں۔''

خیر جب میں جیل سے رہا ہوئی تو میں بتیس سال کی تھی۔ اسسٹنٹ جیلر نے جب مجھے آزادی کی خبر سنائی تو میں سوچ میں پڑ گئی کہ کہاں جاؤں۔ واپس میں 'منڈی' جانا نہیں چاہتی تھی۔ میرا دل وہاں سے سدا سے بیزار تھا کہ ماں جی وہاں ضرور تھیں جن سے مجھے شدید لگاؤ تھا، لیکن نہیں پتا تھا کہ وہ زندہ بھی ہیں یا شمشان گھاٹ پہنچ چکیں۔

اسی اُدھیڑ بُن میں تھی کہ اسسٹنٹ جیلر رام پال نے عجیب بات کی۔ وہ مسکراتا ہوا بولا۔ ''تیرا کوئی ٹھکانہ نہیں ہے تو میرے گھر چل۔''

''کتنے دن کے لیے؟'' میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بے باکی سے پوچھا۔

''جب تک تو رہنا چاہے۔'' وہ بولا۔

''مجھ سے شادی کرو گے؟'' میں نے اسے حیرت میں ڈالنے والا سوال کیا۔

''نہیں بھول کر بھی نہیں۔ میری بیوی روٹھ کر میکے بیٹھی ہے۔ مجھے کھانے پینے کی تنگی ہے۔ تو گھر سنبھال لے۔'' رام پال نے صاف گوئی سے اپنے دل کی بات کی۔

''دیکھو۔ جیلر صاحب۔ مجھے تمہارے گھر رہنا منظور ہے لیکن یہ بات یاد رکھنا کہ تم نے صرف گھر سنبھالنے کی بات کی ہے۔ آگے پیچھے کچھ نہیں۔'' میں نے اسے تنبیہہ کی۔

''ٹھیک ہے۔'' رام پال خوش ہو کر بولا۔ مجھے نہیں معلوم کہ اس نے میری بات سمجھی یا نہیں اور اگر سمجھی تو مجھے صرف قیدی عورت سمجھا اور خود کو جیلر جانا۔

خیر میں نے اس کا گھر سنبھال لیا۔ اس کا پورا خیال رکھا۔ کپڑوں کی استری سے بھوجن پروسنے تک۔ کچھ دن وہ میرے ساتھ بالکل ٹھیک رہا۔ انسان کا بندہ بنا رہا۔ ایک دن صبح جب وہ ڈیوٹی پر جانے کی تیاری کر رہا تھا اور میں اس کے کپڑے استری کر رہی تھی تو اس نے مجھے اپنی 'استری' سمجھ کر میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ وہ ایک مضبوط جسم کا قدر آور شخص تھا۔ وہ اپنی مرضی کر سکتا تھا۔ لیکن میں سدا کی ضدی اور ہٹیلی ہوں، اپنی مرضی کی مالک۔ میں نے کبھی کسی ناپسندیدہ مرد کو اپنا ہاتھ پکڑنے کی اجازت نہیں دی۔ اسی لیے میں، اس کے گھر میں معاہدہ کر کے آئی تھی۔ آج وہ گھر کو سنبھالنے کے بجائے خود کو سنبھالنے کا آرزومند تھا۔ میں نے اسے اپنا عہد یاد دلایا۔ اس نے میری بات سنی اَن سنی کر دی اور من مانی پر اُتر آیا۔ مجھ پر جنون سوار ہو گیا۔ میں نے اس کے ہاتھ پر جلتی استری رکھ دی۔ اسے شاید مجھ سے اس طرح کے عمل کی توقع نہ تھی۔ وہ غصے سے پیچھے ہٹا اور الماری سے ریوالور نکال کر مجھ پر تان لیا اور شدید غصے میں بولا۔ ''دو ٹکے کی عورت، تو نے خود کو سمجھا کیا ہے۔ میں تجھے قتل کر کے نالے میں پھنکوا دوں گا۔''

مجھے یقین تھا کہ وہ جو کہہ رہا ہے، صحیح کہہ رہا ہے۔ مجھے مار کر نالے میں پھنکوانا اس کے لیے قطعاً مشکل کام نہ تھا۔ میں مشکل میں تھی۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں؟

میں بگا کا یہ احسان زندگی بھر نہیں بھول سکتی کہ وہ اچانک ایک لحیم شحیم کالے کتے کے روپ میں نمودار ہوا۔ اس نے اس پر اس طرح چھلانگ لگائی کہ ریوالور اس کے ہاتھ سے نکل کر دور جا پڑا۔ وہ اس اچانک افتاد کے لیے تیار نہ تھا۔ لڑکھڑا کر پیچھے گرا۔

بس اتنا موقع میرے لیے کافی تھا۔ میں نے ریوالور اٹھا کر اس پر کئی گولیاں چلائیں اور دروازہ کھول کر اس کے گھر سے بھاگ نکلی۔ بس پھر جانے میں کب تک بھاگتی رہی۔ دربدری میرا مقدر ہوئی۔ اسسٹنٹ جیلر رام پال کے شہر میں رہنا اب ناممکن تھا۔ بگا نے میری مدد کے لیے برجو کو بھیج دیا۔ وہ کولکتہ کالی دیوی کو 'بھینٹ' چڑھانے آیا تھا۔ میں چند دن اس کے ساتھ کالی دیوی کے مندر میں رہی۔ وہاں کے کئی پجاری مجھ جیسی سرکش جوانی کو دیکھ کر اپنی پوجا پاٹ بھول گئے۔ برجو نے مجھے سمجھایا۔ کچھ حاصل کرنے کے لیے مندر کی 'داسی' بننا ضروری تھا۔ پہلے برجو نے مجھے اپنی 'داسی' بنایا۔ اس کے بعد مندر کے کئی بڑے پجاریوں نے میرے جسم کی بھینٹ مانگی۔ ادھر بگا کا اصرار کہ جو کہتے ہیں کرتی جاؤ۔ برجو نے یہاں تیرہ دن رہ کر بنارس چلے جانا تھا۔ میں واپس اب جیل جانا نہ چاہتی تھی۔ میں پولیس کے ہتھے چڑھ جاتی تو وہ جانے میرا کیا حشر کر دیتی۔ میں نے یہی غنیمت جانا کہ برجو کے ساتھ بنارس نکل جاؤں۔ برجو بڑا گیانی جوگی تھا۔ شیطان کا چیلا۔ بگا کی اس پر خاص نظر تھی۔ اس سے میں نے بہت کچھ سیکھا۔ اس نے بھی مجھے کالا علم سکھانے میں کسی بخل سے کام نہ لیا۔ میں برجو کے ساتھ کئی سال بنارس رہی۔ پھر وہ مجھے الٰہ آباد میں ایک جینی سادھو کے حوالے کر گیا۔

اس سادھو کا نام تو دھرم داس تھا لیکن اس کا دھرم سے کوئی واسطہ نہ تھا۔ شیطان کا خاص چیلا تھا۔ اس کے جسم پر کپڑے کے نام پر ایک لنگوٹ ہوتا۔ جب وہ بھبھوت مل لیتا تو لنگوٹ سے بھی بے نیاز ہو جاتا۔ اس کے ساتھ رہنا بڑا کٹھن تھا۔ لیکن میں رہی اور سچی بات یہ ہے کہ اس نے مجھے جو عمل سکھایا، وہ نایاب تھا۔ میری ''خدمت'' کے بدلے اس نے وہ سب کچھ سکھا دیا جو وہ جانتا تھا۔

دھرم داس ایک دن بڑی موج میں تھا۔ میں اس کے پیر دبا رہی تھی کہ وہ اچانک آنکھیں کھول کر بولا۔ ''کاشی کیا تو چاہتی ہے کہ تو اُڑی اُڑی پھرے۔ تجھے پنکھ لگ جائیں۔''

''ہاں کیوں نہیں۔ اس سے اچھی بات بھلا میرے لئے اور کیا ہو سکتی ہے۔'' میں فوراً بولی۔

PDF BY Manzoor

''اس شکتی کو حاصل کرنے کے لیے تجھے تین دن زمین میں دفن ہونا پڑے گا۔''

''گرو، کیا مجھے اندر دفن کر کے مارنا چاہتے ہو؟'' میں نے اپنا شبہ ظاہر کیا۔

''نہیں۔ تو مرے گی نہیں۔ اگر تو نے میرے کہنے پر عمل کر لیا تو ایسی شکتی مل جائے گی کہ اپنے گرو دھرم داس کو سدا یاد کرے گی۔''

پھر جب دھرم داس نے مجھے اس عمل کی تفصیل بتائی تو مجھے اندازہ ہوا کہ یہ کوئی آسان عمل نہیں لیکن مسئلہ یہ تھا کہ کوئی شکتی حاصل کرنے کے لیے مشکلات کا سامنا کرنا ہی پڑتا ہے۔ اس کے یقین دلانے پر میں نے یہ جان لیوا عمل کرنے کی ٹھان لی۔

جب تین دن کے بعد میں بند قبر سے جیتی جاگتی برآمد ہوگئی تو مجھ سے زیادہ دھرم داس خوش تھا۔ خوشی اسے یہ تھی کہ کسی عورت نے اپنی جان پر کھیل کر یہ شکتی حاصل کی تھی۔ اسی دن اس نے میرا نام بدل دیا۔ ''آج سے تو کاشی نہیں، پنکھی کہلائے گی۔ اب تجھے پنکھ لگ گئے ہیں، جہاں چاہے اُڑتی پھر۔'' بس اس دن سے میں 'پنکھی' ہوگئی۔ عمر بڑھنے کے ساتھ لوگ مجھے 'مائی پنکھی' کہنے لگے اور آج میں رانی پنکھی کہلاتی ہوں۔ لیکن سچ یہی ہے کہ مجھے پنکھ دینے والا دھرم داس ہی تھا۔

میں نے سات سال اس کے ساتھ گزارے۔ پھر ایک دن عجیب واقعہ ہوا۔ دھرم داس نے مجھے سورج نکلنے سے پہلے اُٹھایا جبکہ اس کا معمول تھا کہ وہ بارہ بجے سے پہلے کبھی نہ اُٹھتا تھا۔ مجھے اُٹھا کر بولا۔ ''چل پنکھی تیار ہو جا۔ ترویٰ چلتے ہیں۔''

''ترویٰ۔ گرو تمہارا وہاں کیا کام؟'' میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

''پنکھی ہنس مت۔ تو جانتی ہے نا کہ میرا نام دھرم داس ہے۔ میں اپنے وقت کے بڑے پنڈت شرما داس کا بیٹا ہوں۔ میں نے دھرم چھوڑ دیا۔ میں ناستک ہوگیا۔ پھر میں ایک ایسے راستے پر چل پڑا، جس کا دھرم سے کوئی تعلق نہ تھا۔ مجھے کالا جادو سیکھنے کا شوق تھا۔ بس ایک بار پٹڑی سے اُترا تو پھر سیدھے راستے پر چل نہ سکا۔ باپ نے میری 'سرگرمیاں' دیکھ کر مجھے گھر سے نکال دیا۔ بس پھر بھٹکتا پھرا۔ کہاں کہاں کی خاک میں نے نہیں چھانی۔ تجھے میں نے اپنا سارا علم دے دیا ہے۔ میں نے تجھ جیسی عورت نہیں دیکھی۔ چل آج میں تجھے ترویٰ کی سیر کراتا ہوں۔''

دھرم داس جانے کیا کیا بولتا رہا۔ اسے اس طرح بولتے ہوئے میں نے کبھی نہیں سنا تھا۔ گنگا گھاٹ سے ہم ایک کشتی میں بیٹھ کر 'ترویٰ' پہنچے۔ ترویٰ اس جگہ کو کہتے ہیں جہاں تین دریا گنگا، جمنا اور سرسوتی ایک ہوتے ہیں۔ اس مقام پر عجیب نظارہ ہوتا ہے۔ جہاں گنگا، جمنا، سرسوتی ملتے ہیں، وہاں گنگا جمنا کو الگ الگ بہتے دیکھا جا سکتا ہے۔ ان دونوں دریاؤں کا رنگ الگ ہے اور یہ دونوں اس طرح ساتھ ساتھ بہتے ہیں، جیسے ان کے درمیان کوئی شیشے کی دیوار ہو۔

سورج نکلنے والا تھا۔ دھرم داس سر جھکائے کچھ پڑھنے میں مصروف تھا۔ سورج کی پہلی کرن کے ساتھ وہ کشتی میں کھڑا ہوا۔ اس نے سورج کی طرف ہاتھ باندھ کر کچھ کہا جو میں نہ سمجھ سکی۔ اس کے بعد اس نے ایک ایسا عمل کیا جس کی مجھے ہرگز اُمید نہ تھی۔ اس نے گنگا جمنا کے سنگم پر پانی میں چھلانگ لگا دی۔ میں چیختی رہ گئی لیکن کوئی اسے نہ بچا سکا۔ تب میں نے الٰہ آباد چھوڑ دیا۔

الٰہ آباد سے گھومتی گھامتی میں آگرہ پہنچی۔ تاج محل کے نزدیک ایک غریب بستی میں، میں نے اپنا مسکن بنایا۔ میرے پاس بہت کچھ تھا۔ میں نے آس پاس کے علاقے میں بہت جلد شہرت پالی۔ میں اب چالیس برس کی ہو چکی تھی لیکن میرے حسن کی جولانی میں کوئی کمی نہ آئی تھی۔ میں اب کسی موجیں مارتی ندی کی طرح تھی۔ اس دن ہلکی بارش ہو رہی تھی کہ دروازے کی کسی نے کنڈی بجائی۔ میں ساڑھی سنبھالتی ہوئی دروازے پر آئی۔

اور جب میں نے دروازہ کھولا تو مجھے اُمید نہ تھی کہ میرے گھر کے دروازے پر کوئی ایسا شخص آ جائے گا جسے میں دیکھتے ہی مر مٹوں گی۔ دوسری طرف اسے بھی اندازہ نہ تھا کہ جب دروازہ کھلے گا تو کوئی ایسی پُرکشش عورت اس کے سامنے آ جائے گی جسے وہ دیکھتا رہ جائے گا۔ وہ شاید میرے پاس یہ سوچ کر آیا تھا کہ کوئی عمر رسیدہ، خبیث صورت عورت اس کے سامنے آئے گی۔

میں فوراً دروازہ کھول کر ایک طرف ہوگئی اور بولی۔ ''اندر آ جائیں۔''

میرا لب و لہجہ، میری آواز سن کر وہ مزید پریشان ہوا۔ اسے خیال ہوا کہ کہیں وہ غلط دروازے پر تو نہیں آ گیا ہے۔ اس نے کسی قدر جھجکتے ہوئے پوچھا۔ ''کیا آپ پنکھی جی ہیں؟''

''میں پنکھی ہوں۔ پنکھی جی نہیں۔'' میں نے مسکرا کر اپنی جان لیوا آنکھوں سے ایک خاص ادا سے دیکھا تو وہ متاثر ہوئے بنا نہ رہ سکا۔

وہ میرا ہم عمر ہی تھا۔ نام اس کا شاہ زیب تھا۔ میں نے زندگی میں بڑے مرد دیکھے تھے لیکن اس کی بات ہی اور تھی۔ کوئی ایسی بات، کوئی ایسی کشش کہ اس نے میری روح تک کو اسیر کر لیا۔ پنکھی اُڑنا بھول گئی تھی۔

میں نے شاہ زیب کو اپنے گھر کی سب سے اچھی جگہ پر بٹھایا۔ میرے بس میں ہوتا تو اپنے دل کے سنگھاسن پر اسے بٹھا لیتی۔ وہ ایک پڑھا لکھا، سُلجھا ہوا، کاروباری شخص تھا۔ فوٹوگرافی اس کا شوق تھا۔ ایک دن وہ تاج محل میں بیٹھا تصویر کھینچ رہا تھا کہ اچانک کیمرے کے فریم میں ایک حسینہ آ گئی۔ کیمرا ''کلک'' ہو چکا تھا۔ حسینہ کیمرے میں قید ہو چکی تھی۔ وہ برقع میں تھی۔ صرف اس کی آنکھیں کھلی تھیں۔ شاہ زیب اس کی آنکھوں پر مرمٹا اور اس قدر بے چین ہوا کہ وہ اس لڑکی کے پیچھے گھر تک جا پہنچا۔

وہ کالج کی طالبہ تھی اور سائیکل رکشا پر کالج جایا کرتی تھی۔ شاہ زیب کی والہانہ محبت نے اسے اپنا اسیر کر لیا۔ وہ اس سے شادی کرنے کا خواہشمند تھا۔ لڑکی بھی راضی تھی لیکن گھر والے راضی نہ تھے۔ ان کے ہاں خاندان سے باہر شادی کرنے کا رواج نہ تھا۔ دوسرے شاہ زیب اور قمر پروین کے درمیان عمروں کا فرق تھا۔ وہ میرے پاس اس مسئلے کے حل کے لیے آیا تھا۔ اس نے ساری تفصیل بتا کر بڑی بے تابی سے کہا تھا۔ ''پنکھی جی، آپ قمر پروین کی مجھ سے شادی کروا دیں۔ میں آپ کا منہ موتیوں سے بھر دوں گا۔''

''شاہ جی۔ میں ہر ممکن کوشش کروں گی۔'' میں نے اسے جواب دیا اور واقعی میں نے کوشش بھی کی کہ اس کے گھر والے راضی ہو جائیں لیکن ایسا نہ ہو سکا۔ پروین اس کی قسمت میں نہ تھی۔ اس کی خاندان میں شادی طے کر دی گئی۔ لڑکا لاہور میں تھا۔ شادی کے تین ماہ بعد قمر پروین لاہور چلی گئی۔

قمر پروین نے آگرہ چھوڑتے ہوئے شاہ زیب کو پیغام بھجوایا کہ وہ ہمیشہ کے لیے لاہور جا رہی ہے۔ چاہتی ہے کہ آخری بار اس کی جھلک دیکھ لے۔ اس نے مجھے قمر کے پیغام کے بارے میں آ کر بتایا۔ وہ اسٹیشن جانے کے لیے تیار نہ تھا، کہتا تھا کہ میں اسے رخصت ہوتے دیکھ نہ سکوں گا۔ خدا جانے کیا کر بیٹھوں۔ میں نے اس کی ہمت بندھائی۔ اس آخری ملاقات کے لیے اسے راضی کیا۔

میں خود اس کے ساتھ اسٹیشن گئی۔ قمر پروین لیڈیز کمپارٹمنٹ میں تھی۔ وہ برقع میں تھی۔ چہرے پر نقاب تھا لیکن آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔ اس کی آنکھیں واقعی حسین تھیں۔ پلیٹ فارم پر رش تھا۔ شاہ زیب اس کی کھڑکی کے نزدیک کسی مسافر کی طرح کھڑا تھا۔ میں بھی وہیں تھی لیکن شاہ زیب سے منہ پھیرے کھڑی تھی۔

میں رخصتی کا وہ منظر کبھی نہیں بھلا پائی۔ ٹرین نے رینگنا شروع کیا تو قمر نے اپنا نقاب اُتار دیا۔ تب میں نے دیکھا کہ اس کی آنکھیں ہی نہیں، وہ خود بھی آنکھوں کی طرح حسین تھی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے اور وہ کھڑکی کی سلاخوں سے اپنا سر ٹکرا رہی تھی۔ گاڑی آہستہ آہستہ پلیٹ فارم چھوڑ رہی تھی۔ سلاخوں سے سر ٹکراتے دیکھ کر شاہ زیب کی حالت خراب ہوگئی۔

جاتے ہوئے اس نے آخری بار شاہ زیب کی طرف پلٹ کر دیکھا۔ اپنا نازک ہاتھ باہر نکال کر ہلایا اور آنکھوں سے اوجھل ہوگئی۔ شاہ زیب نے آگے بڑھ کر ریل گاڑی میں چڑھنا چاہا، لیکن میں نے اس کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لیا۔ ''نہیں، شاہ زیب۔''

پتا نہیں، میرے لہجے میں کیا تھا کہ وہ ٹھہر گیا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو بھرے تھے۔ میں نے اپنی ساڑھی کے پلّو سے اس کی آنسو بھری آنکھیں صاف کیں اور اسے اپنے گھر لے آئی۔ اسے کسی طور قرار نہ تھا۔ میرا خیال تھا کہ وقت گزرنے کے ساتھ اسے قرار آ جائے گا، وہ قمر پروین کو بھول جائے گا۔ لیکن ایسا نہ ہو سکا۔ وقت گزرنے کے ساتھ اس کا غم کم ہونے کے بجائے گہرا ہوتا گیا اور پھر ایک دن اس نے عجیب فیصلہ کیا۔ اس نے لاہور جانے کی ٹھان لی۔ میں نے اسے بہت سمجھایا کہ اس کا لاہور جانا ٹھیک نہ ہوگا۔ قمر کی شادی ہو چکی ہے۔ تم اگر وہاں جا کر اس سے ملو گے تو اس کی زندگی تباہ ہو جائے گی۔ اسے بھول جانا ہی بہتر ہے۔ اس نے جواب میں کہا کہ وہ وہاں جا کر کوئی ایسا کام نہ کرے گا کہ جس سے اس کی زندگی برباد ہو۔ بس اسے تسلی رہے گی کہ اس کی محبت اس شہر میں ہے۔ یہ محبت کا عجیب روپ تھا۔ اس نے زندگی بھر شادی نہ کرنے اور اپنی پریمیکا کا نام لے لے کر جیے جانے کا عہد کر لیا تھا۔

میں پہلی نظر میں ہی اس پر مَر مٹی تھی۔ ملاقاتوں کے بعد یہ محبت اور گہری ہوتی گئی۔ میں اس کے لیے بے کل ہوگئی تھی۔ مجھے اس وقت تک قرار نہ آتا جب تک میں اس کی صورت نہ دیکھ لیتی۔ میں نے اپنی محبت اپنے دل میں چھپا کر رکھی ہوئی تھی، اظہار کرتی بھی تو اس کا کیا فائدہ ہوتا۔ وہ کسی اور کے عشق میں سرتاپا ڈوبا ہوا تھا۔ ڈر تھا کہ اظہار کے جواب میں وہ کہیں نفرت نہ کرنے لگے۔ میں کسی صورت اس کی نفرت برداشت نہ کر سکتی تھی۔

جب اس نے اپنی محبوبہ کے شہر لاہور جانے کا حتمی فیصلہ کر لیا تو میں نے ایک دن اس کا ہاتھ تھام کر کہا۔ ''شاہ زیب اکیلے مت جانا۔ میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گی۔''

میری بات سن کر وہ ہکا بکا رہ گیا۔ اسے توقع نہ تھی کہ میں اس کے ساتھ لاہور جانے کی فرمائش کروں گی۔ وہ چند لمحے میری آنکھوں میں دیکھتا رہا۔ پھر فیصلہ کن انداز میں بولا۔ ''ٹھیک

PDF BY Manzoor

ہے چلو۔لیکن ایک بات یادرکھنا۔میں نے زندگی بھراس کی یاد میں جلنے کا فیصلہ کرلیا ہے۔"

"ہاں۔میں جانتی ہوں۔" میں نے نظریں جھکا کر کہا۔"میں کبھی تم سے کوئی ایسی چیز نہ مانگوں گی جوتم مجھے دے نہ سکو۔میں بس تمہارا ساتھ چاہتی ہوں۔تمہاری داسی بن کر رہوں گی۔"

شاہ زیب نے اپنا کاروبار سمیٹا۔سرمایہ لاہور منتقل کیا اور میں اس کے ساتھ لاہور آگئی۔اس نے ماڈل ٹاؤن میں گھر خرید لیا۔ایک سینما تعمیر کرلیا اور آسودگی سے زندگی گزارنے لگا۔اسے معاشی کوئی پریشانی نہیں تھی لیکن دل اس کا ٹھکانے پر نہ تھا۔اسے یہ بات معلوم تھی کہ قمر پروین بیاہ کر ماڈل ٹاؤن میں آئی ہے،لیکن اس نے کبھی اس کی کھوج لگانے کی کوشش نہ کی تھی۔دل میں اس کی شکل دیکھنے کی حسرت تھی اور اسے یقین تھا کہ وہ ایک دن اسے ضرور کہیں نظر آئے گی۔اور پھر ہوا بھی ایسا ہی۔ایک دن وہ انارکلی میں اسے دکھائی دے گئی۔وہ دو تین خواتین کے ساتھ تھی،شاید اس کی نندیں وغیرہ تھیں۔اگرچہ اس کا چہرہ ڈھکا ہوا تھا لیکن آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔وہ ان آنکھوں کو لاکھوں آنکھوں کے درمیان پہچان سکتا تھا۔لیکن آج ان آنکھوں میں پہچان نہ تھی۔قمر پروین نے ایک نظر اسے دیکھا اور بس۔اس نے چہرے پر نقاب ڈالا اور تیزی سے اس کی نظروں سے اوجھل ہوگئی۔

شاہ زیب نے اسے اشارہ کیا،نہ پکارنے کی کوشش کی اور نہ ہی اس کا تعاقب کیا۔وہ جب گھر آیا تو ٹوٹا ہوا تھا۔مجھے یہ اندازہ کرنے میں دیر نہ لگی کہ آج 'دیدار محبوب' ہوا ہے۔ میں نے پوچھا تو اس نے ہر بات سچ بتادی۔وہ بہت اُداس تھا۔وہ مجھے بہت دیر تک خالی نظروں سے دیکھتا رہا۔پھر جانے اسے کیا خیال آیا۔دھیرے سے بولا۔"پنکھی۔کیا وہ مجھے بھول گئی۔"

میں نے بڑے یقین سے کہا۔"نہیں۔شاہ زیب۔وہ تمہیں بھولی نہیں۔وہ تمہیں کبھی نہیں بھول سکتی۔لیکن وہ یہ ضرور چاہتی ہے کہ تم اسے بھول جاؤ۔اپنا گھر بسالو۔"

"میں ایک اُجڑا دیار ہوں۔اُجڑا دیار بھی کبھی بستا ہے۔وہ مجھے بے شک بھول جائے۔میں اسے کبھی نہیں بھولوں گا۔" اس نے فیصلہ کُن انداز میں کہا۔

سچی بات یہ تھی کہ میں چاہتی تھی کہ وہ قمر پروین کو بھول جائے،میرا ہو جائے۔میں اس کے لیے مسلمان ہونے کو تیار تھی۔یہ جادو ٹونا،عملیات سب تیاگ دینا چاہتی تھی۔میں پھول بن کر اس کے قدموں میں نچھاور ہونا چاہتی تھی۔

جب میں اس سے اپنے دل کی بات کہتی تو وہ میری بات سن کر پھیکی سی ہنسی،ہنس دیتا۔اس محبت کے سو روپ ہیں۔ایک وہ محبت تھی جو قمر اور شاہ زیب کے درمیان تھی۔وہ ایک دوسرے کی چاہت میں گم تھے۔یہ اور بات کہ ان کا ملاپ نہ ہوسکا۔اس کے باوجود وہ اسے بھولنے کو تیار نہ تھا۔ایک طرف میری محبت تھی جو سو فی صد یک طرفہ تھی لیکن میں اسے بھولنے پر راضی نہ تھی۔شاہ زیب کو اپنے دل پر اختیار تھا،نہ مجھے اپنے من پر۔

پھر جانے کیا ہوا۔ایسا میرے بڑھتے اصرار پر ہوا یا خود ہی اس کا دل اُچاٹ ہوگیا۔ایک دن اس نے لاہور چھوڑنے کا فیصلہ کرلیا۔وہ چاہتا تھا کہ ماڈل ٹاؤن کا مکان میرے نام کردے لیکن میں نے منع کردیا۔میں چھوٹے علاقے میں رہنا چاہتی تھی۔تب اس نے مجھے گڑھی شاہو میں گھر دلوادیا۔پھر وہ اپنا گھر اور سینما فروخت کر کے لاہور چھوڑ گیا۔رخصت ہوتے وقت میں نے اس سے پوچھا۔"کہاں جاؤ گے۔شاہ زیب؟"

اس نے ٹوٹے ہوئے لہجے میں کہا۔"پتا نہیں۔"

"کیا میں تمہیں یاد رہوں گی؟" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

اس نے جواب دینے کے لیے اپنے ہونٹ وَا کیے،پھر جانے کیا سوچ کر اس نے اپنے لب سی لیے اور وہ بغیر کچھ کہے،رخصت ہوگیا۔میں اسے کبھی نہیں بھول پائی۔

آج بھی وہ میرے دل میں کسی کسک کی طرح موجود ہے۔وہ میری پہلی اور آخری محبت تھا۔میں نے برسوں اس کی راہ دیکھی۔میرا خیال تھا کہ وہ کبھی پلٹ کر ضرور آئے گا۔میں آج بھی اس کی راہ تکتی ہوں۔" یہ کہہ کر رانی پنکھی نے گہرا سانس لیا۔

"اماں اتنے برس بیت جانے کے بعد اب کیا اس کی راہ دیکھنی۔دل سے نکال کر پھینک دے اسے۔" انارہ نے مشورہ دیا۔

"میری انجو۔دل بڑی عجیب چیز ہے۔پر تو یہ بات ابھی سمجھے گی نہیں۔"

"اچھا اماں۔" انارہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔"تیری کہانی ختم ہوئی۔پر میرے ساتویں گھر کا کیا بنا؟"

"تیرا ساتواں گھر یہی ہے جہاں تو بیٹھی ہے۔تجھے میں نے بتایا تو تھا۔" رانی پنکھی بولی۔

"اماں۔میں اس گھر میں آئی کیسے؟" انارہ اپنی زندگی کے بارے میں بے چین تھی۔

"میں اب تیرے بارے میں بتاتی ہوں کہ تو کون ہے اور آئی کہاں سے۔" رانی پنکھی نے پہلو بدلتے ہوئے کہا۔

o⋯⋯o⋯⋯o

اس کا خیال تھا کہ کندھے پر ہاتھ رکھنے والا ضرور بابا دُنیا ہے لیکن وہ بابا دُنیا نہ تھا،اس کا دوست وقار تھا۔وقار کو دیکھ کر جہاں عابر حیران ہوا،وہاں اسے بے انتہا خوشی بھی ہوئی۔ دونوں ایک دوسرے سے لپٹ گئے اور دیر تک لپٹے رہے۔

"عابر تو یہاں کہاں؟" وقار نے الگ ہوتے ہوئے پوچھا۔

"اور تو لاہور میں کیا کر رہا ہے؟" عابر نے جواب دینے کے بجائے سوال کیا۔

"مجھے یہاں بینک میں ملازمت مل گئی ہے۔" وقار نے بتایا۔

"کب سے ہے یہاں؟" عابر نے پوچھا۔

"ابھی پچھلے مہینے آیا ہوں۔" وقار نے کہا۔"لیکن تو یہاں کیا کر رہا ہے؟"

"یار مت پوچھ کہ مجھ پر کیا گزری۔میں اپنی جان بچا کر بھاگا ہوں۔کتنا اچھا ہوا کہ تو مجھے مل گیا۔اللہ جو کرتا ہے بہتر کرتا ہے۔"

"چل پھر میرے ساتھ چل۔" وقار نے اس کا ہاتھ پکڑ کر سیڑھیاں چڑھنا شروع کیں۔"فاتحہ پڑھ لیں،پھر نکلتے ہیں یہاں سے۔"

فاتحہ پڑھنے کے بعد جب وہ داتا دربار کی سیڑھیاں اُتر رہے تھے تو عابر نے پوچھا۔"تم یہاں کہاں ٹھہرے ہو؟"

"فی الحال تو میں گڑھی شاہو میں چچا کے گھر مقیم ہوں۔چچا چاہتے ہیں کہ میں مستقل ان کے ساتھ رہوں لیکن ابو کی ہدایت تھی کہ میں لاہور جا کر جلد از جلد کہیں اور اپنا ٹھکانہ کر لوں۔چچا کے گھر کے نزدیک ہی دو کمرے کا مکان مل گیا ہے۔ایک دو دن میں وہاں شفٹ ہو جاؤں گا۔"

"او۔یہ تو بہت اچھا ہے۔دو کمرے کا مکان ہے پھر تو میں تیرے ساتھ ہی ایڈجسٹ ہو جاؤں گا۔" عابر نے مستقبل کی پلاننگ کرتے ہوئے کہا۔

"ہاں۔ٹھیک ہے۔" وقار ہنستے ہوئے بولا۔

پھر وقار،عابر کو اپنے ساتھ لے کر چچا سلمان کے ہاں پہنچا۔آج چھٹی کا دن تھا۔وقار کے چچا اور اس کے کزن وغیرہ سب گھر پر ہی تھے۔وقار نے عابر کو ان سے ملایا اور بتایا کہ میرا یہ دوست کراچی سے ملازمت کی تلاش میں آیا ہے۔اب یہ میرے ساتھ ہی رہے گا۔

دوپہر کا کھانا کھا کر وقار نے اپنے گھر کی چابی لی اور عابر کو اپنے ساتھ لے آیا۔کمرے میں ایک بیڈ موجود تھا۔دونوں آرام سے لیٹ گئے۔

تب عابر نے وہاں سے سلسلہ جوڑا جس سے وقار واقف نہ تھا۔اس نے آرزو سے ملاقات سے لے کر ڈاکٹر اعتبار کے خفیہ ٹھکانے،اس کے تجربے اور فارم ہاؤس سے دبئی کے لیے روانگی اور راستے سے فرار ہو کر داتا دربار تک پہنچنے تک ہر بات اس کے گوش گزار کردی۔

اس کی روداد سن کر وقار سنانے میں آگیا۔"حیرت ہے یار۔تجھے جو ملا،وہ فراڈ ہی ملا۔"

"وقار تو جانتا ہے کہ میں نے کبھی کسی کو نقصان نہیں پہنچایا۔پھر میرے ساتھ ایسا کیوں؟"

"اب تُو سب کے ساتھ فراڈ کرنا شروع کردے۔پھر سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

"او جانے دے یار۔اب میرے ساتھ دنیا بُری ہے تو میں ان جیسا کیوں بن جاؤں۔" عابر نے گہرا سانس لے کر کہا۔"بابا دُنیا جب بھی ملتے،یہی کہتے کہ تجھے دُنیا ڈھونڈ رہی ہے۔ان کا مطلب شاید یہی ہوگا کہ دُنیا مجھے فریب دینے کے لئے ڈھونڈ رہی ہے۔نہیں پتا کب تک یہ سلسلہ چلے گا۔"

"عابر اب تم نے ایک کام کرنا ہے۔اس گھر سے باہر نہیں نکلنا ہے۔"

"کیوں۔خیریت؟" عابر نے پوچھا۔

"ڈاکٹر اعتبار کے گُرگے تمہیں ڈھونڈتے پھر رہے ہوں گے۔ڈاکٹر اعتبار یہ تصور بھی نہیں کرسکے گا کہ تم اس شہر میں موجود ہو۔سمندر خان تمہیں ایئرپورٹ،ریلوے اسٹیشن اور بسوں کے اڈوں پر تلاش کر رہا ہوگا۔کچھ دن یہ لوگ جھک مار کر خاموشی سے بیٹھ جائیں گے۔وہ تم سے ویسے ہی خوفزدہ ہے۔اگر اسے یہ معلوم ہو جائے کہ تم اس کے دبئی منصوبے سے آگاہ ہو چکے ہو تو پھر یقیناً وہ تمہاری تلاش چھوڑ دے گا۔تمہاری بلی نے جو اسے نقصان پہنچایا ہے،یہ وجہ آئندہ تم سے پنگا نہ لینے کے لیے کافی ہے۔پر یار وہ بلی کہاں ہے؟ ذرا مجھے بھی تو دکھا۔" وقار شرارت سے بولا۔

"بلی تھیلے میں ہے۔" عابر نے ہنس کر جواب دیا۔

"تھیلے سے کب باہر آئے گی۔" وقار نے پوچھا۔

"پتا نہیں۔" عابر نے کندھے اچکائے۔

"بلی ہے یا تاشقند کا معاہدہ۔" وقار نے بیڈ سے اُٹھتے ہوئے کہا۔"اچھا۔میں چچا کے گھر جا رہا ہوں۔تم یہیں رہو۔میں باہر سے تالا لگا کر جا رہا ہوں۔اب تم میرے قیدی ہو۔" اتنا کہہ کر وہ ہنستا ہوا چلا گیا۔

o⋯⋯o⋯⋯o

قیدی تو انارہ بھی تھی لیکن اب اس کی رہائی کے دن قریب تھے۔اس سوال کے جواب میں کہ انارہ کون ہے؟ رانی پنکھی نے لب کھولے تو انارہ منہ کھولے رہ گئی۔

ایک زمانے میں رانی پنکھی کو سانپوں سے بے حد دلچسپی تھی۔ٹھٹھہ کے نواح سے ایک سپیرا بخشو خان اس کے پاس آیا کرتا تھا۔وہ کالا جادو سیکھنے کے چکر میں اس کا چیلا بن گیا تھا۔ سانپوں کے بارے میں بخشو کا علم بہت گہرا تھا۔رانی پنکھی کو اپنے ایک عمل کے لیے مخصوص سانپ درکار تھے۔باہمی دلچسپی نے دونوں کو ایک دوسرے کی ضرورت بنادیا تھا۔بخشو دو تین ماہ کے بعد ٹھٹھہ سے لاہور کے چکر لگاتا رہتا تھا۔وہ اس کے لیے اندرونِ سندھ سے نایاب سانپ پکڑ کر لاتا۔رانی پنکھی ان انتہائی زہریلے سانپوں کو کھا کر چلنے کا ناٹا کرتی۔

ایک بار بخشو آیا تو اس کے پاس نایاب سانپ تو تھا ہی،ساتھ ہی ایک پانچ چھ سال کی بچی بھی تھی۔رانی پنکھی سانپ کو بھول کر اس بچی کو دیکھنے لگی۔سانولی سلونی اس لڑکی میں اتنی کشش تھی کہ وہ اس پر سے نظریں نہ ہٹا سکی۔

رانی پنکھی کو اس قدر محویت سے اس لڑکی کو دیکھتے دیکھ کر بخشو بولا۔"مائی،خیر تو ہے؟"

"بخشو تو نے اسے کہاں سے پکڑا؟" رانی پنکھی نے پوچھا۔

"مائی۔سانپ کے بارے میں پوچھتی ہو یا اس چھوکری کے؟"

"چھوکری کے بارے میں پوچھ رہی ہوں۔" رانی پنکھی نے گمبھیر لہجے میں کہا۔

"یہ چند مہینے پہلے مجھے ایک گوٹھ کے باہر روتی ملی تھی۔میں اسے اپنی جھولی میں ڈال لایا۔اسے اپنے نام کے علاوہ کچھ اور معلوم نہیں۔اپنا نام انارہ بتاتی ہے۔"

"یہ بلونگڑی مجھے اچھی لگی ہے۔بول کیا دوں اس کا؟" رانی پنکھی نے انارہ کا ہاتھ پکڑ کر اپنے قریب کرلیا۔

"مائی تمہیں اچھی طرح پتا ہے کہ میں کیا چاہتا ہوں۔" بخشو ہنس کر بولا۔

"نہیں۔مجھے نہیں پتا کہ تو کیا چاہتا ہے۔ذرا پھر سے کہہ۔" رانی پنکھی نے کہا۔

"مجھے سونا بنانے کی ترکیب بتادے۔" بخشو نے اپنی شدید خواہش فوراً دہرادی۔

"اچھا۔" رانی پنکھی نے انارہ کو دیکھا۔"تو نے اس کی کم قیمت لگائی۔یہ سونے سے بھی مہنگی ہے۔چل سودا طے ہوا۔میں تجھے سونا بنانا سکھادوں گی۔"

"تمہاری بڑی مہربانی مائی۔" بخشو نے رانی پنکھی کے پاؤں پکڑ کر کہا۔"انارہ پر اب میرا کوئی حق نہ رہا۔"

"بخشو۔اس بات کو بھولنا نہیں۔" رانی پنکھی نے تنبیہی انداز میں کہا۔

رانی پنکھی نے انارہ کے عوض بخشو کو سونا بنانے کی ترکیب سکھادی لیکن وہ جانتی تھی کہ جو اس چمکتی چیز کے پھیر میں پڑ جاتا ہے،وہ برباد ہو کر رہتا ہے۔بخشو 'نسخۂ کیمیا' لے کر گیا تو پھر واپس نہ پلٹا۔

رانی پنکھی نے انارہ کا نام تبدیل کر کے انجلا کماری رکھ دیا۔پھر وہ انجلا سے انجو ہوگئی۔رانی پنکھی میٹرک پاس تھی۔اس نے انارہ کو گھر پر پڑھایا لکھایا۔اس کی تربیت کی۔جب انارہ بارہ سال کی ہوئی تو بگا نے اسے قید کرنے کا مشورہ دیا۔اس نے کہا۔"دیکھ پنکھی۔یہ بارہ برس کی ہوگئی ہے۔اسے ہر بات کا شعور آگیا ہے۔یہ کسی بھی دن گھر سے نکل جائے گی اور خود نہ گئی تو تیرے پاس آنے والے لوگوں میں سے کوئی لے اُڑے گا۔یہ بہت قیمتی بالا ہے۔اسے بلی بنا کر رکھ۔اس طرح یہ محفوظ بھی ہو جائے گی اور وقت پر ہمارے کام بھی آ جائے گی۔"

"بگا۔تو کیا چاہتا ہے؟"

"بتا دوں گا۔پریشانی کیا ہے؟"

تب بگا کے اصرار پر انارہ کو بلی کے روپ میں قید کرلیا گیا۔قید کرنے کا عمل اتنا آسان نہ تھا لیکن رانی پنکھی کو اس عمل سے گزرنا پڑا۔وہ نہیں چاہتی تھی کہ انارہ جس سے اسے محبت ہوگئی تھی،اس کے ہاتھ سے نکل جائے۔بگا کیا کھیل،کھیل رہا تھا۔اس بات کا اسے اندازہ نہ تھا۔

سولہواں سال مکمل ہوتے ہی بگا نے جو فرمائش کی،اس نے رانی پنکھی کے چودہ طبق روشن کردیے۔اس نے بے اختیار ہو کر کہا۔"نہیں بگا ایسا نہیں ہوسکتا۔"

اس کی بات سن کر رانی پنکھی کو بہت تکلیف پہنچی تھی۔انارہ پہلے ہی جنم جلی تھی۔اس کی زندگی میں دُکھوں کے سوا کچھ تھا ہی نہیں۔وہ ایک زمانے سے سسکتی،تڑپتی مرتی چلی آرہی تھی۔رانی پنکھی نے طے کرلیا تھا کہ وہ اب اسے مرنے نہیں دے گی۔وہ چھ بار مرچکی تھی۔اب ساتویں بار پھر موت اس کے تعاقب میں تھی۔بگا منہ پھاڑے کسی مگرمچھ کی طرح اس کی طرف بڑھ رہا تھا۔

رانی پنکھی کے ساتھ اب وہ انارہ کا بھی دشمن ہوگیا تھا۔

o⋯⋯o⋯⋯o

عابر کو وقار کے گھر میں قیام پذیر ہوئے آٹھ روز ہو چکے تھے۔وقار،چچا کے گھر سے اس دو کمرے کے مکان میں منتقل ہو چکا تھا۔وقار نے اب اس کی قید ختم کر کے گلی محلے میں نقل و حرکت کی اجازت دے دی تھی۔ویسے بھی اسے اندازہ تھا کہ یہ محلّہ ڈاکٹر اعتبار کی رینج سے بہت دور تھا۔لہٰذا خطرہ کوئی نہ تھا،بس احتیاط جاری تھی۔

اس گھر میں دونوں کمرے آگے پیچھے تھے۔پچھلے کمرے میں عابر رہائش پذیر تھا۔ایک رات وقار کی اچانک آنکھ کھلی تو اس نے عابر کے کمرے کی لائٹ روشن دیکھی۔اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ عابر اتنی رات گئے لائٹ جلا کر کیا کر رہا ہے۔وہ اٹھ کر اس کے کمرے کی طرف بڑھا۔ابھی وہ دروازے پر ہی پہنچا تھا کہ ٹھٹھک کر رک گیا۔

سامنے عابر بیڈ پر دراز گہری نیند میں تھا اور اس کے پہلو میں ایک کالے منہ کی سفید بلی ہاتھ پیر ڈھیلے چھوڑے آنکھیں بند کیے لیٹی تھی۔دروازے پر کسی کی موجودگی کا احساس

PDF BY Manzoor

ہوتے ہی وہ بلی اُٹھ بیٹھی۔ اس نے ایک نظر وقار کو دیکھا اور بیڈ سے فرش پر چھلانگ لگائی اور تیزی سے دوڑتی ہوئی کمرے سے نکل گئی۔ بلی کو اپنی طرف بڑھتے دیکھ کر وقار فوراً ایک طرف ہو گیا تھا۔ اس نے بلی کو اپنے کمرے سے باہر صحن میں جاتے دیکھا۔

کالے منہ کی سفید بلی کو دیکھ کر وقار کو اب پختہ یقین ہو گیا کہ عابر نے جو کہا سچ کہا۔ اس نے تیزی سے آگے بڑھ کر عابر کو جھنجھوڑ ڈالا۔ عابر یکدم گھبرا کر اٹھا۔ وقار کو اپنے کمرے میں پا کر اسے گمان ہوا کہ ضرور کوئی گڑبڑ ہو گئی ہے۔

''وقار۔ کیا ہوا؟'' عابر نے وقار کے چہرے پر ہوائیاں اُڑتے دیکھ کر کہا۔

وقار نے جب کالے منہ کی بلی کے بارے میں تفصیل سے بتایا تو عابر نے فوراً پوچھا۔ ''تجھے کوئی نقصان تو نہیں پہنچایا؟''

''نہیں۔'' وقار نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ''یار۔ ایک بات میں تجھے بتا دوں کہ وہ بلی نہیں ہے۔''

''ابے۔ پھر کیا شیرنی ہے؟'' عابر نے پوچھا۔

''نہیں۔ وہ بلی نہیں بلا ہے۔'' وقار نے انکشاف فرمایا۔ یہ اندازہ اس نے اس وقت لگایا جب وہ بلا عابر کے ساتھ بے سُدھ انداز میں لیٹا ہوا تھا۔

''او۔ یار تیری ریسرچ کا شکریہ۔ میں یہ اندازہ نہیں لگا پایا۔ ویسے میں نے اسے ایک آدھ بار ہی دیکھا اور وہ بھی چھلانگیں مارتے ہوئے۔''

''کیا اس وقت تم نے اسے نہیں دیکھا؟'' وقار نے سوال کیا۔

''نہیں۔ تم مجھے نہ اُٹھاتے تو میں صبح ہی اُٹھتا۔'' عابر بولا۔

''میں بھی شاید اسے نہ دیکھ پاتا۔ تمہارے کمرے کی لائٹ کھلی ہونے پر میں کمرے میں آیا، یہ دیکھنے کے لیے کہ تم اس وقت لائٹ جلا کر کیا کر رہے ہو؟''

''لیکن یار۔ میں تو لائٹ جلا کر نہیں سویا تھا۔'' عابر نے بتایا۔

''پھر لائٹ کیسے جلی؟''

''پتا نہیں۔''

''یار۔ یہ بلا تیرے پیچھے کیوں لگا۔ بلی لگتی تو کوئی بات بھی تھی۔'' وقار کی آنکھوں میں شرارت اُتر آئی۔

''یہ سارا کھیل ڈاکٹر اعتبار کی لیب سے شروع ہوا۔ پتا نہیں یہ کیا چیز ہے۔''

''بہر حال، جو بھی ہے، تمہارا محافظ ہے۔'' وقار یہ کہہ کر اس کے کمرے سے نکل آیا۔ اس نے واش روم جانے کے لیے صحن کی لائٹ جلائی۔ صحن کے ایک طرف واش روم اور دوسری جانب کچن تھا۔ ابھی اس نے صحن میں قدم رکھا ہی تھا کہ کچن کے دروازے پر عجب نظارہ دیکھا۔

o……o……o

ابھی رانی پنکھی اسی اُدھیڑ بُن میں تھی کہ بگا کی تکلیف دہ فرمائش کا کیا جواب دے کہ کالی آ پہنچی۔ رانی پنکھی سمجھی کہ وہ اس کا خون لینے آئی ہے لیکن اس کے ہاتھ میں پیالہ نہیں تھا۔ وہ اس وقت خون کی بھینٹ لینے نہیں، بگا کا پیغام لے کر آئی تھی۔

''ہاں۔ بول۔ کیا کہنے آئی ہے؟'' رانی پنکھی نے سوال کیا۔

''بگا نے انجو کے بارے میں کچھ کہا تھا۔ تُو نے جواب نہیں دیا۔'' کالی نے سوال کیا۔

''میں جواب سوچ رہی ہوں۔''

''اب جواب دینے کا وقت گزر گیا۔ بگا نے حکم دیا ہے کہ انجو کو فوراً آزاد کر دے اور آج سے تیرہویں دن اماوس کی رات اس کی بلی چڑھانے کی تیاری کر لے۔ اور یہ بات اچھی طرح اپنے بھیجے میں بٹھا لے کہ بگا، انجو کی ہر صورت بھینٹ لے کر رہے گا۔ تجھے بگا پر اسے قربان کرنا ہو گا۔ میری بات کیا تُو نے اچھی طرح سمجھ لی؟''

''اگر میں انجو کی بھینٹ دینے سے انکار کر دوں تو؟'' رانی پنکھی نے سر اُٹھایا۔

''تُو کیوں تباہ برباد ہونا چاہتی ہے۔ آخر تُو چاہتی کیا ہے۔ تجھے ہر کام میں نہیں کہنے کی عادت کیوں ہے۔'' کالی نے اپنی منہ سے باہر نکلی سرخ زبان ہلائی۔

''بگا سے پوچھنا کہ اسے غلط کام کرانے کی عادت کیوں ہے؟''

''بھینٹ لینا اس کا حق ہے۔ آخر اس نے انجو کا ''بھینٹ بالا'' بننے کا اتنے برس انتظار جو کیا ہے۔'' کالی بولی۔

''اس نے یہ بات مجھ سے چھپا کر رکھی۔ اگر وہ اپنا ارادہ مجھ پر پہلے سے ظاہر کر دیتا تو میں انجو کو گھر میں رکھتی ہی نہیں۔ اسے کب کا آزاد کر دیتی۔''

''اب کر دے آزاد۔ بگا خود یہ چاہتا ہے۔''

''ہاں میں اسے آزاد کر دوں گی لیکن اسے بھینٹ چڑھانے کے لیے نہیں۔ میں اپنی انجو کو کبھی قربان نہیں ہونے دوں گی۔''

''تو پھر اپنی قربانی کی تیاری کر لے۔'' کالی نے ایک اور پتا پھینکا۔

''ہاں۔ میں خود قربان ہو جاؤں گی لیکن اپنی انجو کو بلی چڑھنے سے بچا لوں گی۔''

''تو پھر میں بگا کو تیری طرف سے یہ پیغام دے دوں کہ تو اس کی رانی بننے کے لیے تیار ہے۔'' کالی نے اپنی سرخ آنکھوں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں، جا۔ اب دفع ہو جا۔'' رانی پنکھی نے گلوگیر آواز میں کہا اور اس منحوس صورت کالی کی طرف سے منہ پھیر لیا۔

رانی پنکھی [illegible]

PDF BY Manzoor

یہ چیخ یقیناً انارہ کی تھی۔

رانی پنکھی گھبرا کر کمرے کی طرف بھاگی۔ جب وہ کمرے میں پہنچی تو انارہ کو چیخ چیخ کر روتے پایا۔ وہ بیڈ پر اس کے ساتھ بیٹھ گئی اور اسے خود سے لپٹاتے ہوئے بولی۔ ''کیا ہوا انجو؟''

رانی پنکھی کو قریب پا کر وہ اور زور زور سے رونے لگی۔ رانی پنکھی نے اسے رونے دیا۔ وہ اس کے ریشمیں بالوں پر ہاتھ پھیرتی رہی۔ جب انارہ کی سسکیاں کم ہوئیں تو رانی پنکھی نے اس کا چہرہ اٹھا کر اپنی طرف کیا اور بولی۔ ''میرے ہوتے ہوئے تجھے رونے کی ضرورت نہیں۔ مجھے بتا کیا ہوا؟''

''اماں۔ میں نے کالی کی ساری باتیں سن لی ہیں۔'' انارہ نے اس کے کندھے پر سر رکھتے ہوئے کہا۔ ''اماں۔ اگر بگا میری بھینٹ مانگ رہا ہے تو مجھے اس کی بھینٹ چڑھ جانے دے۔ میں تو یگ یگ سے قربان ہوتی آ رہی ہوں۔ اب ایک بلی اور سہی۔ تو اپنے آپ کو برباد نہ کر۔ زبردستی اس کی رانی نہ بن۔''

''نہیں میری انجو۔ تو پریشان مت ہو۔'' رانی پنکھی نے انارہ کا آنسوؤں سے بھیگا چہرہ اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے کہا۔ ''میں نے تجھے پال پوس کر اس لیے سولہ سال کا نہیں کیا کہ تیری بلی دے دوں۔ میں مٹ جاؤں گی لیکن تجھ پر آنچ نہیں آنے دوں گی۔ اب میں تیری آنکھ میں آنسو نہ دیکھوں۔ مجھے وہ کرنے دے جو میں چاہتی ہوں۔ میں دیکھتی ہوں کہ وہ کہاں ہے؟''

''اماں۔ کون کہاں ہے؟'' انارہ نے خود کو سنبھالتے ہوئے کہا۔

''تیری زندگی کا ساتھی۔'' رانی پنکھی کچھ سوچتے ہوئے بولی۔ ''مجھے لگتا ہے کہ وہ کہیں آس پاس ہی موجود ہے۔''

''ہائے سچ!'' انارہ یکدم کھل اُٹھی۔ ''اماں جلدی پتا کر، میرے بھاگ جگانے والا کہاں ہے؟''

''پتا کرتی ہوں۔'' رانی پنکھی انارہ کے بیڈ سے اُٹھتے ہوئے بولی۔ ''انجو، چل باہر آ جا۔ پہلے تجھے بلی کے روپ سے آزادی دلاؤں۔''

''اماں۔ تو کتنی اچھی ہے، جو فیصلہ تو نے مجھے بچانے کے لیے کیا ہے، شاید میری سگی ماں بھی ایسا نہ کرتی۔''

''انجو۔ اس بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتی کہ تیری سگی ماں کیا کرتی لیکن اتنا ضرور ہے کہ بگا کی رانی بننے کا فیصلہ میں نے دل سے نہیں کیا۔ تجھ جنم جلی کو سکھ بھری زندگی مل جائے۔ اس احساس کے ساتھ میں، میں نیا جیون کاٹ لوں گی۔ آ چل باہر آ جا۔'' رانی پنکھی نے کمرے سے نکلتے ہوئے کہا۔

انارہ اس کے ساتھ ہی باہر صحن میں آ گئی۔ رانی پنکھی نے باورچی خانے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ ''میں ہون تیار کرتی ہوں جب تک تو اشنان کر کے آ جا۔''

''اچھا اماں۔'' یہ کہہ کر انارہ غسل خانے کی طرف بڑھ گئی۔

رانی پنکھی نے باورچی خانے میں جا کر چولہا جلایا۔ پھر اس نے گرم راکھ چولہے سے نکال کر المونیم کے بڑے پیالے میں بھری اور باہر صحن میں آ گئی۔ اس نے صحن کے درمیان

PDF BY Manzoor

پیالے سے اس طرح راکھ گرائی کہ ایک حصار سا بن گیا۔ اس کے بعد اس نے راکھ اور جلتے کوئلے اس حصار میں ڈالے اور پھر چار پانچ جلتی ہوئی لکڑیاں حصار میں رکھ دیں۔ اس طرح ''ہون'' تیار ہو گیا۔

اتنے میں انارہ غسل کر کے باہر آ گئی۔ نہانے کے بعد اس کے حسن میں مزید نکھار آ گیا تھا۔ رانی پنکھی اسے تحسین آمیز نظروں سے دیکھتی رہی۔ یہی عمر تو تھی جب اُس پر جوانی ٹوٹ کر برسی تھی۔ آئینے میں اپنا عکس دیکھ کر غرور سے اس کی گردن تن جایا کرتی تھی۔ وہ کسی بھی مرد کو بغیر خنجر کے قتل کرنے کی صلاحیت رکھتی تھی۔ یہ اس کی بدقسمتی تھی کہ اس کی مرضی کے خلاف اس کی بولی لگا دی گئی اور پھر بولی لگانے والی سچ مچ کے خنجر سے قتل ہو گئی اور وہ سچ مچ کی قاتلہ بن گئی۔

''اماں۔ کیا دیکھ رہی ہے؟'' رانی پنکھی کی نظریں جب مسلسل اس پر مرکوز رہیں تو اُسے ٹوکنا پڑا۔

''انجو۔ اس وقت تجھے دیکھ کر بیتا زمانہ یاد آ گیا۔ کبھی مجھ پر بھی اسی طرح بہار آئی تھی۔'' رانی پنکھی نے مسکرا کر کہا۔ ''آ انجو۔ ہون کے سامنے بیٹھ جا۔''

انجو زمین پر جلتے الاؤ کے سامنے بیٹھ گئی۔ رانی پنکھی نے ایک جلتی لکڑی الاؤ سے نکال کر اس کے چاروں طرف گھمائی اور پھر کچھ پڑھتے ہوئے لکڑی اپنی جگہ رکھ دی۔ جلتی لکڑی واپس رکھتے ہی انارہ کو اپنے اندر اِک آگ سی لگتی محسوس ہوئی۔

''آ۔ انجو۔ آ۔'' رانی پنکھی نے آنکھیں بند کر کے زور سے آواز لگائی۔

''اماں۔ میں تیرے سامنے بیٹھی تو ہوں۔'' انارہ فوراً بولی۔

''تو مجھے دکھائی دے رہی ہے۔ تو چپ بیٹھ۔'' رانی پنکھی نے اسے تنبیہہ کی۔ ''یہ کہاں مر گئی۔ انجو آ۔''

o.....o.....o

وقار نے دیکھا کہ اس کالے منہ کے سفید بلّے کے ساتھ ایک اُس جیسی ہی بلّی موجود ہے۔ یہ ہم شکل بلّی، بلّے کے مقابلے میں تھوڑی دُبلی تھی۔ باقی دونوں کی شکلوں میں سرمو فرق نہ تھا۔ دو ہم شکل بلیاں دیکھ کر وقار پریشان ہو گیا۔ وہ واش رام جانا بھول گیا۔ واپس عابر کے کمرے میں آیا۔

وقار کو بدحواس دیکھ کر عابر فوراً اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ وہ بولا۔ ''اب کیا ہوا یار؟''

''تیرے ہوتے ہوئے جو نہ ہو جائے کم ہے۔ ذرا باہر چل کر دیکھ۔'' وقار اس کا ہاتھ پکڑ کر اُٹھاتے ہوئے بولا۔

دونوں نکل کر باہر آئے۔ وقار نے کچن کی طرف اشارہ کیا۔ ''یہ دیکھو۔''

عابر نے کچن کے دروازے کی طرف دیکھا تو وہاں اسے کچھ نظر نہ آیا۔ وقار نے گھوم پھر کر چاروں طرف دیکھا، حتیٰ کہ وہ واش روم میں بھی جھانک آیا، لیکن وہ دونوں کہیں موجود نہ تھے۔ ''یار یہ کیا چکر ہے؟''

''ہوا کیا۔ کچھ بتاؤ تو؟'' عابر نے وقار کو کونے بچالوں میں کچھ ڈھونڈتے پا کر پوچھا۔

''یار۔ یہاں۔ کچن کے دروازے پر دو ہم شکل بلا بلّی ایک ساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔ دونوں کے منہ کالے اور جسم سفید تھے۔ یار عابر میں جھوٹ نہیں بول رہا ہوں۔ اتنی دیر میں جانے وہ کدھر چلے گئے؟'' وقار پریشان ہو کر بولا۔

''اس میں پریشان ہونے کی کیا بات ہے۔ میرے کمرے سے باہر آنے تک، اتنی دیر میں وہ کہیں بھی چھلانگ مار کر جا سکتے ہیں۔ لیکن مسئلہ یہ ہے کہ میرے بلّے نے ایک ہفتے میں اپنے جیسی بلّی بھی ڈھونڈ لی۔ یار، یہ اپنا بلا تو بڑا تیز نکلا۔'' عابر نے ہنستے ہوئے بات کا رُخ پھیرا۔

''بس پھر تو ڈوب مر چلّو بھر پانی میں۔'' وقار نے واش روم کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

o.....o.....o

اور جب انجو کے ساتھ اس کے ہم شکل بلّے نے بھی باورچی خانے کی چھت سے صحن میں چھلانگ لگائی تو انارہ پُرحیرت انداز میں چیخی۔ ''اماں، یہ تو ایک سے دو ہو گئیں۔''

رانی پنکھی نے ان دونوں کو بغور دیکھا اور پھر مسرت بھرے لہجے میں بولی۔ ''یہ ایک سے دو نہیں بلکہ دو سے ایک ہوئے ہیں۔''

''ہائے اماں۔ ذرا غور سے دیکھ۔ تیری آنکھوں نے کام کرنا چھوڑ دیا کیا۔ مجھے تو یہ دو نظر آ رہی ہیں، بالکل ایک جیسی۔''

''بے وقوف لڑکی۔ یہ بات میں نے غور سے دیکھنے کے بعد ہی کہی ہے کہ یہ دو سے ایک ہوئے ہیں۔ اری ان میں سے ایک بلا ہے۔ اب مجھے کچھ پتا کرنے کی ضرورت نہیں۔ جو کام مجھے کرنا تھا، وہ انجو کر کے آ گئی۔ وہ آ گیا ہے اور یہیں پاس پڑوس میں ہے۔ بس اب تیرے بھاگ جاگنے کو ہیں۔''

''اماں۔ جلدی بتا اس کی شکل کیسی ہے؟'' انارہ بے چین ہو کر بولی۔

''ایسی بے کل نہ ہو۔ مجھے اپنا کام کرنے دے۔ بہت جلد سب کچھ تیرے سامنے آ جائے گا۔ پہلے تو اس قید سے رہائی تو پا لے۔'' رانی پنکھی مسکراتے ہوئے بولی۔ پھر اس نے بلّی کو اشارہ کیا۔ وہ اشارہ پاتے ہی رانی پنکھی کے نزدیک آ گئی جبکہ بلا اپنی جگہ بیٹھا رہا۔

رانی پنکھی نے ایک جلتی لکڑی الاؤ سے نکال کر بلی کے چاروں طرف گھمائی اور پھر کچھ پڑھتے ہوئے لکڑی الاؤ میں رکھ دی۔ اس کے بعد اس نے چاندی کا بھاری تعویذ گلے سے اُتارا اور اس پر کچھ پڑھ کر پھونکا۔ پھر اس نے وہ تعویذ انارہ کی پیشانی پر رکھا اور اسے انگوٹھے سے دبایا۔

تعویذ کے پیشانی پر رکھتے ہی انارہ کو یوں لگا جیسے اس کے اندر الاؤ بھڑک اُٹھا ہو۔ وہ شعلوں میں گھر گئی ہو۔ یکدم اس کے جسم کو جھٹکا لگا اور وہ بے ہوش ہو کر ایک طرف لڑھک گئی۔ پھر یہی عمل اس نے بلّی کے ساتھ دُہرایا۔ وہ چیخ مار کر یکدم فرش پر لیٹ گئی۔ تب بلّے نے خوفزدہ ہو کر باورچی خانے کی چھت پر چھلانگ لگائی اور دروازے کی دیوار پر دوڑتا

PDF BY Manzoor

ہوا گلی میں کود گیا۔ رانی پنکھی نے اسے جاتے ہوئے دیکھا لیکن اسے روکنے کی کوشش نہیں کی۔

پھر اس نے چاندی کا بھاری تعویذ گلے میں ڈالا۔ اپنے لہنگے میں ٹنکی سوئی نکال کر اپنی اُنگلی پر ماری۔ خون کے تین قطرے جلتے الاؤ پر ٹپکائے۔ خون کے قطرے آگ پر گرتے ہی وہ یوں بجھ گئی جیسے اس پر سولیٹر پانی ڈال دیا گیا ہو۔

الاؤ بجھا کر وہ انارہ کی طرف متوجہ ہوگئی۔ انارہ آنکھیں بند کیے، اینٹوں کے فرش پر بے سُدھ لیٹی ہوئی تھی۔ وہ اس وقت بلا کی حسین لگ رہی تھی۔ رانی پنکھی یک ٹک اسے دیکھتی رہی اور اپنی 'گم شدہ' جوانی اس میں ڈھونڈتی رہی۔ پھر اس نے صحن میں لگے نلکے سے اپنے چلّو میں پانی لیا اور اسے تھوڑا تھوڑا کر کے اس کی دونوں آنکھوں پر ڈال دیا۔

پانی پڑتے ہی انارہ کی آنکھوں میں جنبش ہوئی اور پھر اس نے پٹ سے دونوں آنکھیں کھول دیں۔ اس نے نظریں گھما کر اندازہ کیا کہ وہ کہاں ہے۔ رانی پنکھی پر اس کی نظر پڑتے ہی وہ اُٹھ کر بیٹھ گئی۔ اسے اپنا جسم بہت ہلکا پھلکا لگا۔ پھر وہ شاداں و فرحاں اُٹھ کر کھڑی ہوگئی۔

کالے منہ کی سفید بلی کی آنکھوں پر جیسے ہی پانی پڑا، وہ فوراً ہی اُچھل کر بیٹھ گئی۔ رانی پنکھی نے جھک کر اسے اُٹھا لیا۔ اسے پیار کر کے انارہ کی طرف بڑھا دیا۔ انارہ نے اسے دونوں ہاتھوں میں اُٹھا کر پیار کیا۔ پھر اس کی آنکھوں میں دیکھ کر بولی۔ ''کہاں ہے وہ؟''

یہ سن کر کالے منہ کی بلّی اس کے ہاتھوں میں کسمسائی اور پھر پھسل کر فرش پر کود ی۔ وہاں سے اس نے باورچی خانے کی چھت پر چھلانگ لگائی اور دروازے کی دیوار پر دوڑتی ہوئی گلی میں کود گئی۔ بلّی کے جانے کے بعد رانی پنکھی، انارہ کی طرف بڑھی اور اسے گلے لگا کر بہت دیر تک کھڑی روتی رہی۔

o.....o.....o

عابر کو وہ خواب صبح صادق میں نظر آیا تھا۔

ایک مرتبہ پھر اس نے اپنے دادا نثار ایوب کو دیکھا تھا۔ یہ خواب بہت صاف اور واضح تھا۔ جب اس کی آنکھ کھلی تو اسے یوں محسوس ہوا جیسے دادا ابھی اس کے سرہانے سے اُٹھ کر گئے ہوں۔

اسے دادا کی کہی ہوئی ایک ایک بات اچھی طرح یاد تھی۔ دادا نے اسے جو کچھ بتایا، وہ عابر کو حیران کرنے کے لیے کافی تھا۔ دادا کی اسرار کھولتی باتیں، آنکھیں کھولتی ہدایتیں اور گرہیں کھولتے انکشافات۔ اس خواب نے اس پر سکتہ طاری کر دیا تھا۔ اسے نہیں اندازہ تھا کہ آگے کیا ہونے والا ہے۔

وقار کے دفتر جانے کے بعد جب وہ دروازہ بند کر کے پلٹا تو اس نے کچن کے دروازے پر دو ہم شکل بلیوں کو دیکھا۔ عابر کو یہ اندازہ کرتے دیر نہ لگی کہ ان میں ایک بلا ہے۔ وقار نے جو دیکھا تھا، اب وہ خود اس کے سامنے تھا۔ کسی قسم کی تردید یا شبہے کی گنجائش نہ رہی تھی۔

وہ ان دونوں کو بغور دیکھتا کمرے میں داخل ہوگیا۔ ان دونوں کی شکل و صورت میں کوئی فرق نہ تھا، سوائے جسامت کے۔ بلّے کے مقابلے میں بلّی 'اسمارٹ' تھی۔

عابر کے بیڈ پر بیٹھتے ہی وہ دونوں ہم شکل بلیاں بھی کمرے میں آگئیں اور بے تکلفی سے بیڈ پر چڑھ کر بیٹھ گئیں۔ بلا ذرا فاصلے پر تھا لیکن بلّی اس کے خاصا نزدیک تھی اور منہ اُٹھا کر اس کی طرف بڑے عجیب انداز میں دیکھ رہی تھی۔

عابر نے جونہی اس کی طرف ہاتھ بڑھایا تو بلّی نے فوراً بیڈ سے چھلانگ لگائی اور کمرے سے نکل گئی۔ بلّی کو جاتے دیکھ کر بلّے کے جسم میں بھی حرکت ہوئی اور وہ بھی بیڈ سے کود کر فرش پر آیا اور تیزی سے دوڑتا ہوا کمرے سے نکل گیا۔

عابر جب اُٹھ کر باہر آیا تو وہ دونوں گھر سے غائب ہو چکے تھے۔ عابر نے اُنہیں گھر میں ڈھونڈنے کی کوشش نہیں کی۔ اسے پکا یقین تھا کہ وہ دونوں اب گھر میں نہیں ہیں۔

شام کو وقار دفتر سے آیا تو عابر نے ان ''دونوں'' کی آمد کی اطلاع بہم پہنچائی۔ وقار نے ان کی شکل و صورت کی تصدیق کی۔ پھر ہنس کر بولا۔ ''تو نے یار ٹھیک کہا تھا کہ تیرا بلا بڑا تیز نکلا۔ ایک ہفتے میں ایک زبردست حسینہ پھنسا لایا۔ ویسے یہ کیس کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔''

''اور ابھی میں تجھے جو بتانے والا ہوں، وہ سن کر تیری آنکھیں ضرور پھٹ جائیں گی۔'' عابر نے اس کی طرف مسکراتے ہوئے کہا۔ ''پھر تو کہے گا یار تیرا کیس بھی سمجھ میں نہیں آیا۔''

''مجھے لگتا ہے جیسے میری عقل گم ہونے کو ہے۔'' وقار اپنا سر پکڑ کر بولا۔

o.....o.....o

سفید بلّی اور بلا ایک ساتھ کھلے دروازے سے اندر داخل ہوئے۔ انارہ اور رانی پنکھی چارپائی پر بیٹھی تھیں۔ وہ دونوں رانی پنکھی کے پیروں میں آ کر بیٹھ گئے۔

''انجو۔ کیا تجھے کچھ محسوس ہو رہا ہے۔'' رانی پنکھی نے انارہ کی طرف دیکھا۔

''نہیں اماں۔'' انارہ فوراً بولی۔

''دروازہ تو پورا کھلا ہے نا۔'' رانی پنکھی نے پوچھا۔

''ہاں اماں۔ دروازہ پورا کھلا ہے۔ میں خود کھول کر آئی ہوں۔''

''بس پھر وہ آیا ہی چاہتا ہے۔'' رانی پنکھی نے انارہ کے گلے میں بازو ڈالتے ہوئے کہا۔

''ہائے اماں۔ میرا دل بڑے زور زور سے دھڑک رہا ہے۔''

اتنے میں کھلے دروازے کے ایک کواڑ کو کسی نے آہستہ سے بجایا۔

''لے وہ آ گیا۔'' رانی پنکھی کی خوشی دیدنی تھی۔ پھر وہ اُٹھتے ہوئے بولی۔ ''انجو، تو بیٹھ میں اسے لاتی ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ دروازے کی طرف بڑھی۔

عابر کھلے دروازے کے درمیان کھڑا رانی پنکھی کو اپنی طرف آتے دیکھ رہا تھا۔ اس نے سفید قمیض اور کالی پینٹ پہنی ہوئی تھی۔ جیسے ہی رانی پنکھی کی نظر عابر پر پڑی، ایک لمحے کو اسے اپنا دل بند ہوتا ہوا محسوس ہوا۔ اسے فوراً اپنا شاہ زیب یاد آ گیا۔ نوجوانی میں وہ بالکل ایسا ہی رہا ہوگا۔

PDF BY Manzoor

''تم کون ہو اور کہاں سے آئے ہو؟'' رانی پنکھی نے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔

''میرا نام عابر ہے۔ میں آیا نہیں، بھیجا گیا ہوں۔'' عابر نے اسی انداز میں جواب دیا۔

چارپائی پر بیٹھی انارہ نے اس کی دلکش آواز سنی تو بے کل ہو اُٹھی۔ اس کا جی چاہا کہ وہ فوراً اُٹھ کر اس کو دیکھ لے لیکن وہ اُٹھ نہ سکی۔

''کس نے بھیجا ہے اور کیوں؟'' رانی پنکھی نے اسے اندر آنے کا اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

''مجھے میرے دادا نے بھیجا ہے۔ میں اپنی امانت لینے آیا ہوں۔'' عابر نے صحن میں قدم رکھتے ہوئے کہا۔ ''معاف کیجئے گا۔ آپ کون ہیں؟''

''میں۔!'' رانی پنکھی نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھا۔ ''میں تمہاری امانت کی اماں ہوں۔''

''پھر میرا آپ کو سلام۔ اس کا مطلب ہے کہ میں صحیح جگہ پہنچا ہوں۔'' عابر آہستہ آہستہ رانی پنکھی کے ساتھ قدم اُٹھا رہا تھا اور ساتھ ہی وہ اس خزاں رسیدہ گھر کا جائزہ بھی لیتا جا رہا تھا۔

''ہاں تم ٹھیک جگہ پہنچے ہو۔ مجھے تمہارا بے چینی سے انتظار تھا۔'' رانی پنکھی نے یہ کہہ کر اسے رکنے کا اشارہ کیا اور آواز لگائی۔ ''انجو آؤ۔''

انجو تیزی سے اُٹھی۔ وہ اس وقت کالے بلاؤز اور سفید ساڑھی میں تھی۔ اس نے ساڑھی کا پلو سر پر رکھا اور نظریں جھکائے رانی پنکھی کے پیچھے آ کر کھڑی ہو گئی۔ ''جی ......اماں۔''

''اری میرے پیچھے کیوں چھپتی ہے۔ سامنے آ۔'' رانی پنکھی نے انارہ کا ہاتھ پکڑ کر اُسے آگے کیا اور بولی۔ ''اے لڑکے۔ یہ ہے تمہاری امانت۔ اسے اچھی طرح دیکھ لو، پہچان لو۔''

عابر کی جب انارہ پر نظر پڑی تو اسے یوں لگا جیسے سیاہ بادلوں میں کوئی بجلی سی کوندی ہو۔ ایسا سانولا سلونا قیامت خیز حسن اس نے پہلے بھلا کہاں دیکھا تھا۔ اس کی آنکھیں خیرہ ہو گئیں۔ ایسی چکا چوند ہوئی کہ ایک لمحے کو اس کی آنکھوں سے سب اوجھل ہو گیا۔ اندھیرا سا چھا گیا۔

رانی پنکھی نے انارہ کا ہاتھ دبایا اور کان میں سرگوشی کی۔ ''میری انجو آنکھیں کھول۔''

انجو نے آنکھیں کھولیں تو اس کا سانس اوپر کا اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔ وہ پلکیں جھپکانا بھول گئی۔ اس نے اپنی اس زندگی میں کوئی مرد کہاں دیکھا تھا۔ اس کی زندگی تو رانی پنکھی کا بوڑھا چہرہ دیکھتے گزری تھی۔ اب جو پہلا مرد دیکھا اور وہ بھی شاہکار تو اس کے دل پر جو گزری ٹھیک گزری۔

''بولو۔ کیا تم دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھ لیا۔'' رانی پنکھی نے سوال کیا۔

''میں نے تو دیکھ لیا۔'' عابر ہنس کر بولا۔

''ہاں اماں۔ میں نے بھی۔'' انارہ نے دھیمے لہجے میں کہا۔

''کیا تم دونوں نے ایک دوسرے کو پسند کر لیا؟'' رانی پنکھی نے پھر سوال کیا۔

''ہاں بہت اچھی۔ بہت پیاری۔'' عابر کے ہونٹوں پر شوخ مسکراہٹ تھی۔

''ہاں اماں۔'' انارہ نے مختصر سا جواب دیا۔

''آگے آؤ بیٹا۔'' رانی پنکھی نے عابر سے کہا۔

عابر دو قدم آگے آیا تو رانی پنکھی نے انارہ کا ہاتھ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''تمہاری امانت میں نے تمہیں سونپی۔ اب اس پر میرا کوئی حق نہ رہا۔ آگے تمہاری مرضی۔ ابھی اپنے ساتھ لے جاؤ یا دو دن کے بعد۔ یہ تمہاری ہوئی۔ اسے قبول کرو۔''

عابر نے بلا جھجک اس کا ریشم جیسا ہاتھ اپنے مضبوط ہاتھ میں لے لیا اور پُر اعتماد لہجے میں بولا۔ ''میں نے قبول کیا۔''

''اس کا سدا خیال رکھنا۔'' رانی پنکھی نے بھیگی آنکھوں سے کہا۔

''میں انہیں اپنے دل سے لگا کر رکھوں گا۔'' عابر نے وعدہ کیا۔

''میرا جی تو یہ چاہتا ہے کہ اپنی انجو کو پوری شان سے رخصت کروں۔ پر میری کچھ ذاتی مجبوریاں ہیں۔ شدید خواہش کے باوجود میں اسے باقاعدہ رخصت نہیں کر سکتی۔'' رانی پنکھی نے گلوگیر آواز میں کہا۔

''آپ رنجیدہ نہ ہوں۔ میں کراچی جا کر بڑے پیانے پر شادی کا جشن مناؤں گا۔'' عابر نے تسلی دی۔

''ایشور تم دونوں کو خوش رکھے۔'' رانی پنکھی نے دونوں کو اپنی بانہوں میں سمیٹتے ہوئے کہا۔

پھر عابر نے انارہ کے ساتھ رانی پنکھی کی کئی تصویریں اپنے موبائل فون سے اُتاریں۔ اس کے بعد اس نے رانی پنکھی سے کہا۔ ''یوں تو اس وقت بھی میں انہیں اپنے ساتھ لے جا سکتا ہوں۔ لیکن دو دن مجھے مل جائیں تو میں انہیں یہاں سے سیدھا ایئرپورٹ لے جاؤں گا۔''

''یہ تو بہت اچھا ہوگا۔ اس طرح دو دن اور انجو میرے ساتھ رہ لے گی۔'' رانی پنکھی خوش ہوتے ہوئے بولی۔

o......o......o

کراچی ایئرپورٹ سے جب عابر باہر آیا تو اس نے اپنی پوری فیملی کو اپنا منتظر پایا۔ صائمہ کے ساتھ اس کا شوہر اسلم اور بچے بھی موجود تھے۔ علی نثار اور نازنین غیر متوقع طور پر خوش تھے۔ عابر نے لاہور سے چلنے سے پہلے اپنی ماں کو ہر وہ بات بتا دی تھی جس کا بتایا جانا ضروری تھا۔ دادا کا نام سن کر ہر آدمی ٹھنڈا ہو گیا تھا۔ اگر عابر اپنے طور پر انارہ کو اس طرح لے آتا تو یقیناً اس پر گھر کا دروازہ بند ہو جاتا اور دروازہ بند کرنے والے پہلے شخص علی نثار ہوتے۔ اب کیونکہ درمیان میں ان کے والد محترم آ گئے تھے لہٰذا نفرت دل میں نہ رہی تھی، لیکن تجسس شدت اختیار کر گیا تھا۔ آخر ایسا اس لڑکی میں کیا تھا کہ نثار ایوب نے بہو بنانے کا عندیہ دے دیا تھا۔

سب سے پہلے اس پر صائمہ کی نظر پڑی۔ سفید ساڑھی کے اوپر انارہ نے کالی چادر لپیٹ رکھی تھی اور پیشانی پر پلو کھینچ لیا تھا جس سے اس کا چہرہ بڑی حد تک چھپ گیا تھا۔

''امی۔ یہ عابر کیا چیز اٹھا لایا۔'' صائمہ نے اسے سفید ساڑھی میں دیکھ کر ماں کے کان میں سرگوشی کی۔

''صائمہ۔ یہ مت بھولو کہ یہ تمہارے دادا کا انتخاب ہے۔'' نازنین نے ہلکی سی سرزنش کی۔

عابر، انارہ کو لے کر نازنین کے نزدیک آیا اور انارہ کی طرف اشارہ کر کے بولا۔ ''امی، یہ آپ کی امانت!''

''آ جا۔ میری بچی۔'' نازنین نے فوراً انارہ کو اپنے گلے سے لگا لیا۔

عابر پھر اپنے باپ علی نثار کی طرف بڑھا۔ سلام کر کے اُن کے سامنے جھک گیا۔ علی نثار نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ صائمہ اس سے بے اختیار لپٹ گئی۔ اسلم نے اسے گلے لگایا۔ عابر نے صائمہ کے بچوں کو پیار کیا اور پھر یہ چھوٹا سا قافلہ اپنی منزل کی جانب بڑھا۔

صائمہ اور نازنین نے دن رات ایک کر کے چھ سات دن میں شادی کی تیاریاں مکمل کر لیں۔ سب کی خواہش تھی کہ شادی خوب دھوم دھام سے ہو، لیکن مسئلہ یہ تھا کہ خاندان کے لوگوں کو لڑکی کے بارے میں کیا بتایا جاتا۔ انارہ کا تو آگے پیچھے کوئی نہ تھا۔ لوگ یہی سمجھتے کہ عابر، انارہ کو لاہور سے بھگا لایا ہے۔ کس سے کیا کہتے جبکہ انارہ کا گھریلو پس منظر انتہائی پیچیدہ اور ناقابلِ یقین تھا۔ تب یہی سوچا گیا کہ شادی کی تقریب شادی ہال میں کرنے کے بجائے محدود پیانے پر گھر پر ہی کر لی جائے۔ مار پیچھے پکار ہے۔

صائمہ پہلے دن ہی انارہ کو اپنے گھر لے گئی تھی اور عابر پر ملاقات کی پابندی لگا دی گئی تھی۔ انارہ بہت خوش تھی۔ البتہ رات کو وہ تنہا ہوتی تو بے اختیار رانی پنکھی یاد آ جاتی۔ اسے یوں محسوس ہوتا جیسے وہ اس کے آس پاس ہی ہے۔ رخصت ہوتے وقت رانی پنکھی نے چاندی کا بھاری تعویذ اُتار کر اس کے حوالے کر دیا تھا۔

رانی پنکھی نے کہا تھا۔ ''انجو۔ یہ تعویذ اپنے ساتھ لے جا۔ اسے سمندر میں پھینک دینا۔ یہ فساد کی جڑ ہے۔ اگر یہ میرے کسی چیلے کے ہاتھ لگ گیا تو وہ اس کی شکتی کو برداشت نہیں کر سکے گا۔ وہ پاگل ہو جائے گا۔ طاقت کا استعمال بھی وہی شخص کر سکتا ہے جو خود طاقتور ہو۔ پی کر سب بہک جاتے ہیں۔ اصل وہ جو پی کر نہ بہکے۔ میرے شاگردوں میں ایک بھی اسے سنبھالنے والا نہیں۔ اس کا سمندر بُرد ہو جانا ہی اچھا ہے۔''

وہ تعویذ ابھی تک سمندر کے حوالے نہیں کیا گیا تھا۔ عابر چاہتا تھا کہ شادی ہو جائے۔ پھر وہ انارہ کو سمندر پر لے جائے گا اور اس تعویذ کو رانی پنکھی کی ہدایت کے مطابق سمندر بُرد کر دے گا۔ عابر نے اس تعویذ کو محفوظ کر کے اپنے کمرے میں رکھ لیا تھا۔

انارہ اور عابر کو آئے ہوئے ابھی ایک رات ہی گزری تھی کہ نثار ایوب، عابر کے خواب میں آئے۔ انہوں نے عابر کو سختی سے ڈانٹ کر کہا۔ ''یہ کیا نحوست تم نے اپنے کمرے میں رکھ چھوڑی ہے، اُسے فوراً سمندر بُرد کرو۔''

تب عابر صبح اٹھتے ہی صائمہ کے گھر پہنچ گیا۔ اس نے وہاں سے انارہ کو لیا اور ہاکس بے پہنچا۔ صائمہ بھی ضد کر کے ان کے ساتھ آ گئی تھی۔ انارہ نے سمندر پہلی بار دیکھا تھا۔ سمندر کی وسعت اور اُٹھتی ہوئی لہروں کے شور نے اسے گم صم سا کر دیا۔ ابھی وہ کنارے پر ہی تھے کہ سمندر کی ایک چھوٹی سی لہر نے انارہ کے حسین پاؤں چھوئے تو وہ بے اختیار عابر سے لپٹ گئی۔

صائمہ نے ہنستے ہوئے تنبیہ کی۔ ''نا بھئی نا۔ ادھر سنسر موجود ہے۔ ذرا اس کا خیال رکھیں۔''

انارہ جس بے اختیار انداز میں عابر کے قریب ہوئی تھی، اس سے کہیں زیادہ تیزی سے وہ اس سے الگ ہوئی۔ اس کے سانولے سلونے چہرے پر شرم کی گھٹا چھا گئی تھی۔

تب عابر نے اپنی پینٹ کی جیب سے نکال کر چاندی کے اس تعویذ کو ایک نظر دیکھا۔ وہ خاصا بھاری تھا۔ پتا نہیں یہ وزن چاندی کا تھا یا اس کے اندر کوئی بھاری چیز موجود تھی۔ رانی پنکھی نے ہدایت دی تھی کہ اسے پوری طاقت سے سمندر میں پھینکا جائے۔ یہ سمندر میں جتنا دور جا کر گرے، اچھا ہے۔ سمندر کے حوالے کرنے کے بعد وہاں ٹھہرنا نہیں۔

عابر اسے مٹھی میں دبا کر سمندر کی طرف آگے بڑھا تو صائمہ نے پیچھے سے آواز لگائی۔ ''عابر آگے جانے کی کیا ضرورت ہے۔ یہیں سے پھینک دو۔''

''آپی۔ تھوڑا سا آگے جا کر پھینک دیتا ہوں۔ پریشان مت ہوں۔'' عابر نے کہا۔

ابھی وہ تھوڑا سا ہی آگے گیا تھا کہ اسے اپنی مٹھی گرم ہونے کا احساس ہوا۔ وہ تعویذ ٹھنڈا محسوس ہونے کے بجائے آہستہ آہستہ گرم ہوتا جا رہا تھا۔

عابر کو خطرہ لاحق ہوا کہ کہیں تعویذ اچانک اتنا گرم نہ ہو جائے کہ اسے ہاتھ سے چھوڑنا پڑے۔ تب وہ دو قدم پیچھے ہٹا اور پھر پوری طاقت سے دو قدم آگے بڑھ کر کرکٹ کی بال کی طرح سمندر میں پھینک دیا اور اس پر نظریں جما دیں۔

چند سیکنڈ تک وہ فضا میں جاتا دکھائی دیا۔ پھر اچانک غائب ہو گیا۔ عابر دیکھتا رہا کہ وہ اب سمندر میں گرے، تب گرے لیکن وہ تعویذ اسے پانی میں گرتا دکھائی نہ دیا۔ اس بات کی تائید صائمہ اور انارہ نے بھی کی۔ ان دونوں نے بھی تعویذ کو سمندر میں گرتے نہ دیکھا تھا۔

پھر وہ تینوں رانی پنکھی کی ہدایت کے مطابق سمندر پر نہ رکے۔ فوراً وہاں سے چلے آئے۔

ساتویں دن شادی تھی۔

صائمہ، انارہ کو بیوٹی پارلر سے تیار کروا کر گھر لے آئی تھی۔ گھر میں ہی نکاح کا انتظام کیا گیا تھا۔ علی نثار اور عابر نکاح خواں کا انتظار کر رہے تھے۔

نکاح خواں تھا کہ آ کے نہیں دے رہا تھا۔

دادا نے کہا تھا کہ اس لڑکی کا نکاح بابا کاشف پڑھائیں گے اور انہی کے ہاتھوں یہ مسلمان ہوگی۔ یہ بابا کاشف کون تھے؟ کہاں سے آئیں گے؟ کب آئیں گے؟ کسی کو کچھ معلوم نہ تھا۔

لیکن عابر کو پکا یقین تھا کہ اگر دادا نے کہا ہے تو پھر بابا کاشف ضرور آئیں گے۔ اگرچہ دادا کی ہدایت مبہم تھی۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ بابا کاشف کو نکاح کا دن، وقت اور گھر کا پتا کیسے معلوم ہوگا۔ عابر سوچتا تھا کہ اسے انارہ کے بارے میں بھی تو کچھ پتا نہ تھا۔ دادا کی نشاندہی پر ہی وہ رانی پنکھی کے گھر گیا تھا اور وہاں سب کچھ اتنی آسانی سے ہو گیا تھا کہ وہ حیرت زدہ رہ گیا تھا۔ اسے وہاں جا کر احساس ہوا تھا کہ رانی پنکھی جانے کب سے اس کی منتظر تھی۔ ہو سکتا ہے جس طرح دادا نے اسے انارہ کی ایک جھلک دکھا دی تھی، رانی پنکھی کو بھی انہوں نے اس کی شکل دکھا دی ہو۔

بہرحال جو بھی ہوا ہو، عابر کو انارہ کے حصول میں کوئی دقت پیش نہیں آئی تھی۔

اس وقت عابر دولہا بنا اپنے گھر کے ڈرائنگ روم میں بیٹھا تھا۔ علی نثار بے چینی سے ٹہل رہے تھے۔ وہ عابر سے کئی بار تصدیق کر چکے تھے کہ آخر نثار ایوب کے اصل الفاظ کیا تھے۔ اور عابر کئی بار انہیں بتا چکا تھا کہ دادا نے کن لفظوں میں بابا کاشف کا ذکر کیا تھا۔

PDF BY Manzoor

انتظار جب حد سے بڑھا اور بابا کاشف کی آمد نہ ہوئی تو انہوں نے گھر کے لوگوں سے مشورہ کیا کہ کیوں نہ باہر سے کسی نکاح خواں کو لا کر نکاح پڑھوا دیا جائے۔ جب پورا گھر اس بات پر متفق ہو گیا اور صائمہ کا شوہر اسلم نکاح خواں کو لانے چل دیا تو اچانک کھلے دروازے سے 'بابا ڈنیا' داخل ہوئے اور پھر وہ بغیر کہیں رکے ڈرائنگ روم میں آ گئے۔

انہوں نے بلند آواز میں سلام کیا۔

عابر کی جب ان پر نظر پڑی تو وہ حیران رہ گیا۔ ''بابا۔ آپ؟''

''تو نے ایک دن ہم سے ہمارا نام پوچھا تھا، ہم نے نہیں بتایا تھا۔ ہم سے گھر چلنے کی فرمائش کی تھی، ہم نہیں آئے تھے۔ آج تیری یہ دونوں خواہشیں پوری ہو گئیں۔ بے چین کیوں ہوتا ہے، ہم اپنا نام بھی بتائے دیتے ہیں۔ ہمارا نام کاشف ہے۔''

''بابا کاشف۔'' عابر یکدم خوشی سے چیخا۔

بابا کاشف کی آمد کے ساتھ ہی انتظار کی کوفت میں مبتلا گھرانہ خوشی میں سرشار ہو گیا۔ ہر شخص کا چہرہ مسرت سے کھل اُٹھا۔ یہاں تک کہ انارہ کا چہرہ بھی جگمگانے لگا۔

بس پھر آناً فاناً نکاح کی تقریب کا آغاز ہوا۔ بابا کاشف نے انارہ کو کلمہ پڑھا کر مسلمان کیا۔ اس کا اسلامی نام دادا کی ہدایت کے مطابق انجم آرا رکھا گیا۔ پھر بابا کاشف نے انجم آرا عرف انجو کو عابر نثار کے عقد میں دے دیا۔

نکاح کے بعد علی نثار نے ایک خوبصورت پلیٹ میں بہت ادب سے بابا کاشف کو چھوہارے پیش کیے۔ اُنہوں نے ایک چھوہارا اُٹھایا۔ تھوڑا سا کھایا اور پھر اس چھوہارے کو عابر کو کھلاتے ہوئے بولے۔ ''ہم نا کہتے تھے کہ دُنیا تجھے ڈھونڈ رہی ہے۔ بالآخر دُنیا نے تجھے ڈھونڈ ہی لیا۔ انجم آرا تیری دنیا ہے، اس کا خیال رکھنا۔ اب ہم چلتے ہیں۔''

''بابا آپ کا بہت شکریہ۔'' عابر کھڑے ہوتے ہوئے بولا۔

''بابا۔ آپ کا بڑا کرم۔ آپ کی بڑی عنایت۔'' علی نثار نے ممنون لہجے میں کہا۔

''بابا۔ ہم نے کچھ نہیں کیا۔ یہ کیا دھرا مجاہد کا ہے، پروفیسر مجاہد کا۔ ہم تو اس کے حکم پر چلے آئے۔ ورنہ ہم کہاں اور نکاح خوانی کہاں۔'' اتنا کہا اور یہ جا وہ جا۔

بابا کاشف جس طرح اچانک آئے تھے، اسی تیزی سے واپس چلے گئے۔

o……o……o

آج مرن برت کا اکیسواں دن تھا۔

انجو کے رخصت ہوتے ہی رانی پنکھی نے مرن برت رکھ لیا تھا۔ اکیس دن سے اس نے کچھ نہیں کھایا پیا تھا۔ ایسا اس نے بگّا کی ہدایت کے مطابق کیا تھا۔ زندگی کا خاتمہ تو کوئی مشکل کام نہ تھا لیکن آتم ہتھیا یا خودکشی سے بگّا کو کچھ حاصل نہ ہوتا۔ بگّا تک پہنچنے اور اس کی رانی بننے کے لیے مرن برت رکھنا ضروری تھا۔ ایسا روزہ جس میں کچھ کھائے پیئے بغیر موت سے ہمکنار ہوا جائے۔

یہ مرن برت رانی پنکھی نے انجو کی زندگی بچانے کے لیے رکھا تھا۔ اس نے اپنی زندگی کی قربانی دے کر انجو کو بلی دینے سے بچا لیا تھا۔ زندگی دینا شاید اتنا مشکل نہ ہوتا لیکن اس موت کے پیچھے جس اذیت سے دوچار ہونا تھا۔ اسے قبول کر کے رانی پنکھی نے واقعی انجو سے اپنی محبت کا ثبوت دیا تھا۔

عذرا ڈیوڈ جسے رانی پنکھی ''سریلی'' کہتی تھی، برت کے پہلے دن سے ہی رانی پنکھی کے پاس موجود تھی۔ شروع کے چند دنوں تو رانی پنکھی چلتی پھرتی رہی تھی۔ پھر آہستہ آہستہ اس نے چارپائی پکڑنا شروع کی تھی۔ جب تک اس کے جسم میں جان رہی، وہ اُٹھتی بیٹھتی رہی۔ پھر ایک وقت آیا کہ وہ اُٹھنے بیٹھنے سے معذور ہو گئی۔ اب اس کی پیٹھ مستقل چارپائی سے لگ گئی تھی لیکن اس کا دماغ کام کر رہا تھا۔ اس نے آخری دنوں میں بولنا کچھ کم کر دیا تھا۔ لیکن جب بھی بولتی تھی، ماضی کا کوئی ورق کھولتی تھی۔

عذرا اس کا دل بہلانے کے لیے اسے گانے سناتی رہتی تھی۔ رانی پنکھی کو اس کی آواز بہت پسند تھی۔ آواز ہی نہیں، وہ ذاتی طور پر بھی اس کو پسند کرتی تھی۔ اسی لیے اس نے ڈھائی تین سو چیلے چانٹوں، شاگردوں میں سے اپنے آخری دنوں کے لیے عذرا کا انتخاب کیا تھا۔

ان اکیس دنوں میں رانی پنکھی نے اپنا پورا ماضی کھول کر رکھ دیا تھا۔ عذرا نے محسوس کیا تھا کہ وہ شاہ زیب کو ذرّہ بھر بھی نہیں بھولی تھی۔ یہ وہ شخص تھا جو قمر پروین کے عشق میں فنا ہو چکا تھا اور اس نے رانی پنکھی کو کبھی دھوکے میں نہ رکھا تھا۔ لیکن برا ہو اس محبت کا جس کی آنکھیں نہیں ہوتیں۔ کوئی کہیں بھی کسی پر عاشق ہو سکتا ہے۔ سو رانی پنکھی اس پر مرمٹی تھی۔ اور ایسی مٹی تھی کہ اب مٹی ہونے کو آئی تھی لیکن اس کی سانسوں میں اب بھی وہ بسا تھا۔ زبان پر اس کا نام تھا، آنکھوں میں اس کی تصویر تھی اور ہمہ وقت وہ اس کی راہ تکتی تھی۔

رانی پنکھی کو جب عذرا ایک نامعلوم کرب میں مبتلا دیکھتی تو بے اختیار اس کا جی چاہتا کہ وہ کہیں سے شاہ زیب کو پکڑ لائے اور رانی پنکھی کے سامنے لا کھڑا کرے۔ لیکن وہ بے بس تھی۔ بس اپنا دل مسوس کر رہ جاتی۔

ایک دن اس نے عذرا کا ہاتھ تھام کر عجب بات کی۔ ایسی بات جس کی عذرا کو اُمید نہ تھی۔ اس نے کہا۔ ''دیکھ عذرا جو زندگی میں نے گزاری، اس کی حیثیت کھیل تماشے سے زیادہ نہیں۔ آج پچھتاوے کے ناگ مجھے ڈستے ہیں، لیکن اب میں اتنی آگے جا چکی ہوں کہ واپسی ممکن نہیں، تو ابھی جوان ہے۔ میری مان، واپس پلٹ جا۔ کل کے پچھتاوے سے آج کا سنبھلنا اچھا۔ اپنے گاڈ کی انگلی تھام لے۔ اس کالی دنیا میں اندھیرے کے سوا کچھ نہیں۔'' اتنا کہہ کر رانی پنکھی نے اپنی آنکھیں موند لی تھیں۔ بہت دیر تک اس کی آنکھوں سے آنسو بہتے رہے تھے۔ شاید یہ پچھتاوے کے آنسو تھے۔

اسی لمحے عذرا ڈیوڈ نے سوچ لیا تھا کہ وہ کالی دنیا کو چھوڑ دے گی۔ شیطان پرستی سے توبہ کر لے گی اور اپنے آل مائٹی گاڈ کی انگلی تھام لے گی۔

مرن برت کے اکیسویں دن رانی پنکھی نے وصیت کی۔ ''سن عذرا، میری سریلی میری بات غور سے سن۔ میں جہاں اس وقت لیٹی ہوں، یہیں گڑھا کھود کر مجھے دبا دینا۔ میں جلنا نہیں چاہتی۔ میرا تاج اور میرا لباس، میرے ساتھ جائے گا۔''

''ٹھیک ہے رانی ماں۔ جیسا تم نے کہا، ویسا کروں گی۔'' عذرا نے یقین دلایا۔

وصیت کرنے کے بعد جیسے ہی اندھیرا گہرا ہوا، رانی پنکھی کی لرزتی آواز ابھری۔ ''عذرا دیکھ وہ آ گیا۔ میرا شاہ زیب آ گیا۔''

عذرا نے اس کی آنکھوں میں یکا یک دیپ جلتے دیکھے۔ محبت کے دیپ۔

چند لمحوں بعد اس کی آنکھیں بند ہو گئیں۔ وہ چلی گئی جس نے اپنی زندگی مٹا کر انجم آرا عرف انجو کو نئی زندگی عطا کی تھی۔

o……o……o

کافی عرصے کے بعد جب عابر اور انجو، رانی پنکھی کے مسکن پر پہنچے تو انہیں ایک دھچکا سا لگا۔ گھر کا لکڑی کا دروازہ مع چوکھٹ غائب تھا۔ دروازے کی اینٹیں نکلی ہوئی تھیں۔ باورچی خانے کی چھت بیٹھ چکی تھی۔ صحن میں جگہ جگہ گڑھے پڑے ہوئے تھے۔ نیم کا درخت موجود تھا اور اس پر بے شمار کوّے بیٹھے ہوئے تھے۔ قبرستان والی دیوار کا ایک حصہ گر چکا تھا۔

ٹوٹی ہوئی دیوار کی اینٹیں رانی پنکھی کی قبر پر پڑی تھیں۔ گھر میں بے شمار کتے، بلیاں لوٹ رہے تھے۔ انہی بلیوں میں کالے منہ کی سفید بلی اور بلاّ بھی شامل تھے جو عابر اور انجو کو دیکھ کر ان کے پاس آ گئے اور 'میاؤں میاؤں' کر کے ان کے پیروں سے لپٹنے لگے۔

جس رات رانی پنکھی کا انتقال ہوا، وہ اماوس کی رات تھی۔ ہر اماوس کی رات کو اس کے گھر میں چیلوں کا اجتماع ہوتا تھا۔ آدھی رات کے بعد حسب معمول سب اکٹھا ہو گئے تو انہیں پتا چلا کہ کالی دنیا کی رانی چل بسی ہے۔ عذرا ڈیوڈ نے رانی پنکھی کی وصیت کے مطابق اس کی چارپائی والی جگہ پر گڑھا کھدوا کر مع تاج اسے گڑھے میں دفنا دیا۔ رانی پنکھی کو دفنانے کے بعد اس گھر سے خالی ہاتھ نکلنے والی پہلی عورت عذرا ڈیوڈ تھی۔

عذرا ڈیوڈ کے جانے کے بعد وہاں موجود لوگوں میں ہلچل سی مچ گئی۔ بس پھر جس کے جو ہاتھ لگا، وہ اپنے ساتھ لے گیا۔ یہاں تک کہ اس گھر میں چارپائی تک نہ رہی۔

جب قبرستان کی دیوار کے زیر سایہ بیٹھنے والے ہیرونچیوں، چرسیوں اور جواریوں کو بڑھیا کے چل بسنے کا علم ہوا تو انہوں نے تھوڑی سی دیوار توڑ کر گھر کے اندر راستہ بنا لیا۔ اس طرح رانی پنکھی کا مسکن ان بدقماشوں کی آماجگاہ بن گیا۔

ادھر گورکن بھی تاک میں تھے کہ اس لاوارث گھر کو قبرستان میں کیوں نہ شامل کر لیا جائے۔ اس کے لیے بس گھر کی دیوار گرانے کی دیر تھی۔ پہلے مرحلے کے طور پر اس گھر کے صحن میں دو چار قبریں کھود کر تیار کر لی گئی تھیں۔ آہستہ آہستہ دیوار گرانے کا عمل شروع ہوا۔ اس کے بعد پہلے سے کھدی قبروں میں مُردے دفنائے جانے کا کام شروع ہو گیا تھا۔

انجو تو اس گھر کی حالت دیکھ کر پریشان ہو گئی تھی۔ اندر کمروں میں کئی ہیرونچی مدہوش پڑے تھے۔ ان کے ساتھ بلیاں بھی لیٹی ہوئی تھیں، جو انجو کو دیکھتے ہی فوراً اٹھ بیٹھیں اور کمرے سے نکل گئیں۔

انجو فوراً کمرے سے باہر آ گئی۔ یہ وہ مسکن تھا جہاں انجو نے رانی پنکھی کے ساتھ اچھا بُرا وقت گزارا تھا۔ اسے اپنی قید کے دن یاد آئے۔ رانی پنکھی کی محبتیں یاد آئیں۔ اس کی ذات پر رانی پنکھی نے کیسا احسان عظیم کیا تھا۔ وہ اس احسان کو کبھی نہیں بھول سکتی تھی۔ اس کی آزادی کی خاطر رانی پنکھی نے بگّا کی رانی بننے کا ناخوشگوار فیصلہ کر لیا تھا۔ رانی پنکھی نے اسے ہر بات بتا دی تھی۔ اسے یہ بھی بتا دیا تھا کہ اس کے جانے کے بعد وہ مرن برت رکھے گی اور مرنے کے بعد اسی گھر میں چارپائی والی جگہ پر دفن ہو گی۔

انجو نے صحن میں کھڑے ہو کر عابر کا ہاتھ تھام لیا۔ پھر اس نے چارپائی کی جگہ کا تعین کیا اور آنکھیں بند کر کے دل ہی دل میں بولی۔ ''اماں، تو کہاں ہے؟''

''میری انجو۔ میں یہاں ہوں۔'' یکدم آواز آئی۔

انجو نے دیکھا کہ ایک بہت حسین عورت زرق برق لباس پہنے، سر پر جگمگاتا تاج سجائے ایک مرصع تخت پر بیٹھی ہے اور اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہیں۔ وہ رانی پنکھی تھی۔

پھر آنسوؤں نے جیسے اس کے اندر آگ لگا دی۔ وہ شعلوں میں گھری نظر آئی۔

انجو نے گھبرا کر آنکھیں کھول لیں تو وہ منظر فوراً غائب ہو گیا۔

''کیا آپ نے اماں کو دیکھا؟'' انجو نے عابر سے پوچھا۔

''نہیں۔'' عابر نے حیران ہو کر کہا۔ ''کہاں ہیں وہ؟''

''وہ رانی بن چکی ہیں۔ ایسی رانی جس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھری تھیں۔'' یہ کہہ کر انجو خود بھی رو پڑی اور پھر روتے ہوئے بولی۔ ''آؤ۔ عابر چلیں۔''

عابر نے اس کے بازو پر ہاتھ رکھا اور اس کھنڈر مسکن کے دروازے کی طرف بڑھا۔

تب پیچھے سے 'میاؤں' کی آواز آئی۔

دونوں نے بیک وقت پیچھے مڑ کر دیکھا۔

کالے منہ کی سفید بلّی اور بلاّ دونوں پُر شوق نگاہوں سے اُنہیں دیکھ رہے تھے۔

عابر نے بلّی اور انجو نے بلّے کو اٹھا لیا اور رانی پنکھی کے ویران مسکن سے باہر نکل آئے۔ (ختم شد)

PDF BY Manzoor